

# حُسنِ گفتار

طالب ہاشمی

عبدالله  
دارالاشیاء  
مصطفیٰ





# حُسنِ گفتار

طالبِ پاشمی



دَارُ الشَّيْءِ مُصْطَفَايَ رَحْمَتِي

© ہمارے حقوق ہیں یا شریعت کا

HUSNE-GUTAR

By

Talib Hashmi

Year of Edition 2007

Price Rs.75/-



ہمسن گلزار

طالب ہاشمی

۲۰۰۷ء

۷۵ روپے

عنایت آفتاب پبلیشرز، دہلی

تمام کتاب

مؤلف

عنایت آفتاب

قیمت

مطبع

Published by

**DARUL ESHAT-E-MUSTAFAI**

3181, Vaidi Street, Kucha Pandit Lal Kuan, Delhi 9 (India)

Ph: 23216162, 23214488, Fax: 0091-011-23211548

E-mail: aphdelhi@yahoo.com

# فہرست مضامین

مضمون کا عنوان

نمبر شمار

صفحہ

5

فہرست مضامین

1

7

تکرمیم اور انکار طوطی کا بد نظامی

2

9

ابتداء سے آج تک کے بدست و خیر اثر و ثواب

3

17

قرآن مجید کی روشنی میں انسان کا قصہ حیات

4

21

بندۂ مومنین کی بچکانی

5

26

رحمت الہی کی وسعت

6

30

کائنات کی ہر چیز اللہ پر کی پابند ہے

7

35

ذکر الہی

8

41

توبہ

9

45

خیر و شر میں امتیاز

10

49

اسلامی معاشرہ میں فرد کے فرائض، عمل کی ترویج

11

53

اخلاص و عمل

12

58

اسلامی ریاست میں جان، مال اور اہل ہر دے کے حقوق کی ضمانت

13

63

اسلام میں عدل کی اہمیت

14

67

مسئلہ برائی

15

71

راستہ گفتاری بحث کی گنج ہے

16

75

اٹھ پر توکل

17

80

اسلام میں عورتوں کے حقوق

18

85

فیر کی دوسویم

19

92

ہدایت اور عمل

20

99

ثبوت و انکار

21

104

دعا و دعا کی پاد و نگار و ردی

22

110

اسلام کی خاص بات میں صفت و پاسبان

23

117

مذاہب و مذاہب کی برائی

24

122

جنت سے محروم کیا جائے وہ انسان ہے

25

126

تکلیف و تکلیف اور مال و مال

26

130

اسلام کا عالمی نظام

27

134

اسلام کا نظام معیشت

28

138	اسلامی مذاہب کا واسطے بچوں کی تعلیم و تربیت	۳۹
147	نبی و پیغمبر کی خدمتوں کی خوشی کو دور کرتی ہیں	۴۰
150	غرض صوفیہ کے سوا صدقات پھینکا کر دو	۴۱
154	اپنی بیاہی دوسرے کے ہاں باپ کو گالی دینا گناہ کبیرہ ہے	۴۲
158	نہایت گناہ گناہ کا گناہ ہے	۴۳
163	جسد کا حرام کا	۴۴
167	حکمل اور اسراف سے پرہیز	۴۵
171	وہو وہی کو زبان پر بھی نہ لائیے	۴۶
174	آزادی نسوان یا قرآن چاہیے	۴۷
182	طاہریت	۴۸
187	جھوڑ کی بناوی	۴۹
191	نہروں کو برہمنیت کو	۵۰
195	اپنی زبان پر کلمہ کہیے	۵۱
199	پندرہ گیب عادتیں	۵۲
203	مراجم کے ساتھ خسی سلوک	۵۳
207	گھر کے ملازموں سے برتاؤ	۵۴
211	پر عادتیں اپنائیے	۵۵
216	اعتدال کا راستہ اپنائیے	۵۶
219	نسب و نسب پر خوش گوی	۵۷
225	انجئے بڑی ہے	۵۸
228	والدین کی اطاعت و خدمت کی ضامن	۵۹
232	ہاشمی اور مرثیہ دونوں بخون ہیں	۶۰
238	اور قلمیہ برکت انسان	۶۱
242	رمضان المبارک، ملی وحدت و یک جہتی کا مہینہ	۶۲
246	رمضان المبارک اور مسلمان کا جہاد کا کردار	۶۳
250	سحر کی اور جادو کی برکات اور رمضان کے مشغولوں کے احکام	۶۴
253	لیات القدر کی اہمیت	۶۵
257	عید الفطر کی اہمیت اور اس کے دینی اور دنیوی فوائد	۶۶
260	منزلت اور شان و اہمیت اسلامی تقویر	۶۷
263	کتبیات	۶۸

## تقدیم

(نورۃ کونوید، عابد نظامی صاحب)

طالب ہاشمی صاحب سے میرا تعلق خاطر خاص پرانا ہے۔ تقریباً تیس برس قبل دفتر پوسٹ ماسٹر جنرل لاہور میں ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ ان دنوں میں بہتر "نیا بے حرم" کا دیر تھا۔ اور وہ سالے ہی کے کسی کام کے سلسلہ میں مولانا امداد علی خاں صاحب سے ملے گیا تھا۔ جو ان دنوں اسی آفس میں کام کرتے تھے۔ میرے کام کی ذمہ داری جان کر مولانا خاں صاحب نے مجھ سے کہا: "اس کام کیلئے طالب ہاشمی صاحب سے مل لیں۔"

یہ نام میرے لیے نیا نہیں تھا۔ ہاشمی صاحب کی نگہی ہوئی کئی کتابیں میری نظر سے گزر چکی تھیں۔ لیکن یہ ظلم نہیں تھا کہ موصوف بھی اسی آفس میں ہوتے ہیں۔ خیر میں ہاشمی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ اس وقت دفتر کی خانوں میں گرم تھے۔ "اسلام ٹیکم" ہاشمی صاحب نے میری آواز سن کر قانکوں سے سر اٹھایا اور مجھے لہجہ میں کہا: "وہیکم اسلام۔"

میں نے تعارف کرایا تو محبت سے پیش آئے اور چہرہ اسی کو چائے کے لئے بھیجا۔ یہ چائے یا چاہ کیا تھی اللہ ہی جانتے لیکن وہ دن اور آج کا دن ہاشمی صاحب کے ساتھ چائے اور چاہ کا رشتہ مسلسل قائم ہے۔

ہاشمی صاحب کی بیشتر زندگی تصنیف، تالیف اور مطالعہ میں گزری ہے۔ سیرت طیبہ، اسوۂ صحابہ، حالاتِ اولیاء، اللہ اور اسلامی نظامِ زندگی، فرض ہر موضوع پر انہوں نے لکھا ہے، بلکہ کہنا چاہیے کہ ان موضوعات پر لکھنے کا حق ادا کیا ہے۔ اب تک ان کی بیسیوں کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ کئی کتابوں پر ایوارڈز مل چکے ہیں۔ پھر ایسی کتابوں کی تعداد بھی کہہ کر کم نہیں جن کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

اب ان کے مضامین کا مجموعہ "حسن گفتار" شائع ہو رہا ہے۔ یہ اگلے ایڈیشن پر نظر ہونے والے اور مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہونے والے مضامین کا دلکش مجموعہ ہے،



جو اس سے پہلے نشر اور اشاعت کے مختلف موقعوں پر بھی سامعین و قارئین سے داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ ”منسکین گلزار“ میں شامل کرنے سے پہلے ہاشمی صاحب نے ان مضامین میں غامض رد و بدل کر دیا ہے تاکہ ان کی افادیت میں زیادہ سے زیادہ اضافہ ہو سکے۔ مضامین قرآن و حدیث کی تعلیمات پر مبنی ہیں جو نہایت عام فہم اور سلیس زبان میں لکھے گئے ہیں۔ انداز بیان شگفتہ و دلکش اور دل نشین ہے، جن سے بچے جوان اور بوڑھے سبھی مستفید و مستفیض ہو سکتے ہیں، لیکن بعض مضامین ایسے ہیں جن سے خصوصی فائدہ بھی اٹھایا جاسکتا ہے۔ مثلاً کارپردازان حکومت ”عدل کی اہمیت“ اور ”اسلام میں عورتوں کے حقوق“ جیسے مضامین سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اسی طرح دکاندار ”تجارت کے اسلامی اصول“ اور ”مسلمان تاجر کا کردار“ وغیرہ مضامین سے گھر پر استاد استفادہ کر سکتے ہیں اور عورتیں ”اسلامی نقطہ نظر سے بچوں کی تربیت“، ”آزادی نسواں“، ”روزِ قیامت اور پرورشِ اولاد“، ”عورتوں کی خاص باتیں مفت دیا ہے“ اور ”بھڑکی بیماری“ جیسے مضامین سے بہت کچھ سیکھ سکتی ہیں اور محلی زندگی میں رجحان حاصل کر سکتی ہیں۔ اگر ملک کے خیر و سعادت مصنف کی اجازت سے ان مفید مضامین کو پمفلٹ کی صورت میں شائع کر کے لوگوں میں تقسیم کرنے کا اجتنام کریں تو اس سے ہمارے ہاں معاشرتی انقلاب کے سلسلہ میں اہم کام لیا جاسکتا ہے۔

”منسکین گلزار“ میں شامل یہ تمام مضامین گھر سے سماجی، معاشرتی اور محلی و قومی شعور کے حامل ہیں، ان کے مطالعہ سے دینی و دنیاوی کامیابی اور آخری و قیامت کا حصول ممکن ہو سکتا ہے۔ آج ہماری قوم کو ایسی ہی مفید، نرے مغز اور ایمان افروز کتابوں کی ضرورت ہے۔ میری دعا ہے اللہ تعالیٰ ہاشمی صاحب کو تادیر سلامت باکرامت رکھے تاکہ وہ پاکستانی قوم کی تعمیر و ترقی کے لئے ایسی ہی مفید کتابیں اور مضامین لکھتے رہیں۔

ڈاکٹر خواجہ عابد نقوی

لاہور

۲۶ ستمبر ۲۰۰۲ء

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

## ابتدائیہ از مؤلف

# آئیے، رحمن کے بندے بنیں

یہ مجموعہ اوراق جو آپ کے ہاتھوں میں ہے، کوئی مستقل تصنیف نہیں بلکہ راقم الحروف کے ان ۵۰ مضامین کا مجموعہ ہے جو گزشتہ چند سالوں میں وقفہ فوقتاً مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوئے یا ریڈیو پاکستان لاہور سے نشر ہوئے اور علمی و دینی حلقوں میں پسند کیے گئے۔ یہ تمام مضامین مشرقی و دینی و معاشرتی موضوعات پر ہیں۔ ان میں سے بیشتر کا تعلق اخلاق کے مختلف پہلوؤں، دین حق اسلام کے بعض خصائص اور اصلاح معاشرہ سے ہے۔ ان کو پڑھ کر معلوم ہوگا کہ ایک مومن کا مقصد حیات کیا ہے اسلامی تہذیب و تمدن کے خدو خال کیا ہیں، اولاد کی تعلیم و تربیت کے نکات کیا ہیں، مسرت اور شادمانی کا اسلامی تصور کیا ہے۔ عورتوں، بچوں، اور گھریلو ملازموں (یا زیر دست افراد) کے حقوق کیا ہیں، ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان پر کیا حق ہے، اسلام میں عدل، اعتدال اور رواداری کی کیا اہمیت ہے وغیرہ وغیرہ۔۔۔ فی الحقیقت ان مضامین کا مقصد و غٹا اخلاق کی اصلاح اور اپنے مسلمان بھائیوں کو وہ اوصاف اپنانے کی طرف راغب کرنا ہے جن کو قرآن حکیم میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الّٰی هُمْ یُقِیْمُوْنَ عَلٰی الْاَزْحٰمِ هٰؤُلَآءِ  
عَٰلَمَتُهُمْ الْجَهَنَّمُ اَیُّهُمْ قَالُوْا سَلٰمًا ۝۱۷ وَالّٰی هُمْ یَبِیْنُوْنَ لِبَرِّیْهِمْ سَجْدًا  
وَقِیَامًا ۝۱۸ وَالّٰی هُمْ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ ۚ اِنَّ

عَلَيْهَا كَانَ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿١٠﴾ يَتَّبِعُهَا سِتْرٌ مِّنْ مُّسْكِرٍ ﴿١١﴾ وَتَلْقَاهَا ﴿١٢﴾ وَالْبَيْنُ  
إِذَا تَلَفَعُوا لَمْ يَأْمُرُوا وَلَمْ يَقْتُرُوا وَكَانَ بَيْنَ ذَلِكَ قَوَامًا ﴿١٣﴾  
وَالْبَيْنُ لَا يَخْزُونَ مَعَ اللَّهِ إِلَٰهًا آخَرَ وَلَا يَقْتُلُونَ النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ  
اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُونَ ۖ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ يَلْقَ أَثَامًا ﴿١٤﴾  
يُضَاعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَيَخْلُدْ فِيهِ مُهَانًا ﴿١٥﴾ إِلَّا مَنْ تَابَ  
وَأَمِنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَأُولَٰئِكَ يَبْدُلُ اللَّهُ سَيِّئَاتِهِمْ  
حَسَنَاتٍ ۖ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَّحِيمًا ﴿١٦﴾ وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا  
فَإِنَّهُ يُعْرَبْ إِلَى اللَّهِ يُؤْتِيهِ ۖ وَالْبَيْنُ لَا يَشْهَدُونَ الزُّورَ ۖ وَإِذَا  
مَرُّوا بِاللَّغْوِ مَرُّوا كِرَامًا ﴿١٧﴾ وَالْبَيْنُ إِذَا دُجِرُوا بِأَيْدِيهِمْ لَمْ  
يَجْعَرُوا عَلَيْهَا عَصَاً وَغَضَبًا ﴿١٨﴾ وَالْبَيْنُ يَقُولُونَ رِنَا هَبْ لَنَا مِنْ  
أَزْوَاجِنَا وَلِيَرْحَمَنَا قُرَّةَ عَيْنٍ ۖ وَاجْعَلْ لِّلْمُتَّقِينَ إِمَامًا ﴿١٩﴾ أُولَٰئِكَ  
يُجْزَوْنَ الْعَمَلَةَ يَسْتَصْرِوْنَ وَيُلْقَوْنَ فِيهَا نَجَّةً وَاسْلَامًا ﴿٢٠﴾  
عَلَيْهِمْ فِيهَا ۖ عَسَتْ مُسْكِرًا وَمَقَامًا ﴿٢١﴾

(v)  $\mathcal{A}$

ترجمہ: اور رمضان کے (اصلی) بندے وہ ہیں جو زمین پر نرم چال (سکنت کے ساتھ) چلتے ہیں اور جاہل ان کے منہ آئیں تو کہہ دیتے ہیں کہ تم کو سلام (یعنی دفع شر کی خاطر ان سے جھکا نہیں کرتے) جو اپنے رب کے حضور سجدے اور قیام میں راتیں گزارتے ہیں جو دعائیں کرتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم سے عذاب ختم کو قہر رکھ۔ چونکہ جہنم بُرا مکان اور بُرا مقام ہے۔ وہ جب خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں نہ غفل بلکہ ان کا خرچ دونوں انتہاؤں کے درمیان اعتدال پر قائم رہتا ہے۔ جو اللہ کے سوا کسی اور معبود کو نہیں پکارتے۔ اللہ کی حرام کی ہوئی کسی جان کو ناحق ہلاک نہیں کرتے اور نہ زنا کے مرتکب ہوتے ہیں یہ کام جو کوئی کرے وہ اپنے گناہ کا بدلہ پائے گا۔ قیامت کے روز اس کو مگر عذاب دیا جائے گا اور اسی میں وہ

بیش وقت کے ساتھ چار ہے گا (اگر کوئی) (ان گناہوں کے بعد) توبہ کر چکا ہو اور ایمان لا کر عمل صالح کرنے لگا ہو۔ ایسے لوگوں کی برائیوں کو اللہ نیکوں سے بدل دے گا وہ بڑا غفور رحیم ہے جو شخص توبہ کر کے نیک عمل اختیار کرتا ہے وہ تو اللہ کی طرف پلٹ آتا ہے جیسا کہ پختہ کا حق ہے۔ اور زمین کے بندے وہ ہیں جو جھوٹ کے گواہ نہیں بنے اور کسی غلط چیز پر ان کا گزر ہو جائے تو شریف آدمیوں کی طرح (اس کے پاس سے سلامت ردی کے ساتھ) گزر جاتے ہیں۔ جنہیں اگر ان کے رب کی آیات سنا کر نصیحت کی جاتی ہے تو وہ اس پر اندھے اور بہرے بن کر نہیں رہ جاتے جو دعائیں مانگا کرتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار، ہمیں اپنی بیویوں اور اولاد سے آنکھوں کی خشک دے اور ہم کو پرہیزگاروں کا لام بنادے۔ یہ ہیں وہ لوگ جو اپنے مبر کا پھل منزلِ بندگی کی شکل میں پائیں گے۔ آداب و تسلیمات سے ان کا استقبال ہوگا اور وہ ہمیشہ ہمیشہ وہاں رہیں گے۔ کیا ہی اچھا ہے وہ مستقر اور وہ مقام۔“

اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم کی ان آیات میں ”زمین کے بندوں“ کے جو اوصاف بیان فرمائے ہیں اور جن کو آخرت میں ان بندوں کی صلاح اور کامرانی کا ضامن قرار دیا ہے، اخلاقی خصلت کے ذیل میں آتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام میں ایمان یا بنیادی عقائد (ارکان اسلام) کے بعد جس بات پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ ایک سچے مسلمان کو اخلاقی خصلت اختیار کرنا چاہیے اور نہ اسے اخلاق سے اپنی حفاظت کرنی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ ابتدائے آفرینش ہی سے انسانوں کی ہدایت کے لیے اپنی برگزیدہ مہتمیوں کو رسول اور نبی بنا کر بھیجتا رہا جنہوں نے زبانی تبلیغ حق کے ساتھ اپنی پاکیزہ سیرت و کردار کا عملی نمونہ بھی لوگوں کے سامنے پیش کیا۔ چنانچہ جب خالق ارض و سما نے اشرف المخلوقات پر اپنی ہدایات کی تکمیل کرنا چاہی تو جناب محمد مصطفیٰ ﷺ کو خاتم النبیین بنا کر مبعوث فرمایا اور

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ

فرما کر نہ صرف آپ کی سیرت و کردار کو مسلمانوں کے بہترین نمونہ قرار دیا

بلکہ آپؐ سے خطاب ہو کر فرمایا: **وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ** (اور ہم نے آپؐ کو سارے جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے)۔۔۔ **مختصر عقائد کے اخلاق**  
 عالیہ کی شہادت اللہ جل شانہؑ نے یوں دی۔

وَاللّٰك لَعَلٰی خُلُقِيْ عَظِيْمٌ (ہم نے تم کو)

ترجمہ: (اور بلاشبہ آپؐ اخلاق کے نہایت اعلیٰ درجہ پر ہیں)

عَالِمِ الْاَنْبِيَاءِ وَالْمُرْسَلِيْنَ ﷺ نے خود ایک مرتبہ فرمایا: **اِنَّمَا بُعِثْتُ لِأَتَمِّمَ مَخَارِمَ الْاَخْلَاقِ** یعنی میں اسی لیے بھیجا گیا ہوں کہ اخلاقِ خوبوں کو مکمل تک پہنچا دوں۔

قرآن حکیم میں رسول اکرم ﷺ کی بعثت کے جن مقاصد کا ذکر کیا گیا ہے ان میں "انسانوں کے تزکیہ" کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ تزکیہ سے مراد اصلاحِ اخلاق ہے۔ ایک مسلمان کی زندگی کا گہر مقصود رضائے الہی کا حصول ہے اور رضائے الہی اس کو اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جب وہ حقیقی معنوں میں "رحمان کا بندہ" بن جائے اور "رحمان کا بندہ" وہی طرح بن سکتا ہے کہ رسول اکرم ﷺ کے اسوۂ حسنہ پر عمل کرنے کو اپنی زندگی کا شعار بنالے۔ قرآن حکیم اور ارشاداتِ نبویؐ کے مطابق اخلاق کی وہ قسمیں ہیں ایک اخلاقِ حسنہ اور دوسری اخلاقِ شنیعہ۔

اخلاقِ حسنہ میں وہ تمام اعمال شامل ہیں جن کے کرنے یا جانے کو خدا تعالیٰ نے ہمارے کائنات کا حکم دیا گیا ہے مثلاً اخلاص فی الدین، ذکر الہی، خشیت الہی، راست گفتاری، ایمانے عہد، خود و دیگر، عدل و انصاف، صلۃ ربی، برہم، صبر و استقامت، عبادت، تقویٰ، اطاعت والدین، تربیت اولاد، تواضع، انکسار، مہمان نوازی، خوش کلامی، دیانت داری، مگرہ و شفاقت، ایثار، شرم و حیا، صلح پسندی، اکل حلال، مجاہدہ دینی، صفائی، سادگی، بڑوں کا ادب، چھوٹوں پر شفقت، زمین پر انکڑ کرنا، چلنا تو کھل علی اللہ، اور اسے شکر یہ، کھڑے ہونے کی اعانت، حاجت مندوں، معذوروں اور مسافروں کی امداد، باہمی اصلاح، بیمار پر ہی ثبوت ہو جانے والوں کے پاس اندکان سے تعزیت، بے سہارا

فیوض اور پیداؤں کی مدد کرنا مخلوق بالعبادہ اور کرنا (اس میں شوہر بھی، لیکن بھائی، ماں، باپ، اولاد، استاد، شاگرد، دوکاندار، خریدار، پڑوسی وغیرہ کے ایک دوسرے پر جو حقوق ہیں سبھی شامل ہیں) ایک دوسرے کو اچھی نصیحت کرنا اور بھلائی کی طرف راغب کرنا اور دوسری ہر قسم کی جھوٹی بڑی نیکیاں۔ (حضور ﷺ کے ارشاد کے مطابق کسی جھوٹی سے جھوٹی کو بھی حقیر نہیں سمجھنا چاہیے مثلاً کسی سے خندہ پوشانی سے ملنا یا نری سے گفتگو کرنا، سلام کرنا، راستے سے چمرا کا ناپا کوئی تکلیف دہ چیز ہٹا دینا وغیرہ سب باتیں نیکیوں میں شامل ہیں)۔

اخلاقی سچکھ میں وہ تمام کام شامل ہیں جن سے منع کیا گیا ہے یعنی پیٹھ کرنے کے کام ہیں ان سے بچنا چاہیے مثلاً شرک، حسد، قتل، باغی، قطع رحمی، بے حیائی، بغض و کینہ، بد چلتی، بد عہدی، غیبت، تکبر، فتنہ و فساد، جھوٹ، بددیانتی (خیانت)، تجسس، دروازہ گری، ستمنا، شہادت، چغلی، چوری، علم، باپ تول میں کمی، سرکشی، بدگمانی، کل، عیب چینی، اسراف (فضول خرچی)، ریاکاری، نشہ آور اشیاء کا استعمال، سود خواری، بخش کلائی، تہمت طرہ بازی، جوئے بازی، تنہو، خوشامد، اہمیت نفس، انسانی وغیرہ وغیرہ۔

ہادی اکرم ﷺ نے نیت کو جو درجہ اخلاق دیا اس کی چند جھلکیاں ملاحظہ

ہوں۔

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”تم میں سب سے اچھے وہ لوگ ہیں جن کے اخلاق اچھے ہیں۔“ (صحیح بخاری، ج ۱، ص ۱۰۰)

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا، آپ نے ارشاد فرمایا کہ صاحب ایمان بندہ اپنے اچھے اخلاق سے ان لوگوں کا ادب حاصل کر لیتا ہے جو راست بھر لٹی نمازیں پڑھتے ہیں اور ان کو ہمیشہ دوزخ رکھتے ہیں۔ (صحیح بخاری، ج ۱، ص ۱۰۰)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کہ یا رسول اللہ وہ کیا چیز ہے جس کی مدد امت لوگوں کو جنت میں داخل کرے گی۔ آپ نے فرمایا اللہ کا ڈر اور خوش طبعی۔ (ترمذی)

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نرمی کرنے والا ہے اور ہر کام میں رفق اور نرمی کو دوست رکھتا ہے۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حیا ایمان کی علامت ہے اور ایمان جنت کا ذریعہ ہے۔ اور بے حیائی گمراہی ہے اور گمراہی دوزخ کا موجب ہے۔ (مسند احمد)

حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ عز و جل صرف اس عمل کو قبول فرماتا ہے جو خالص اس کے لیے کیا گیا ہو اور جس کے ذریعے صرف اسی کی رضا چاہی گئی ہو۔ (مسند احمد و نسائی)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اس پوری دنیا کی چاہی اللہ کے نزدیک ایک مسلمان شخص کے قتل (ناحق) سے بھکی ہے۔ (ترمذی و مسند احمد)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: وہ شخص ہم میں سے نہیں جو بڑوں کی عزت نہ کرے، چھوٹوں پر شفقت نہ کرے، نیکیوں کا پرچار نہ کرے اور برائیوں سے نہ روکے۔

(مشکوٰۃ)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو شخص مسلمانوں کے کسی معاملہ کا ذمہ دار بننا پھر اس نے ان کے ساتھ خیانت کی تو وہ جہنمی ہوگا۔ (مسلم و صحیح)

حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے اللہ کے رسولؐ

سے ملنا، آپ نے فرمایا، جس شخص نے کسی تک دست کو سہلت دی یا اپنا حق اسے معاف کر دیا تو اللہ قیامت کے دن کی تختیوں سے اس کو نجات بخشے گا۔ (بخاری مسلم)

اس سلسلے میں رسول اکرم ﷺ کے اور بہت سے ارشادات اس کتاب میں شامل مضامین میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ جہاں تک ہو سکا ان مضامین میں سادہ اور عام فہم انداز بیان اختیار کیا گیا ہے۔ ان کو کتابی صورت میں لاتے وقت یہ مقصد بھی پیش نظر رہا ہے کہ عام مسلمانوں کے علاوہ طلب، طالبات، خطباء، مقررین اور معلمین ان سے بطور خاص استفادہ کر سکیں، استفادہ اس صورت میں کہ اگر ان کو ان میں سے کسی موضوع پر مقالہ لکھنے یا گفتگو (تقریر کرنے یا خطبہ دینے) کی ضرورت پیش آئے تو وہ ان سے مدد لے سکیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس طرح ان کی تقریر یا گفتگو میں ضمنی پیدا ہو جائے جس سے پڑھنے یا سننے والے متاثر ہوں اس کے نتیجے میں اگر ایک فرد بھی حقیقی معنوں میں رحمان کا بندہ بن گیا تو اللہ تعالیٰ کی شانِ رحیمی سے امید ہے کہ ناسخ نصیحت کے اجر سے محروم نہیں رہے گا۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو رحمان کے (حقیقی معنوں میں) بندے بننے کی توفیق عطا فرمائے۔

وَأَمِيزُ ذَلِكُمْ أَنَا أَنْ أَلْحَمِدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ

وَالصَّلَاةَ وَالسَّلَامَ عَلَى رَسُولِهِ الْأَمِينِ وَعَلَى آلِهِ وَأَصْحَابِهِ أَجْمَعِينَ

راقی غفرلہ و سلامت

حاجہ ہاشمی

۱۴۲۸ھ ۲۰۰۶ء

مطابق ۲۰۰۶ء ۲۰۰۶ء





# قرآن حکیم کی روشنی میں انسان کا مقصد حیات

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر جو بے حساب احسانات فرمائے ہیں ان میں سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ ان کی صلاح و فلاح کے لئے نجات و رسالت کا مقدس سلسلہ جاری فرمایا۔ انبیاء و مرسلین کا یہ سلسلہ ہزاروں سال جاری رہا یہاں تک کہ رجب عالم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر اس سلسلہ کو ختم فرما دیا گیا اور آپ کے ذریعے وہ آخری اور مکمل تعلیم و ہدایت بھیج دی گئی جو اُنہذا الابد تک بنی نوع انسان کی رہنمائی کرتی رہے گی یعنی قرآن حکیم۔ اللہ تعالیٰ نے اس پاک کتاب کو ہر ذور میں محفوظ اور روشن رکھنے کے ایسے ظاہری اور باطنی انتظامات فرما دیے کہ چشم بھرا رکھنے والوں کے لیے یہ اللہ جل جلالہ کی نشانیوں میں سے ایک بڑی نشانی اور خاتم الانبیاء و المرسلین ﷺ کے معجزوں میں سے ایک زندہ معجزہ ہے۔ قرآن حکیم نے ہم کو بتایا کہ تمام کائنات ارضی و سماوی کا خالق و مالک وہی ایک اللہ ہے یکتا، نہ وہ کسی کی اولاد ہے اور نہ اس کی کوئی اولاد ہے۔ اُس ذات واحد نے اس کائنات کو بے مقصد اور بے فائدہ نہیں بنایا۔ جیسا سورہ ہن میں ارشاد ہوا ہے:

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاءَ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا (ص: آیت ۷۷)

یعنی ہم نے آسمان اور زمین کے درمیان جو کچھ ہے سب کو بے کار اور ناحق پیدا نہیں کیا۔

پھر اس نے انسان کو زمین پر اپنا خلیفہ اور اشرف المخلوقات بنا کر بھیجا اور اس کو بتایا کہ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ مَالِي الْأَرْضِ جَمِيعًا (البقرہ: ۲۹) یعنی وہی تو ہے جس نے تمہارے لیے زمین کی ساری چیزیں پیدا کیں۔ ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے انسان پر واضح فرما دیا کہ اس کی زندگی بے مقصد اور

ہے قندہ نہیں اور وہ اس دنیا میں بیکار پیدا نہیں کیا گیا جیسا کہ سورۃ مؤمنون میں ہے  
 ﴿لَحْسَنُمُ أَتْنَا خَلَقْنَاكُمْ عَضًا وَ أُنَكَّمُ بِلِسَانَا لَا تَرْجِعُونَ﴾ (آیہ: ۱۱۵)  
 یعنی کیا تم نے سمجھ رکھا ہے کہ ہم نے تمہیں فُضول ہی پیدا کیا ہے اور یہ کہ تم  
 لوٹ کر ہمارے پاس نہ آؤ گے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر انسان فُضول اور بیکار پیدا نہیں کیا گیا تو اس  
 کی زندگی کا مقصد کیا ہے؟ اس کا جواب اللہ تعالیٰ نے سُورۃ النبیات میں یوں دیا  
 ہے۔

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ۝ مَا أُرِيدُ مِنْهُمْ جَزَاءً  
 وَزَقًى ۖ وَمَا أُرِيدُ أَنْ يُطْعَمُوا ۖ﴾ (آیہ: ۵۶-۵۷)

یعنی میں نے جن اور انسانوں کو اس کے سوا کسی کام کے لیے پیدا نہیں کیا  
 ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔ میں ان سے کوئی رزق نہیں چاہتا اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ  
 وہ مجھے کھلائیں۔

ان آیتوں میں یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے  
 انسانوں کو صرف اور صرف اپنی بندگی یا عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔

یہاں یہ سوال ذہن میں ابھر سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ صرف جن و انس ہی  
 کا خالق تو نہیں وہ تو کائنات کے ذرے ذرے کا خالق ہے پھر اس نے صرف جن و  
 انس کے بارے میں کیوں فرمایا کہ میں نے ان کو اپنی عبادت کے سوا اور کسی کام کے  
 لیے پیدا نہیں کیا تو اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ زمین پر صرف جن و انس ہی ایسی  
 مخلوق ہیں کہ ان کو عقل و شعور کی نعمت سے بہرہ ور کر کے یہ آزادی بخشی گئی کہ اگر وہ اللہ  
 وحدہ لا شریک کی عبادت کرنا چاہیں تو کریں اور اگر وہ سرکشی اور کفر و شرک کے راستے  
 پر چل کر اپنی فطرت سے لڑنا چاہیں تو اس کا بھی حق کو اختیار ہے یہ الگ بات ہے کہ  
 اس اختیار اور آزادی کے غلط استعمال کا آخرت میں سخت نچا سہ ہوگا۔

آئیے اب دیکھتے ہیں کہ عبادت کا مطلب اور مفہوم کیا ہے تو اس کے لغوی

سختی ہیں پرستش، عاجزانہ اطاعت اور برضا و رغبت فرمانبرداری۔ بعض لوگ نماز روزہ، حج، زکوٰۃ اور تسبیح و تہلیل ہی کو عبادت سمجھتے ہیں۔ بلاشبہ یہ اسود عبادت میں شامل ہیں لیکن فی الحقیقت عبادت کا مفہوم بڑا وسیع ہے اس میں اللہ اور رسول ﷺ کے تمام احکام کی بلا چون و چرا اطاعت، شریعت اسلام کی برضا و رغبت پیروی اور اللہ تعالیٰ کے امر و نہی کی دل و جان سے تعمیل بھی شامل ہے۔ اس طرح ایک مؤمن کے تمام احوال صالح عبادت میں داخل ہو جاتے ہیں۔ مثلاً حلال روزی کھانا، حلال روزی کمانے کے لئے نیک و دو کرنا، خدمتِ خلق، بیوی بچوں کی کفالت، صلہ رحمی، اکرام ضیف، یعنی مہمان نوازی، جہاد فی سبیل اللہ، ایٹائے عہد، حق گوئی، ماں باپ کی خدمت، غنودہ درگزر، غریبوں، یتیموں، یتیم خانوں اور حاجت مندوں کی اعانت وغیرہ سبھی چیزیں عبادت میں داخل ہیں اسی طرح جن باتوں سے اللہ تعالیٰ اور رسول ﷺ نے منع فرمایا ہے مثلاً شرک، دروغ گوئی، غیبت، حسد، تجنر، عہد شکنی، خیانت، ریا کاری، مصیبت، قتل، جھوٹی گواہی، وغیرہ امدوزی۔ بدگمانی، مردم آزادی وغیرہ سے اجتناب کرنا بھی عبادت میں داخل ہے۔

گویا ایک مؤمن کی تمام زندگی خلوت میں بھی اور جلوت میں بھی سراپا عبادت ہوتی ہے۔ قرآن پاک کی سورۃ العصر میں ایک انسان کے مقصدِ حیات کو ایک اور انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے زمانے کی قسم کھا کر فرمایا ہے کہ انسان کھائے میں ہے سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے، جنہوں نے نیک عمل کیے ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کی۔ یعنی انسان کا مقصدِ حیات چار امور سے عبارت ہے۔ پہلا ہے ایمان لانا یعنی اللہ کی وحدانیت، اس کے فرشتوں، اس کے پیغمبروں، اس کی کتابوں، تقدیر الہی اور یومِ آخرت کو صدقِ دل سے ماننا۔ دوسرا ہے نیک عمل کرنا، ان میں بنیادی ارکان اسلام کی پابندی کے علاوہ وہ تمام کام بھی شامل ہیں جن کے کرنے کا اللہ اور رسول ﷺ نے حکم دیا ہے اور ان تمام کاموں سے اجتناب بھی جن سے اللہ اور رسول ﷺ نے منع فرمایا ہے۔ تیسرا ہے ایک

دوسرے کو حق کی نصیحت نہ یعنی جب باطل سر اٹھا رہا ہو اور حق کے خلاف کام چلے جا رہے ہوں تو کھڑے حق کہہ کر باطل کا مقابلہ کرنا، بچہ تھا ہے ایک دوسرے کو ہر حال میں صبر کرنے یا درحق میں پیش آنے والے مصائب کو ثابت قدمی سے برداشت کرنے کی تلقین کرنا۔

خلاصہ کلام یہ کہ جس انسان نے ان باتوں پر عمل کیا جس نے اپنے مقصد حیات کو پایا اور یہی قرآن حکیم کا غنیمت کا غنیمت مقصود ہے۔



## بندۂ مؤمن کی پہچان

قرآن حکیم اور احادیث نبوی میں مؤمنین کے جو اوصاف بیان ہوئے ہیں، ان کی سیرت و کردار کو جو نقشہ کھینچا گیا ہے اور آخرت میں ان کے بلند مرتبے اور اجر عظیم کا جس طرح ذکر کیا گیا ہے، اس سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو کر سامنے آتی ہے کہ آخرت میں انسان کی منجات کا دار و مدار اس کے سچے مسلمان یا مؤمن ہونے پر ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ غفور و رحیم قادر مطلق چاہے تو کسی کم تر درجے کے مسلمان کو اس کی کسی معمولی نیکی پر بھی بخش دے لیکن بندۂ مؤمن کے لیے اس کا ہلکا اور غیر مقہور وعدہ ہے کہ وہ اس کو ضرور بخش دے گا اور جنت میں داخل کرے گا۔ یہاں یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ مسلمان اور مؤمن میں لطیف سا فرق ہے وہ یہ کہ ہر بندۂ مؤمن لازماً مسلم ہوتا ہے، لیکن ہر مسلم کو ہم اس وقت تک صحیح معنوں میں مؤمن نہیں کہہ سکتے جب تک وہ ایمان کے وہ تمام تقاضے پورے نہیں کرتا جو اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کو مطلوب ہیں۔ اگر کسی شخص نے زبان سے اللہ رسول قرآن، آخرت، تقدیر اور دوسرے ایمانیات کو ماننے کا اقرار کر لیا، مگر کان اسلام کی پابندی کو بھی اختیار کر لیا، جس سے اس کے ماننے کا اظہار ہوتا ہے تو کبھی اور قانونی طور پر اسے لازماً مسلم یا مسلمان کہا جائے گا لیکن اگر وہ زندگی کے مختلف معاملات مثلاً کاروبار، لین دین، اقرباء اور دوسرے مسلمانوں کے ساتھ برتاؤ وغیرہ میں اللہ اور رسول کے احکام کو عین نظر نہیں رکھتا بلکہ رسم و رواج یا اپنے نفس یا خواہشات کی پیروی کرتا ہے تو وہ شخص کسی مسلمان ہے تاہم وہ مسلم معاشرے ہی کا ایک فرد مخصوص رہوگا اور اس کو وہ تمام شرعی، قانونی، اخلاقی اور معاشرتی حقوق حاصل ہوں گے جو اسلام نے ایک مسلم کو دیے ہیں۔ دوسری طرف وہ مسلمان ہے جو اللہ، اس کے فرشتوں، اس کے پیغمبروں، آسمانی کتابوں، ہر خیر و شر کی تقدیر، آخرت اور

روز قیامت پر صدقِ دل سے ایمان رکھتا ہے، اپنی پوری شخصیت اور وجود کو اسلام کے تابع کر دیتا ہے۔ اپنی عبادات اور اپنے معاملات اور اپنے اخلاق و عادات کو اس سانچے میں ڈھال لیتا ہے جو اللہ اور اللہ کے رسول کو مطلوب ہے تو وہ بندہ مؤمن ہے جس کی پوری زندگی کا شعار اور محور یہ فرمانِ خداوندی ہوتا ہے:

اِنْ صَلَاحِي وَنَسْكَي وَنَحْيِي وَمُحْلِي لِلَّهِ وَبِ الْعَلَمِينَ (الانعام: ۱۶۴)  
 ”یعنی میری نماز اور میرے تمام مراسمِ عبادت اور میرا بچنا اور میرا سب کچھ اللہ کے لیے ہے جو ساری کائنات کا مالک ہے۔“

اس آیت کی بھرپور تفسیر رسول اکرم ﷺ کے اس ارشاد سے ہوئی ہے:

مَنْ أَحَبَّ لِلَّهِ وَانْفَضَّ لِلَّهِ وَاعْطَى لِلَّهِ وَنَفَعَ لِلَّهِ فَقَدْ اسْتَكْمَلَ الْإِيمَانَ (سنن ابی داؤد عن ابی امامہ)

”یعنی جس نے کسی سے دوستی و محبت کی تو اللہ کے لیے، اور دشمنی کی تو اللہ کے لیے اور کسی کو یا تو اللہ کے لیے اور کسی سے روکا تو اللہ کے لیے، اس نے اپنے ایمان کو کامل کر لیا یعنی وہ پورا مؤمن ہو گیا۔“

حضور ﷺ کے اس ارشاد سے صاف ظاہر ہے کہ بندہ مؤمن کا ہر قول و فعل اللہ تعالیٰ کی رضا کے تابع ہوتا ہے اور اس کے طرزِ حیات میں ایمان کا مل نتیجہ کے آثار نمایاں نظر آتے ہیں۔ ایمان کو عمل سے جدا نہیں کیا جاسکتا اس لیے کہ عمل ایمان کا نتیجہ اور ثمرہ ہے بلکہ یہی وہ علامت ہے جس سے لوگوں کو کسی کے مؤمن ہونے کا پتہ چلتا ہے یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں جا بجا ایمان اور عمل صالح کو ساتھ ساتھ اور یکجا بیان کیا ہے۔ قرآن حکیم میں بندہ مؤمن کے جو اوصاف و اعمال بیان ہوئے ہیں اور جو ایک مؤمن کی پہچان ہیں، ان میں سے کچھ یہ ہیں:

سورۃ انفال میں ارشاد ہوا ہے:

”سچے اہل ایمان تو وہی لوگ ہیں جن کے دل اللہ کا ذکر سن کر لرز جاتے ہیں اور جب اللہ کی آیات ان کے سامنے پیش کی جاتی ہیں تو ان کا ایمان بڑھ جاتا ہے اور وہ اپنے رب پر اعتماد رکھتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے

اس میں سے ہماری راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ ایسے ہی لوگ حقیقی مؤمن ہیں ان کے لیے ان کے رب کے پاس بڑے درجے ہیں قصوروں سے درگزر رہے اور بہترین رزق ہے۔“ (آیت ۲)

سورہ توبہ میں فرمایا گیا ہے:

”حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے مؤمنوں سے ان کے نفس اور مال سخت کے بدلے میں خرید لیے ہیں۔ وہ اللہ کی راہ میں مرتے مارتے ہیں ان سے جنت کا وعدہ اللہ کے ذمے ایک جنت وعدہ ہے۔ اللہ کی طرف بار بار پلٹنے والے۔ اس کی بندگی بجالانے والے اس کی حمد کرنے والے، اس کی خاطر زمین میں گھومنے والے، اس کے آگے رکوع و سجود کرنے والے، نیکی کا حکم دینے والے بدی سے روکنے والے اور اللہ کی حدود کی حفاظت کرنے والے، اس شان کے ہوتے ہیں مؤمن جو اللہ سے بیچ کا معاملہ کرتے ہیں۔“ (آیات ۱۱۴-۱۱۵)

سورہ مؤمنوں میں ارشاد ہوا ہے:

”یقیناً فلاح پائی ہے ایمان والوں نے جو اپنی نماز میں خشوع اختیار کرتے ہیں، انھی بات سے دور رہتے ہیں مذکوۃ دیتے ہیں، اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں اپنی امالتوں اور اپنے عہد و پیمان کا پاس رکھتے ہیں اور اپنی نمازوں کی پوری طرح حفاظت کرتے ہیں۔“ (آیات ۹۳-۹۴)

سورہ الرعد، سورہ الفرقان، سورہ الاحزاب اور سورہ التھوری میں مؤمنین کے یہ اوصاف بھی بیان ہوئے ہیں خیر کرنے والے، علانیہ اور پوشیدہ، صدقہ و خیرات کرنے والے، برائی کو بھلائی سے دفع کرنے والے زمین پر نرم چال چلنے والے، جاہل ان کے منہ آئیں تو ان کو دور سے سلام کہنے والے، مجھڑے اور قیام میں راتیں گزارنے والے، بے حیائی کے کاموں سے پرہیز کرنے والے، ہمیشہ سچ بولنے والے، غصہ آجائے تو اسے پی جانے اور درگزر کرنے والے۔

مؤمن کی ایک نشانی یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ اگر اس سے بٹھائے بشری کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو معاف سے اللہ یاد آتا ہے وہ توبہ کر کے اپنے قصور کی معافی



چاہتا ہے اور کبھی اپنے لیے ہراسہ نہیں کرتا۔

اب ہم رجب عالم خیر الخلق باہی برحق ﷺ کے چند ارشادات بیان کرتے ہیں جن میں آپؐ نے اُمت کو بتایا ہے کہ مومن کی پہچان کیا ہے، وہ کن اوصاف کا حامل ہوتا ہے اور کن باتوں سے اس کا دامن صاف ہوتا ہے۔

صحیحین میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے کوئی مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لئے وہی نہ چاہے جو وہ اپنے لیے چاہتا ہے۔

صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، مسلم وہ ہے جس کی زبان درازیوں اور دست درازیوں سے مسلمان محفوظ رہیں اور مومن وہ ہے جس کی طرف سے لوگوں کی اپنی جانوں اور مالوں کے بارے میں کوئی خوف خطر نہ ہو۔

سنن ابی داؤد میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سب سے زیادہ کامل ایمان اس کا ہے جس کے اخلاق زیادہ اچھے ہیں۔

صحیح بخاری میں حضرت ابو شریحؓ لُحَاحیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، واللہ (یعنی اللہ کی قسم) وہ مومن نہیں۔ واللہ وہ مومن نہیں۔ واللہ وہ مومن نہیں۔ عرض کیا گیا، یا رسول اللہ کون مومن نہیں؟ فرمایا، وہ آدمی جس کے ہادی اس کی شرارتوں اور آفتوں سے خائف رہتے ہوں۔

اسی طرح کی اور بہت سی احادیث کتب احادیث میں ملتی ہیں جن میں بندہ مومن کے کچھ اور اوصاف بھی بیان کیے گئے ہیں مثلاً:

مومن لعن ملعون کرنے والا نہیں ہوتا اور نہ فحش گو اور بدکلام ہوتا ہے وہ خیر اور ایمان کا شہ ہوتا ہے۔ وہ جھوٹا نہیں ہوتا۔ بدکار چور اور خائن نہیں ہوتا۔

۱۱۔ دوسرے ہر مومن کو اپنا بھائی سمجھتا ہے اس کے ضرر کو اُس سے دفع کرتا ہے اور اس کی غیر حاضری میں اس کے مال اسباب اور گھر کی نگہبانی کرتا ہے۔ دوسروں کو کھڑت سے سلام کرنے والا ہوتا ہے۔ حقوق العباد ادا کرنے کا خاص

خیال رکھتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

قرآن وحدیث سے بھی یہ بات پوری طرح ثابت ہو جاتی ہے کہ مؤمنین اور مؤمنات بہترین خلایق انسان ہیں۔ صرف ذاتی اعتبار ہی سے نہیں بلکہ اجتماعی لحاظ سے بھی کیونکہ اسلام اور علم کے درمیان معرکہ آرائی کا موقع آجائے تو بندہ مؤمن ہر حالت میں اسلام کا ساتھ دے گا خواہ اس میں اس کو کیسی ہی قربانی دینی پڑے۔ وہ اللہ کی راہ میں تمام ذاتی مفادات حتیٰ کہ جان مال اور لولا و بھی خوشی سے قربان کر سکتا ہے۔

حکیم فرشتہ علامہ محمد اقبالؒ نے ”دریا بہ جہاب اندر“ کے مصداق ان دو شعروں میں بندہ مؤمن کی کیا خوب تعریف فرمائی ہے:

ہاتھ ہے اللہ کا بندہ مؤمن کا ہاتھ      غالب و کار آفریں و کار کشا کار ساز  
خاک و نوری نہاد بندہ مولا صفات      ہر دو جہاں سے غنی، اس کا دل بے نیاز

دعا ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کو مؤمن بننے کی توفیق عطا فرمائے اور ہماری زندگی کا ہر لمحہ اپنے خالق و مالک کی رضا کے حصول میں منصرف ہو۔

## رحمتِ الہی کی وسعت

صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے جب اپنی مخلوقات کو پیدا کرنے کا ارادہ کیا تو ایک کتاب لکھی جو اس کے پاس عرش پر موجود ہے۔ اس کتاب میں یہ الفاظ ہیں کہ میری رحمت میرے غضب پر بہت لے گئی یا میری رحمت میرے غضب پر غالب آگئی۔

یہ حدیث قدسی منقولہ علیہ ہے۔ اس سے اہل ایمان اندازہ کر سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کا دائرہ کس قدر وسیع ہو سکتا ہے اسی لیے اس نے اپنے بندوں سے فرمایا ہے۔

لَا تَقْنَطُوا مِنْ رَحْمَةِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا إِنَّ اللَّهَ هُوَ  
الْقَلْبُورُ الرَّحِيمُ ۝ (الأنعام: ۵۳)

”یعنی اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو جاؤ، یقیناً اللہ سارے گناہ معاف کر دیتا ہے وہ تو  
قَلْبُورُ الرَّحِيمِ ہے۔“

فی الحقیقت رحمتِ الہی کی وسعت کی کوئی حد و نہایت نہیں۔ اس وسعت کو احاطہ بیان میں لانا ہر محال بلکہ ناممکن ہے۔ مگر پنجابی کے ایک صاحب دل شاعر ”صاحبِ سیفِ اسلوک“ میاں محمد بخش رحمۃ اللہ علیہ نے یہ شعر کہہ کر دریا کو گوندے میں بند کر دیا ہے:

جے کرو یکھاں غملاں وے لے کجھ نہیں میرے پئے

تے جے کرو یکھاں رحمت وے لے لے لے لے

یعنی اگر اپنے اعمال پر نظر ڈالوں تو اپنا دامن خالی نظر آتا ہے مگر جب میری رحمت پر نظر ڈالتا ہوں تو اس کی وسعت کی کوئی حد و نہایت دکھائی نہیں دیتی۔ مطلب



تو روئے زمین پر کوئی چلنے والی چیز یا منقش نہ چھوڑتا لیکن وہ سب کو  
ایک وقت مقرر ہو تک پہنچاتا ہے۔ پھر جب وہ وقت آ جاتا ہے  
تو اس سے ہر کوئی ایک گھڑی بھر بھی آگے پیچھے نہیں ہو سکتا۔

مطلب یہ کہ اس مہلت کے اندر انسان خوابِ غفلت سے بیدار ہو جائے  
اور توبہ کر لے تو پھر اللہ تعالیٰ کی رحمت اس کے غضب پر سبقت لے جائے گی۔

اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ نے اہل ایمان کو بار بار تائید فرمائی ہے کہ وہ  
تمام مخلوق خدا سے رحمت و شفقت کا سلوک کریں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو اپنا کبر  
قرار دیا ہے اور اسی شخص کو اپنی محبت اور رحمت کا مستحق قرار دیا ہے جو اس کی خیال یعنی  
مخلوق کے ساتھ احسان اور اچھا سلوک کرے۔ صحیحین میں حضرت جریر بن عبد اللہ رضی  
سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے لَا يَسُخِمْ اللَّهُ مَنْ  
لَا يَسُخِمْ النَّاسُ یعنی اس شخص پر اللہ کی رحمت نہ ہوگی جو انسانوں پر رحم نہ کھائے گا۔  
ایک اور حدیث میں جو حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے مروی  
ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ تم زمین والی مخلوق کے ساتھ رحم کا معاملہ کرو  
آسمان والا تم پر رحمت فرمائے گا۔ (سنن ابی داؤد۔ جامع ترمذی)

اللہ تعالیٰ نے رسول پاک ﷺ کو سارے جہانوں کے لیے رحمت بنا کر  
بھیجا جیسا کہ اس کا ارشاد ہے:

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ (الانعام: ۱۰) ساتھ ہی اس نے  
آپ کی ذاتِ اقدس کو یہ فرما کر ساری امت کے لیے نمونہ بنایا۔ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي  
رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (الاحزاب)

مفسرین ﷺ ساری مخلوق خدا کے لیے صبرِ جہنم اور حکمِ رحمت  
تھے۔ دوست، دشمن، بوڑھوں، بچوں، مردوں، عورتوں، کافروں، مسلمانوں، چمکندوں  
پرندوں ہر ایک پر رحم فرمایا کرتے تھے بالخصوص اہل ایمان کے لیے تو آپؐ سزا پر رحمت  
و شفقت تھے جیسا کہ سورہ توبہ میں فرمایا گیا ہے:

لَقَدْ كَانَ عَمَلُ رُسُلٍ بَيْنَ يَدَيْكَ خَيْرًا مِّنْ لِّفَسْكَكُمْ عَزِيزًا عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصًا عَلَيْكُمْ

بِالْمُؤْمِنِينَ زَوْقَ الْجَنَّةِ (آیہ: ۱۵۸)

”یعنی دیکھو تمہیں میں سے ایک رسول تمہارے پاس آیا۔ تمہارا نقصان میں نہ آس پر گراں گزرتا ہے، وہ تمہاری فلاح کا خواہشمند ہے، ایمان لانے والوں پر وہ بہت ہی مہربان اور رحم کرنے والا ہے۔“

حضور ﷺ امت کو بھی یہی تلقین فرمایا کرتے تھے کہ مخلوق خدا کے لیے باعثِ رحمت بنو باعثِ رحمت نہ بنو۔ اپنے عملوں پر بھروسہ نہ کرو بلکہ صرف اللہ کی رحمت پر بھروسہ کرو اور یہ اللہ جلّ جلالہ کی خاص رحمت ہے کہ مومن کی ایک نیکی کے بدلے میں دس سے سات سو تک نیکیاں لکھی جاتی ہیں جبکہ ایک گناہ کے بدلے میں صرف ایک ہی گناہ لکھا جاتا ہے۔

رحمتِ عالم ﷺ نے اللہ کی رحمت کے بارے میں فرمایا سو فرمایا خود اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

عَذَابِيْٓ اُصِيبُ بِهٖ مَنْ اَشَاءُ ۚ وَرَحْمَتِيْٓ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ۚ ۝

(الاعراف: ۱۵۶)

”یعنی سزا تو جسے میں چاہتا ہوں دیتا ہوں مگر میری رحمت ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے۔“  
دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کے دلوں میں رحمتِ الہی کی وسعت پر یقین کمال بخشتے سے بخشتے تر کر دے اور ہم دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اس کی رحمت پر بھروسہ کریں اس عقیدے کے ساتھ کہ اس کی رحمت سے ناامید ہونا گمراہوں اور کافروں کا کام ہے۔

## کائنات کی ہر چیز تقدیر کی پابند ہے

مسٹر احمد جامع ترمذی اور شیخ ابن ماجہ میں حضرت اہل خزاندہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ میرے والد نے بیان کیا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا یا رسول اللہ! کیا ارشاد ہے اس بارے میں کہ جھاڑ پھونک کے دو طریقے ہیں جن کو ہم دکھ درد میں استعمال کرتے ہیں یا دوائیں جن سے ہم اپنا علاج کرتے ہیں یا مصیبتوں اور تکلیفوں سے بچنے کی دو تدبیریں جن کو ہم اپنے بچاؤ کے لیے عمل میں لاتے ہیں، کیا یہ چیزیں اللہ کی تقدیر کو نال سکتی ہیں۔؟ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ یہ سب چیزیں بھی اللہ کی تقدیر سے ہیں۔

تقدیر جیسے نازک مسئلہ پر دانائے کونین ﷺ کا یہ مختصر جواب اتنا جامع اور حکیمانہ ہے کہ تقدیر کے بارے میں مختلف ذہنوں میں پیدا ہونے والے شبہات خود بخود دور ہو جاتے ہیں۔ آپؐ نے اُمت کو سمجھایا ہے کہ ہم جن مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے جو تدبیریں اور کوششیں کرتے ہیں اور اس سلسلے میں جن اسباب کا استعمال کرتے ہیں، وہ سب اللہ تعالیٰ کی قضاء و قدر کے ماتحت ہیں گویا اللہ تعالیٰ کی طرف ہی سے یہ مقدمہ اور مقرر ہوتا ہے کہ فلاں شخص پر فلاں وقت میں فلاں بیماری آئے گی اور فلاں قسم کی جھاڑ پھونک یا فلاں دوا کے استعمال سے وہ اچھا ہو جائے گا۔ اسی طرح یہ بھی اس کی تقدیر میں ہے کہ فلاں شخص فلاں تدبیر استعمال کرے گا تو خطرے اور نقصان سے محفوظ رہے گا یا نہیں۔ کہ اسباب تقدیر سے خارج نہیں ہیں بلکہ تقدیر ہی میں لکھا ہوتا ہے کہ وہ استعمال کرے گا تو شفا یاب ہو گے۔ ذوالحال استعمال کرے گا تو دشمن کے وار سے بچ جائے گا۔ یہی ہدایاں

در حقیقت تقدیر الہی پر ایمان لانا اسلام کی شرائط میں سے ہے یعنی ایک

مسلمان پر لازم ہے کہ وہ تقدیر الہی پر ایمان لائے۔ قرآن حکیم جگہ جگہ مسئلہ تقدیر کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے اور بنی نوع انسان کی رہنمائی کرتا ہے۔  
سورۃ الفرقان میں ارشاد ہوتا ہے:

وَعَلَّقَ كُلُّ شَيْءٍ فَلَقَدْ ذَرَأْتَ النَّجْمَ (آیہ ۲)

”اس نے ہر چیز کو پیدا کیا پھر اس کی تقدیر کو اس کے لیے مقدر کر دیا۔“

سورۃ الانعام میں فرمایا گیا ہے:

وَعِنْدَهُ مَفَاتِيحُ الْغَيْبِ لَا يَعْْلَمُهَا إِلَّا هُوَ ط وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَرَقَةٍ إِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٌ فِي ظُلْمٍ الْأَرْضِ وَلَا ذَرْبٌ وَلَا  
يَا بَسِ إِلَّا بِنِي كِتَابٍ مُبِينٍ (آیہ ۵۹)

ترجمہ: ”اسی (اللہ) کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں جنہیں اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ بحر و بر میں جو کچھ ہے سب سے وہ واقف ہے۔ درخت سے گرنے والا کوئی پتہ ایسا نہیں جس کا اسے علم نہ ہو۔ زمین کے تاریک پردوں میں کوئی ایسا دانشمند جس سے وہ باخبر نہ ہو۔ غلک و ترسب کچھ ایک کھلی کتاب میں لکھا ہوا ہے۔“

سورۃ الاحزاب میں ارشاد ہوتا ہے:

وَتَحْكُمُ أَمْرُ اللَّهِ فَنُفِذُ مَقْدُورًا (آیہ ۳۸)

”ترجمہ: اللہ کا حکم ایک قطعی طے شدہ فیصلہ ہوتا ہے۔“

سورۃ الشقاقین میں فرمایا گیا ہے:

مَا أَصَابَ مِنْ مُصِيبَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ ط (آیہ ۱۱)

ترجمہ: ”کوئی مصیبت کبھی نہیں آتی مگر اللہ کے اذن ہی سے آتی ہے۔“

اسی طرح قرآن حکیم میں اور بہت سی آیات ہیں جو ہمیں بتاتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات کی ہر شے کی حد اور مقدار مقرر کر دی ہے جس سے کوئی شے تجاوز نہیں کر سکتی، کائنات کا ذرہ ذرہ زندانی تقدیر ہے، ہر الہی ازل سے مقرر شدہ ہے۔ قسموں کو جانا اور بگاڑنا اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے، اس کے حکم کے بغیر کچھ بھی



نہیں مل سکا۔ دنیا میں مصیبتیں اور تکلیفیں نہ تو ہمارے بنانے سے آتی ہیں اور نہ ہمارے مٹانے سے غلتی ہیں جو کچھ بھی ہم پر گزرتی ہے اس کے حکم سے گزرتی ہے۔ اللہ کی مشیت کے مقابلے میں انسان کی کوئی تدبیر ہرگز کارگر نہیں ہو سکتی۔ اس کے فیصلوں کو رد کرنا کسی کے بس کی بات نہیں۔ انسان کا کوئی خیال ہو یا عمل، خیریت ہو یا اراۓہ، کوئی بھی چیز اللہ تعالیٰ کی معز رکی ہوئی تقدیر سے باہر نہیں۔ وہ پاک پروردگار کسی جگہ بھی عاجز اور انسان کے کاموں میں بے دخل نہیں بلکہ وہ قادر اور حاکم ہے اور ارض و سما میں اس کے حکم کے سوا کسی اور کا حکم نہیں چل سکا۔ کوئی قوم نہ اللہ کی دینی ہوئی مہلت سے پہلے بٹ سکتی ہے اور نہ اس کے بعد باقی رہ سکتی ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے اپنی زمین کا وارث بنادیتا ہے جتنا رزق کسی کی تقدیر میں لکھا ہے وی اس کو ملتا ہے۔ اس میں کمی بیشی اللہ کے اختیار میں ہے اور یہ بھی تقدیر میں لکھی ہوتی ہے۔ ہدایت اور ضلالت اللہ کے اختیار میں ہے وہ جسے چاہتا ہے، ہدایت دیتا ہے اور جسے گمراہی میں پھینک دیتا ہے اسے کوئی ہدایت نہیں دے سکا۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر انسان کا ہر عمل اس کی تقدیر میں لکھا ہوا ہے تو کیا اسے مجبور محض سمجھنا چاہیے؟ اور اگر وہ مجبور محض ہے تو پھر آخرت میں اس کے محاسبے کا کیا جواز ہے؟

اس سوال کا جواب یا اس اشکال کا حل حضرت ابی خزامہ رضی اللہ عنہ کے سوال کے جواب میں رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد سے مل جاتا ہے جس کو اس مضمون کے آغاز میں بیان کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں سمجھنے کی ایک حدیث ملاحظہ ہو:

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اجماع میں سے ہر شخص کی دوزخ اور جنت لکھی جا چکی ہے یعنی اگر وہ (اللہ) چاہتا تو ہم سب کو ہدایت دے دیتا۔ لوگوں نے اس پر کہا، یا رسول اللہ! پھر ہم اپنے لکھے ہوئے یعنی تقدیر کا کیوں نہ سہارا لیں اور عمل چھوڑ دیں؟

آپ نے فرمایا: عمل کرو کیونکہ ہر شخص کو اسی بات کی توفیق ملتی ہے جس

کے لیے وہ پیدا کیا گیا ہے۔ جو خوش نصیب ہو اس کو ایسے عمل کی توفیق ملتی ہے جس سے  
بخش ملے اور جو بد نصیب ہے اس کو ایسے عمل کی توفیق ملتی ہے جس کے نتیجے میں اس  
کو جہنم ملے۔

اس کے بعد آپؐ نے سورہ ذالکھل کی یہ آیات پڑھیں۔

فَإِنَّمَنْ أَغْنَىٰ وَافْقَىٰ ۖ وَضَلَّقْ بِالْخُسْنَىٰ ۖ فَتَسْبِرْهُ  
بَلْبُسَرَىٰ ۖ وَإِنَّمَا بَجَلْ وَاسْتَغْنَىٰ ۖ وَكَلْبٌ بِالْخُسْنَىٰ ۖ فَتَسْبِرْهُ  
بَلْبُسَرَىٰ ۖ (آیات ۱۰ تا ۱۵)

اس حدیث میں آنے والی قرآنی آیات کا ترجمہ اور تفسیر یہ ہے:

جس نے (راہ خدا میں) مال خرچ کیا اور تنہائی کی راہ اختیار کی اور بھلائی کو  
سچ مانا (یا بہترین بات کی تصدیق کی) اس کو ہم آسان راستے کے لیے سہولت دیں  
گے (یعنی ہم اس کو جنت دلانے والی نیکی کے کاموں کی توفیق دیں گے) اور جس نے  
اپنا مال (راہ خدا میں) کھینچنے میں نکل کیا اور اللہ سے بے نیاز رہا اور بھلائی کو جھٹلایا تو  
ہم اس کو سخت راستے کے لیے سہولت دیں گے (یعنی اس کو جہنم کا مستحق بنانے والے  
کاموں کی توفیق دیں گے۔)

تقدیر کے بارے میں قرآنی آیات اور رسول اکرم ﷺ کے ارشادات  
کی روشنی میں جمہور علماء اسلام نے یہ مؤقف اختیار کیا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ہر  
شخص کو ہدایت یافتہ ہی پیدا کرتا یا سب انسانوں کو ہدایت دیتا جیسا کہ اس نے فرمایا:

وَلَوْ شَاءَ لَهَدَيْتُكُمْ أَجْمَعِينَ (الشکل: ۹)

”یعنی اگر وہ اللہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت دے دیتا“

لیکن یہ اس کی مشیت کا تقاضا نہ تھا۔ اس کی مشیت یہ تھی کہ انسان کو عقل و  
شعور اور ذرائع علم سے بہرہ ور کر کے اس کا اختیار یا آزادی دی جائے کہ وہ نیکی اور  
بدی، خیر اور شر، حق اور باطل میں تمیز کر سکے اور اپنے لیے راہ عمل کا انتخاب  
کر سکے۔ حق تعالیٰ نے انسان کو اندر اور باہر کی بے شمار چیزوں پر تصرف عطا کیا

اور اس کے ظاہر و باطن میں ہر طرف بے شمار ایسے اسباب بھی دکھ دیے جو اس کے لیے ہدایت کا موجب بھی بن سکتے ہیں اور گمراہی کا موجب بھی۔ ساتھ ہی اس نے انسان کو اپنے ارادے اور اختیار سے اچھا یا برا عمل کرنے کی آزادی دے دی۔ اگر تمام انسان پیداؤشی طور پر ہدایت یافتہ ہوتے تو سب چیزیں بے مقصد اور بے معنی ہو جاتیں۔ دراصل انسان کا عمل ہی وہ شے ہے جس کی بنیاد پر اس کا محاسبہ ہوگا۔ اس کا ہر عمل اور آخرت میں اس کی جزا اور سزا ہر بات اس کی تقدیر میں لکھ دی گئی ہے۔ بالفاظ دیگر ہر انسان کی تقدیر میں یہ لکھا ہوا ہے کہ وہ اپنے ارادے اور اختیار سے ایسا کرے گا پھر اس سے کیا نتیجہ نکلے گا اور اس کو کیا جزا یا سزا ملے گی۔ اگر انسان کسی مصیبت یا تکلیف میں مبتلا ہوتا ہے اور اس کے نتیجے میں وہ ناکارہ اور معذور ہو جاتا ہے یا مرجاتا ہے تو بھی اس کی تقدیر میں مرقوم ہے اور اگر وہ دعا، توبہ، استغفار یا کسی دوا سے صحت یاب ہو جاتا ہے یا اس کی مصیبت ختم جاتی ہے تو یہ سب کچھ اس کی تقدیر میں لکھا ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، ہر چیز تقدیر سے ہے یہاں تک کہ آدمی کا ناکارہ ہونا یا قاتل اور ہوشیار ہونا بھی تقدیر ہی سے ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ انسان نہ تو ایسا "مجبور محض" ہے کہ اپنے ہر بھلے برے کام کا ذمہ دار اللہ تعالیٰ کو ٹھہرائے اور کہے کہ اس کے خالق اور مالک نے اس سے یہ کام زبردستی لیا ہے اس لیے اس کا محاسبہ عدل کے منافی ہوگا لیکن انسان اتنا خود مختار بھی نہیں کہ اپنی عقل اور تدبیر سے ہر کام اپنی مرضی کے مطابق کر سکے۔ ایک مسلمان کا ایمان اس بات پر ہونا چاہیے کہ دنیا میں جو چیز وقوع پذیر ہوتی ہے اور انسان کو مہد سے لحد تک اور آخرت میں جو کچھ پیش آتا ہے وہ تقدیر میں لکھا ہوا ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انسان اپنے کسی عمل کا ذمہ دار نہیں۔ فی الحقیقت عقل سے زندگی بنتی ہے، رخت بھی جھٹم بھی یہ خاک اپنی لطافت میں خدو ری ہے شناری ہے

## ذِکْرِ الٰہی

قرآن حکیم اور احادیث نبوی میں مومن کے جو اوصاف بیان ہوئے ہیں ان میں سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ وہ دکھ اور شکھ، جھگڑتی اور قارخ الہابی، بیماری اور تندرستی ہر حال میں اللہ تعالیٰ کی رضا پر شاکر رہتا ہے اور اس کی حمد و ثناء اور تسبیح و تقدیس میں مشغول رہتا ہے۔ سورۃ آل عمران میں ارشاد ہوا ہے:

إِنِّ بَيْنِي وَبَيْنَ الْغُلَامِ وَالْغُلَامِ وَالْغُلَامِ وَالْغُلَامِ وَالْغُلَامِ وَالْغُلَامِ  
الْغُلَامِ وَالْغُلَامِ وَالْغُلَامِ وَالْغُلَامِ وَالْغُلَامِ وَالْغُلَامِ  
بَيْنِي وَبَيْنَ الْغُلَامِ وَالْغُلَامِ (آیہ ۱۹۰-۱۹۱)

یعنی زمین اور آسمان کی پیدائش میں اور رات اور دن کے باری باری سے آنے میں ان ہوشمند لوگوں کے لیے بہت نشانیاں ہیں جو اٹھتے، بیٹھتے اور لیٹتے ہر حال میں اللہ کو یاد کرتے ہیں اور آسمان و زمین کی ساخت پر غور و فکر کرتے ہیں۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ کو یاد کرنے یا اس کا ذکر کرنے سے کیا مراد ہے۔ فی الحقیقت ذکر الہی کا اطلاق اپنے وسیع معنی کے اعتبار سے نماز، تلاوت قرآن اور دعا، واستغفار سب پر ہو سکتا ہے لیکن مخصوص عرف و اصطلاح میں اللہ جلّ شلتھ کی توحید و تعبد، تسبیح و تقدیس، شکر و بیاس، اس کی کبر پائی اور صفات کمال کے بیان اور دھیان کو ذکر اللہ کہا جاتا ہے لیکن یٰٰلَہُ عَزَّوَجَلَّ کے ساتھ یٰٰنَفْسُ عَزَّوَجَلَّ بھی فرمایا گیا ہے۔ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی نشاندہی میں غور و فکر کرنا ہے۔ یہ غور و فکر اللہ کے ذکر بندوں کو یقیناً اس نتیجے پر پہنچاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات ارضی و سماوی کی کسی شے کو بے مقصد پیدا نہیں کیا بلکہ اپنی بندگی کے لیے پیدا کیا ہے اور انسان کے لیے آخرت کی کامیابی اسی بندگی کے ساتھ مشروط ہے۔ گویا ذکر و فکر مومن کی زندگی کا ایک تابعدہ اور قابل تہلیل پہلو ہے اس کی نزکات میں سر فہرست اللہ کا قرب اور اس کی رضا ہے۔ یہ قرب و رضا آخرت میں تو یقیناً کامیابی کی ضمانت ہے دنیا میں بھی ذکر الہی تسکین روح

اور اطمینان قلب کا باعث ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ  
تُطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ (الزمرہ ۲۸) یعنی جان لو کہ اللہ کے ذکر ہی سے دلوں کو تسکین اور  
سکون ملتا ہے۔

عنا سر آٹوی رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر ”روح المعانی“ میں لکھا ہے کہ ثوابِ فکر یہ  
کی صحت کو رد کر پر موقوف ہے کیونکہ عقل ہدایت کے لیے کافی نہیں جب تک ذکرِ الہی  
کے نور سے نواز نہ ہو۔ مطلب یہ ہے کہ ذکرِ الہی کو فکر پر ٹھکانہ حاصل ہے ہوشمند اور  
صابب بصیرت وہی بندے ہیں جو ہر حال میں اللہ کا ذکر کرتے رہتے ہیں اور جو ذکر  
اللہ سے غافل ہیں وہ عقل و بصیرت سے محروم ہیں اور ان کی فکر پر اگندہ اور ڈولیدہ  
ہو سکتی ہے۔ ذکرِ الہی کی اہمیت کو سمجھنے کے لیے سورۃ غلکھوت میں وارد ہونے والے  
اس ارشادِ خداوندی کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ وَلَیْسَ ثَمَّوُ اللّٰہِ اَکْثَرُ (آیہ ۳۵)  
”یعنی یقین کر دو کہ اللہ کا ذکر ہر چیز سے بزرگ تر ہے“ اور پھر قرآن پاک میں جہاں  
جاہا اللہ تعالیٰ کا ذکر کثرت سے کرنے کا حکم دیا گیا ہے وہاں اس کے ثمرات بھی واضح  
طور پر بیان کر دیے گئے ہیں۔ پہلا ثمرہ تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والے کو اللہ  
بھی یاد رکھے گا جیسا کہ سورۃ بقرہ میں ارشاد ہوا ہے لَیْذِکْثَرُ وِیْسِ اَذِکْثَرُ ثُمَّ دوسرا  
ثمرہ اطمینان قلب ہے اور تیسرا ثمرہ خاص بخشش اور ثوابِ عظیم جیسا کہ سورۃ احزاب  
میں فرمایا گیا ہے

وَاللّٰہِ اَکْثَرُ مِنَ اللّٰہِ اَکْثَرُ وَاللّٰہِ اَکْثَرُ ۝ اَعَدَّ اللّٰہُ

لَهُمْ مَغْفِرَةً وَّ اَجْرًا عَظِیْمًا ۝ (آیہ ۳۵)

”اور کثرت سے اللہ کا ذکر کرنے والے اس کے بندے اور اس کی بندیاں، اللہ تعالیٰ  
نے ان کے لیے خاص بخشش اور بڑا اجر مہیا کر رکھا ہے“

کثرت سے اللہ کا ذکر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہر مومن اور مومنہ کی  
زبان پر زندگی کے ہر معاملے میں اور ہر حال میں اللہ تعالیٰ کا نام آتا رہے۔ اس کے  
لیے وقت کی کوئی قید نہیں بلکہ دوسری جتنی بھی مبادیات ہیں ان کے لیے بہر حال کوئی

وقت ہوتا ہے۔ ذکر الہی کی عبادت ہر وقت جاری رکھی جاسکتی ہے کثرت سے اللہ کا ذکر کرنے والے جب کوئی دوسری عبادت کرتے ہیں تو ان کو یہی نیک عمل کرنے والے ان لوگوں سے بہت زیادہ اجر ملتا ہے جو اللہ کا ذکر ہمیشہ نہیں چند خاص اوقات ہی میں کرتے ہیں۔ مسند احمد میں حضرت معاذ بن انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ یا رسول اللہ! جہاد کرنے والوں میں سے زیادہ اجر پانے والا کون ہے؟ آپؐ نے فرمایا، جو ان میں اللہ تعالیٰ کا سب سے زیادہ ذکر کرنے والا ہے۔ اس نے عرض کیا، روزہ رکھنے والوں میں سب سے بڑھ کر اجر کون پائے گا؟ آپؐ نے فرمایا، جو ان میں سے سب زیادہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والا ہو۔ پھر اس شخص نے اسی طرح نماز، زکوٰۃ، حج اور صدقہ ادا کرنے والوں کے حقیقی پوچھا اور رسول اللہ ﷺ نے ہر ایک کا یہی جواب دیا کہ جو اللہ تعالیٰ کا سب سے زیادہ ذکر کرنے والا ہو۔

امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے ”دعوات الکبیر“ میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ ہر چیز کی صفائی کے لیے کوئی مہصل ہے اور دلوں کا مہصل (یعنی ان کی صفائی کا مسالہ) اللہ کا ذکر ہے اور اللہ کے عذاب سے بچانے اور نجات دلانے میں اللہ کا ذکر جس قدر مؤثر ہے۔ اتنی کوئی دوسری چیز مؤثر نہیں۔ لوگوں نے عرض کیا، یا رسول اللہ! جہاد فی سبیل اللہ بھی نہیں؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا ہاں اور جہاد بھی عذاب خداوندی سے نجات دلانے میں ذکر کے برابر مؤثر نہیں جس کا کرنے والا ایسی جاننازی سے جہاد کرے کہ تلوار چلاتے چلاتے اس کی تلوار بھی ٹوٹ جائے۔

جس طرح قرآن حکیم کی بعض آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے ذکر کو ہر چیز کے مقابلے میں عظمت و فوقیت حاصل ہے اسی طرح بہت سی احادیث نبوی سے ظاہر ہوتا ہے کہ نماز سے لے کر جہاد تک تمام اعمال صالحہ کی روح اور جان اللہ کا ذکر ہے اور یہ ذکر نہایت عاجزی اور خوف کے ساتھ ہونا چاہیے جیسا کہ سورۃ الاعراف میں

فرمایا گیا ہے:

وَاذْكُرْ رَبَّكَ فِي نَفْسِكَ نَضَرْنَا عَنْ وَجْهِكَ (آیہ: ۲۰۵)

”یعنی اپنے رب کا ذکر کرو اپنے جی میں (یعنی دل سے) گڑ گڑا کر اور خوف کی کیفیت کے ساتھ“

قرآن و حدیث میں جس طرح اللہ کے ذکر کی تاکید کی گئی ہے وہاں اہل ایمان کو یہ بھی بتایا گیا ہے کہ جو لوگ اولاد، دولت، طاقت اور اقتدار کے گھمنڈ میں یادِ خدا کی لذتوں اور بہاروں میں مست ہو کر اللہ کی یاد سے غافل ہو جائیں گے وہ بڑے گمراہ اور نقصان میں رہیں گے۔

سورۃ النبیؑ میں ارشاد ہوا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُلْهِكُمْ أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ (آیہ: ۹)

یعنی اے لوگو! جو ایمان لائے ہو تمہارے مال اور تمہاری اولادیں تم کو اللہ کے ذکر سے غافل نہ کریں۔

سورۃ نور میں ان لوگوں کا جو ہر حال میں اللہ کا ذکر کرتے ہیں اس طرح ذکر کیا گیا ہے:

وَجَاهِلٌ ۚ لَا تُلْهِهُمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ (آیہ: ۳۷)

”یعنی وہ لوگ جن کو تجارت اور خرید و فروخت اللہ کے ذکر (اللہ کی یاد) سے غافل نہیں کرتی“

ایک مسلمان پر لازم ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی یاد سے کسی وقت بھی غافل نہ ہو۔ وہ زندگی کا ہر (جائز اور ضروری) کام معمول کے مطابق کرتا رہے لیکن اپنا دھیان ہر دم اس یقین کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف رکھے کہ وہ مجھے دیکھ رہا ہے، وہ میری ہر بات سن رہا ہے، وہ میرے دل کا حال جانتا ہے، وہی بہترین کارساز اور مشکل کشا ہے وہی رازقی اور حاجت روا ہے۔ اسلام کا اپنے ہر ماننے والے سے تقاضا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر کامل ایمان رکھے اور اپنی کوشش اور تدبیر کے ساتھ توکل اللہ تعالیٰ ہی پر کرے وہ ہر دم اسی کے رحم اور فضل کا امیدوار رہے اور کسی نہ کسی صورت میں اس کا

ذکر کرتا رہے۔ کوئی کام شروع کرے تو کہے ”بِسْمِ اللّٰهِ“ کوئی دوسرہ کرے تو کہے ”اِنْ شَاءَ اللّٰهُ“ کوئی اس پر احسان کرے تو کہے ”جَزَاكَ اللّٰهُ“ کسی کی موت کی خبر سنے تو کہے ”اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُونَ“۔ کہیں گناہ کا سامان یا معصیت کی بات دیکھے تو کہے ”اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ“ اچھائی اور قلب و نظر کو اچھی لگنے والی چیز دیکھے تو کہے ”مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ الْاَكْرَمِ ﷺ“ کا اسم گرامی سنے تو کہے ”صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ“ چمیک آئے یا کوئی نعمت / خوشی حاصل ہو تو کہے ”اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ“۔ کسی دوسرے کی چمیک سنے تو جواب میں کہے ”بِرَحْمَتِكَ اللّٰهُ“۔ اچھی بات سنے تو کہے ”تَبْحَنَ اللّٰهُ“۔ خیریت پوچھے جانے پر کہے ”اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ“۔ شیطان سے بچنے کے لیے کہے ”اَعُوْذُ بِاللّٰهِ“۔ صحابہ کرام کا نام لے تو کہے ”رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ“۔ مروجین کا نام لے تو کہے ”رَحِمَهُ اللّٰهُ“۔ کسی کا ڈر ہو یا خوف ہو تو کہے ”خَشِيَ اللّٰهُ“۔

شیخ سعدی شیرازی رحمۃ اللہ علیہ نے کیا خوب لکھا ہے:

”ہر نفسے کہ فروئے زودمد حیات است

وچل ہمیں آید مفرح ذات، پس در

ہر نفسے دولت موجود است و در

ہر نعمتِ شکرے واجب“۔

یعنی ہر سانس جو بچے (اندر) جاتا ہے، وہ زندگی بڑھانے والا ہے اور وہی سانس جب اوپر آتا ہے وہ ذات کو فرحت بخشتا ہے پس ہر سانس میں دو نعمتیں موجود ہیں اور ہر نعمت پر اللہ تعالیٰ کا شکر واجب ہے۔

گویا انسان کی زندگی کا کوئی لمحہ اپنے خالق و مالک کے ذکر اور شکر سے خالی نہیں رہنا چاہیے ذکرِ اٹنی کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ ذکر کرنے والے کو خود اللہ تعالیٰ یاد رکھتا ہے جیسا کہ سورہ بقرہ میں ارشاد ہوا ہے:

فَاذْكُرُونِيْ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْا (آیہ: ۱۵۴)



یعنی (اے لوگو!) تم میرا ذکر کرو میں تمہیں یاد رکھوں گا اور میرا شکر ادا کرو، کفر ان نعمت نہ کرو۔

صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب میرا بندہ مجھے یاد کرتا ہے اور میری یاد میں اس کے ہونٹ ہلتے ہیں تو اس وقت میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں۔

گویا ذکر الہی کرنے والے کو اللہ تعالیٰ کا سایہ رحمت بر او راست نصیب ہو جاتا ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ایک اعرابی (دیہاتی عرب) رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور عرض کیا، مجھے کوئی ایسا کلام سکھا دیجیے جس سے میں اپنے رب کو یاد کروں۔ آپ نے فرمایا کہو

لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَخُذْهُ لَا خَيْرَ لَكَ اللَّهُ أَكْبَرُ خَيْرًا وَالْحَمْدُ لِلَّهِ خَيْرًا  
وَسُبْحَانَ اللَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ، لَا خَوْفَ وَلَا حُزْنَ إِلَّا بِاللَّهِ الْغَنِيُّ  
الْمُخْبِتِينَ (۱)

اس شخص نے کہا کہ یہ تو اللہ کے لیے ہوا، میرے لیے کیا ہے، میں کیا کہوں، آپ نے فرمایا تم کہو اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِيْ وَارْحَمْنِيْ وَاهْدِنِيْ وَارْزُقْنِيْ (۲)  
وہاں اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق دے کہ ہم خوف اور زاری کے ساتھ ہر حال میں اپنے خالق و مالک کا ذکر کرتے رہیں۔

(۱) ترجمہ: اللہ کے سوا کوئی اور الہ (معبود) نہیں وہ اکیلا ہے کوئی اس کا شریک نہیں اللہ سب سے بڑا ہے اس کے لیے شکر اور تعریف ہے۔ اللہ ہر نقص اور عیب سے پاک ہے، ہمارے جہانوں کا مالک (پالنے والا اور آقا) ہے، اللہ کے سوا کسی کے پاس کوئی قوت نہیں، وہی عزت اور حکمت والا ہے، (اقتدار کا مالک مطلق اور اس کو علم اور انصاف کے ساتھ استعمال کرنے والا ہے)۔

(۲) ترجمہ: ”اے اللہ! تو میرے گناہ، معاف فرما دے، مجھ پر رحم فرما، مجھے ہدایت نصیب فرما اور مجھے رزق عنایت فرما۔“

## توبہ

”توبہ“ عربی زبان کا (مؤثرت) لفظ ہے۔ اس کے ایک معنی تو رجوع کرنے اور پلٹنے کے ہیں اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ انسان سے جو غلطی سرزد ہوئی ہو، وہ اس پر نادم ہو اور جس برائی کا وہ مرتکب ہوا ہے یا ہوتا رہا ہے اس سے باز آ جائے اور آئندہ اس کا ارتکاب نہ کرنے کا عہد کرے۔ گناہ کا ارتکاب کرنے والے کسی بندہ مسلمان کے توبہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ کی مافرمائی یا سرکشی سے باز آ گیا اور طریق بندگی کی طرف پلٹ گیا۔ جب اللہ جلّٰی شانہ اپنے آپ کو توباب کہتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے شر مسار بندے پر رحمت کی نظر کرنے والا ہو تو توبہ قبول کرنے والا ہے۔ توبہ کن لوگوں کی قبول ہوتی ہے اور کن لوگوں کی نہیں ہوتی؟ اس کا جواب سورۃ النساء میں یوں دیا گیا ہے:

ترجمہ: یہ جان لو کہ اللہ پر توبہ کی قبولیت کا حق انہی لوگوں کے لیے ہے جو نادانی کی وجہ سے کوئی برافضل کر بیٹھتے ہیں اور اس کے بعد جلد ہی توبہ کر لیتے ہیں۔ ایسے لوگوں پر اللہ اپنی قلم عنایت سے پھر متوجہ ہو جاتا ہے اور اللہ ساری باتوں کی خبر رکھنے والا حکیم و دانہ ہے مگر توبہ ان لوگوں کے لیے نہیں ہے جو نہ بے کام کیے چلے جاتے ہیں یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کی موت کا وقت آ جاتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میں نے توبہ کی اور اسی طرح توبہ ان کے لیے بھی نہیں جو مرتے دم تک کافر رہیں۔ (آیہ ۱۷-۱۸)

اسی طرح سورۃ الانعام میں ارشاد ہوا ہے:

جب تمہارے پاس وہ لوگ آئیں جو آیات پر ایمان لاتے ہیں تو ان سے کہو اتم پر سلامتی ہے۔ تمہارے ذہن نے رحم و کرم کا شہدہ اپنے اوپر لازم کر لیا ہے۔ یہ اس کا رحم و کرم ہی ہے کہ اگر تم

میں کوئی نادانی سے کسی برائی کا ارتکاب کر بیٹھا ہو پھر اس کے بعد توبہ کرے اور اصلاح کرے تو وہ اسے معاف کر دیتا ہے اور نرمی سے کام لیتا ہے۔ (آیہ ۵۴)

ان ارشادات ربانی سے صاف ظاہر ہے کہ توبہ صرف اہل ایمان کی قبول ہوتی ہے اور صرف اُن اہل ایمان کی جو قصدِ انہیں بلکہ نادانی کی بناء پر قصور کرتے ہیں اور جب اُن کی آنکھوں سے جہالت کا پردہ ہٹتا ہے تو شرمندہ ہو کر توبہ کر لیتے ہیں۔ ایسے بندے جب بھی اپنے قصور پر غامد ہو کر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کریں گے اُس کا دروازہ کھلا پائیں گے۔

اِس ذرگہ ما ذرگہ نو میدی بیست

صد بار اگر توبہ غفلتی باز آ

مگر اُن لوگوں کی توبہ قبول نہیں ہوتی جو اللہ کے خوف سے بے نیاز ہو کر تمام غمِ گناہ پر گناہ کئے چلے جائیں اور پھر جب موت سر پر آکھڑی ہو اس وقت اللہ سے معافی مانگنے لگیں۔ رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ اللہ بندے کی توبہ اُسی وقت قبول کرتا ہے جب تک آثارِ موت شروع نہ ہو جائیں۔ اس ارشادِ نبوی ﷺ کے مطابق موت کے وقت انسان کے امتحان یا آزمائش کی سہلت پوری ہو جاتی ہے چونکہ وہ امتحان میں پورا نہیں اترا اس لیے اس کی توبہ کا وقت بھی گزر گیا۔ اسی طرح جب کوئی شخص ذولبِ ایمان سے محروم رہا اور فکر کی حالت میں مرانوت کے وقت اس کی توبہ بھی قبول نہیں ہوتی۔ یہاں یہ امر بھی پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ اگر کوئی مسلمان توبہ کرتا ہے تو اس توبہ کا تقاضا یہ ہے کہ توبہ کرنے والے سے جو گناہ پہلے سرزد ہو چکے ہوں وہ ان کی عطا کرنے کی پوری کوشش کرے اور جہاں عطا کی کوئی صورت ممکن نہ ہو تو اللہ سے بار بار معافی مانگے اور زیادہ سے زیادہ نیکیاں کر کے اُس داغ کو دھو تارے جو اُس کے دامن پر لگ چکا ہے لیکن کوئی توبہ اس وقت تک نئی توبہ نہیں ہوتی جب تک کہ یہ اللہ اور صرف اللہ کو راضی کرنے کی نیت سے نہ ہو۔ کسی دوسری وجہ

باغرض یا کسی بھوری کی بناء پر کسی نہ سے فعل کو چھوڑ دینا تو بہی قریب ہی میں نہیں آتا۔  
سورہ ہود میں ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا:

وَاسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُؤْتَوْنَ لَهُ طَائِفًا مِّنْ رَّحْمَتِهِمْ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (کہ) یعنی اپنے رب سے معافی مانگو اور اس کی طرف پلٹ آؤ۔ بے شک میرا رب رحیم ہے اور اپنی مخلوق سے غیب رکھتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اللہ کو اپنے بندوں کا تو بہ کرنا بہت محبوب ہے وہ بڑا رحم کرنے والا ہے اور اپنی پیدا کی ہوئی مخلوق سے بے پایاں محبت رکھتا ہے یہی بات رسول اللہ ﷺ نے یہ مثال دے کر واضح فرمائی کہ اگر تم میں سے کسی شخص کا اونٹ ایک نوق و ذوق صحرا میں گم ہو گیا ہو اور اس کے کھانے پینے کا سامان بھی اونٹ پر لدا ہوا اور وہ شخص اس کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر ملا پس ہو چکا ہو یہاں تک کہ زندگی سے ناامید ہو کر ایک درخت کے نیچے لیٹ گیا ہو اور عین اس حالت میں وہ یکا یک دیکھے کہ اُس کا اونٹ اُس کے سامنے کھڑا ہے تو اُس وقت جیسی خوشی اس کو ہوگی اس سے بہت زیادہ خوشی اللہ تعالیٰ کو اپنے بندے ہوئے بندے کے تو بہ کرنے سے ہوگی۔ ایک اور حدیث میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ نبی ﷺ کی خدمت میں کچھ قیدی گرفتار ہو کر آئے۔ ان میں ایک عورت بھی تھی جس کا شیر خوار بچہ چھڑ گیا تھا۔ وہ ماما کی مادی ایسی بے یمن تھی کہ جس بچے کو پالیتی اسے چھاتی سے چٹا کر دودھ پلانے لگتی تھی، نبی ﷺ نے اس کا حال دیکھ کر ہم لوگوں سے پوچھا، کیا تم لوگ یہ توقع کر سکتے ہو کہ یہ ماں اپنے بچے کو خود اپنے ہاتھوں سے آگ میں پھینک دے گی؟ ہم نے کہا، ہرگز نہیں خود پھینکا تو کیا اگر بچہ خود گرتا ہو تو وہ اپنی حد تک اسے بچانے کے لیے اپنی جان کی بازی لگا دے گی۔ حضور ﷺ نے فرمایا، اللہ کا رحم اپنے بندوں پر اس سے بہت زیادہ ہے جو یہ عورت اپنے بچے کے لیے رکھتی ہے۔

یہ اللہ تعالیٰ کی شان رحیمی ہے کہ اس کے بندے بار بار گناہ کرتے ہیں اور

بار بار توبہ کرتے ہیں لیکن وہ ان کی لغزشوں سے ہر بار دو گزر کر کے ان کی توبہ قبول کر لیتا ہے کیونکہ اس کو اپنی مخلوق سے بے انتہا محبت ہے اور اس کی رحمت کی بھی کوئی حد نہیں فی الحقیقت اللہ تعالیٰ کی رحمت اس قدر وسیع ہے کہ اس کو احاطہ بیان میں لانا ناممکن ہے اسی لیے اس ذات رحیم و کریم نے ارشاد فرمایا ہے:

لَا تَقْنَطُوا مِنْ رَحْمَةِ اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا ۚ إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ (الزمر آیت: ۵۳)

یعنی اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو جاؤ، یقیناً اللہ سارے گناہ معاف کر دیتا ہے وہ تو غفور الرحیم ہے۔

یہاں یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ صرف اہل ایمان کی توبہ قبول کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اگر کوئی غیر مسلم کفر و شرک سے تائب ہو کر اسلام قبول کر لے تو اس کی توبہ قبول نہ ہوگی۔ عہد رسالت میں بے شمار ایسے واقعات ملتے ہیں کہ جو لوگ زمانہ جاہلیت میں نہایت گمراہی نے جراثیم (ڈاکا زنی، دختر کشی، قتل و غارت و غیرہ) کے مرتکب ہوئے تھے انہوں نے جب اسلام قبول کیا تو محبت عالم کو کھیلنے لگے ان کو کھیلے لفظوں میں بشارت دی کہ اسلام سے پہلے کے ان کے تمام گناہ اللہ تعالیٰ نے معاف کر دیے۔ گویا رحمت الہی کی وسعت ان لوگوں پر بھی محیط ہے جو کفر و شرک ترک کر کے دین حق قبول کرتے ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ ہم سب کو تمام صغیرہ اور کبیرہ گناہوں سے بچے اور ان سے توبہ کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

## خیر و شر میں امتیاز

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر جو بے حساب اور بے شمار احسانات فرمائے ہیں، ان میں سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے انسانوں کو خیر اور شر میں تمیز کرنے کے لیے عقل عطا فرمائی ہے۔ خیر اور شر دونوں بڑے وسیع المعانی الفاظ ہیں خیر کا مطلب ہے نیک، بھلائی، اچھائی، انہن، سلامتی، بہتر اور شر کے لغوی معنی ہیں، کفر، شرک، بدی، گناہ، ظلم، شرارت، فساد اور فتنہ انگیزی۔ شر کا لفظ ان اسباب کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے جو نقصان، تکلیف ضرر اور دکھ کا باعث ہوتے ہیں مثلاً بیماری، بھوک، کسی حادثے یا لڑائی میں زخمی ہونا، آگ سے جل جانا، سانپ بچھو وغیرہ کسی زہریلے کینڑے سے ڈسا جانا، اولاد یا کسی دوسرے عزیز کی موت کے غم میں مبتلا ہونا۔ ہوں تو اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو ہر قسم کے شر سے پناہ مانگنے کی تلقین فرمائی ہے لیکن جس شر کو خصوصی طور پر خیر سے تمیز کیا جاتا ہے وہ افعال شر ہیں یعنی کفر، شرک، بدی، گناہ، ظلم، فساد اور فتنہ انگیزی۔ قرآن حکیم ہمیں بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام یا انسان اول کی تخلیق کے ساتھ خیر اور شر کی تخلیق بھی کر دی، اس کو خیر اور شر کا انتہام بھی بتا دیا اور یہ اختیار بھی دے دیا کہ وہ اپنی عقل کی مدد سے خیر و شر اور صحیح و غلط میں امتیاز کرے اور ان میں سے جس پر چاہے عمل کرے۔ خیر اور شر ایک دوسرے کی ضد ہیں اس لئے روزِ آخر غش ہی سے ان میں کھٹکھٹ شروع ہوگئی جو آج تک جاری ہے اور قیامت تک جاری رہے گی۔ حکیم فائز علامہ اقبال کا یہ شعر اسی کھٹکھٹ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

تمیزہ کار رہا ہے آزل سے تا ابزود

چراغِ مصطفویٰ سے شرابِ یونہی

اس شعر میں چراغِ مصطفویٰ سے مراد خیر اور شرابِ یونہی سے مراد شر ہے۔

اسلامی طور پر ہم خیر کو اسلام یا معروف یعنی اعمال نیک اور شر کو کفر و شرک یا منکر یعنی اعمال بد بھی کہہ سکتے ہیں۔ حضرت آدم پہلے انسان اور پہلے مسلمان یا صاحب خیر تھے جن کو سب سے پہلے ابلیس کے شر سے واسطہ پڑا جو ہوا سو ہوا، پھر آدم علیہ السلام یعنی مسلم الاول نے اپنی اولاد کو بھی اسلام کی تعلیم دی۔ پہلے تو ساری اولاد نے اس تعلیم پر عمل کیا پھر ان میں ایسے لوگ پیدا ہو گئے جنہوں نے اسلام کی تعلیم بھلا ڈالی، کسی نے پتھروں، درختوں، سانپوں، سورج اور چاندی ستاروں کو اپنا معبود بنالیا، کوئی خود خدا ہی بیٹھا اور کسی نے کہا کہ میں آزاد ہوں جو میری مرضی ہوگی وہی کروں گا چاہے اللہ کا حکم کچھ بھی ہو۔ اس طرح دنیا میں کفر و شرک کے شر کا آغاز ہو گیا۔ جب یہ شر پہنچنے لگا تو اللہ تعالیٰ نے ہر ملک ہر علاقے اور ہر قوم کی طرف اپنے نبی اور رسول بھیجے کہ وہ گمراہ ہوئے لوگوں کو سمجھائیں اور انہیں راہ حق پر لانے کی کوشش کریں یہ سلسلہ ہزار ہا سال تک چلتا رہا یہاں تک کہ آخر میں ہمارے رسول کریم ﷺ خاتم الانبیاء و المرسلین اور رحمۃ اللعالمین بن کر اس دنیا میں تشریف لائے آپ کسی خاص علاقے یا قوم کے لئے نہیں بلکہ روئے زمین کے تمام انسانوں کی ہدایت کے لئے مبعوث ہوئے جیسا کہ قرآن حکیم میں ارشاد ہوا ہے:

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا خَلَاةً لِلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ

(سوفہ صبا: آیت ۲۸)

یعنی اے نبی ہم نے آپ کو روئے زمین کے تمام انسانوں کے لئے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے دین اسلام کو آپ پر نازل کر دیا قرآن پاک اللہ کی آخری کتاب ہے جو آپ پر نازل ہوئی آپ کی شریعت آخری شریعت ہے اور آپ اللہ کے آخری نبی اور رسول ہیں۔ بلاشبہ دوسرے انبیاء اور رسول بھی اسلام ہی کے پیغامبر تھے اور وہ اپنی قوموں کو خیر ہی کی طرف بلاتے اور شر سے بچنے کی تلقین کرتے تھے لیکن قرآن حکیم اور حامل قرآن ﷺ نے جس وضاحت کے

ساتھ خیر اور شر کے درمیان حد فاصل کبھی پہلی کسی شریعت میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ آج کل یہ کے بیشتر افراد بڑی حد تک خیر اور شر کے فرق کو ضرور جانتے ہیں مثلاً انہیں معلوم ہے کہ نماز روزہ اور دوسری عبادات، صدق و پانیت، سخاوت و ایثار، صبر و شکر، خدمتِ خلق، عبادت و تعزیت، حلم و تحمل، صلہ و رحمی، اطاعت والدین، بزرگوں کا ادب، مسایوں سے حسن سلوک، اکرام ضیف وغیرہ اعمال خیر ہیں اور تکبر، حسد، شرک، غیبت، چوری، بد عہدی، دروٹگوئی، نشہ بازی، قتل و فساد، ناپ تول میں کمی، اسراف، خیانت، والدین کی نافرمانی، حرام خوری، وغیرہ اعمال شر ہیں۔ سورۃ البندہ میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

اَلَمْ نَخْلُقْ لَهُ غَنِيْنًا ۚ وَ لِسٰنًا وَ شَفِيْطِيْنًا ۚ وَ هٰذِيْنَةُ التَّجْدِيْنِ ۝

(آیات ۸-۹-۱۰)

یعنی کیا ہم نے انسان کو دو آنکھیں۔ اور ایک زبان اور دو ہونٹ نہیں دیے۔ اور تنگی اور ہڈی کے دونوں نمایاں راستے اس کو نہیں دکھا دیے۔

مطلب یہ کہ کیا ہم نے انسان کو علم اور عقل کے ذرائع نہیں دیے جن سے وہ خیر اور شر میں تمیز کرے۔ دو آنکھوں سے مراد گائے بھینس کی آنکھیں نہیں بلکہ وہ انسانی آنکھیں جنہیں کھول کر آدمی دیکھے تو اسے ہر طرف وہ نشانات نظر آئیں جو تنگی اور ہڈی کا فرق سمجھاتے ہیں۔ زبان اور ہونٹوں سے مراد محض بولنے کے آلات نہیں بلکہ نفسِ باطلہ ہے جو ان کی پشت پر سوچنے دیکھنے کا کام کرتا ہے اور پھر ان سے اظہارِ مافی الضمیر کا کام لیتا ہے۔ اور ہم نے انسان کو عقل و فکر کی طاقتیں عطا کر کے اسے چھوڑ نہیں دیا کہ اپنا راستہ خود تلاش کرے بلکہ اس کی رہنمائی بھی کی اور اس کے سامنے بھلائی اور برائی، خیر اور شر دونوں کے راستے نمایاں کر کے رکھ دیے تاکہ وہ خوب سوچ سمجھ کر ان میں سے جس کو چاہے اپنی فتنہ داری پر اختیار کرے۔ اب اللہ جل شانہ کی شانِ کرم دیکھیے کہ اس نے خیر اور شر میں تمیز کرنے کے لئے قوتِ احساس بھی عطا کر دی یعنی انسان (بالخصوص



ایک مسلمان) کا ضمیر نیک کام کر کے راحت محسوس کرتا ہے اور بدی کا کام کر کے آزرده ہوتا ہے۔ پھر اس نے اہل ایمان کو یہ بھی بتا دیا کہ ہر نیکی کا اجر دس گنا اور ہر بدی کا بدلہ اسی کے برابر دیا جائے گا جیسا کہ سورۃ الأنعام میں ارشاد ہوا ہے:

مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ أَثْقَالٍهَا وَمَنْ جَاءَ بِالسَّيِّئَةِ  
فَلَا يُجْزَى إِلَّا بِمِثْلِهَا وَهُمْ لَا يَظْلَمُونَ ۝ (آیہ - ۱۶۰)

یعنی جو اللہ کے حضور نیکی لے کر آئے گا اس کے لیے دس گنا اجر ہے اور جو بدی لے کر آئے گا اس کو اتنا ہی بدلہ دیا جائے گا جتنا اس نے تصور کیا ہے اور کسی پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

دعا ہے اللہ تعالیٰ ہمیں شر سے بچائے خیر کا راستہ اختیار کرنے کی توفیق دے اور اپنے نیک بندوں کے ساتھ ہمارا خاتمہ کرے۔ آمین ثم آمین۔

رَبَّنَا فَاعْفُ رْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّئَاتِنَا وَتَوَقَّ لْنَا مَعَ الْآبِرَارِ

## اسلامی معاشرہ میں فرد کے فرائض نیکی کی ترویج

دین اسلام محض عقائد و عبادات کے مجموعے کا نام نہیں بلکہ یہ ایک مکمل اور جامع نظام حیات ہے۔ اس میں انسانی زندگی کے ہر پہلو اور ہر رخ کے لیے ابدی ہدایات اور احکام موجود ہیں، جو ایک مسلمان کی دنیاوی اور اخروی زندگی کے تمام دائروں اور گوشوں پر حاوی ہیں۔ ان کی روشنی میں جو معاشرہ تشکیل پاتا ہے اسے حسن کردار کی مظہر اقدار دیت اور اجتماعیت کا نہایت حسین احتجاج کہا جاسکتا ہے۔ اسلام جہاں معاشرے کے ہر فرد کے حقوق و فرائض حتمی کرتا ہے وہاں وہ مسلمانوں سے یہ مطالبہ بھی کرتا ہے کہ تم میں ہمیشہ ایک ایسی جماعت بنی جائے جو لوگوں کو نیکی کی طرف بلائے، انہیں اچھے کاموں پر لگائے اور برائی سے روکے۔ ظاہر ہے کہ جماعت اخروی سے تشکیل پاتی ہے۔ اس لیے بنیادی طور پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ فردی پر عائد ہوتا ہے، گویا ہر فرد ہے منہج کے مقدر کا ستارہ۔

اسلام ”نیک جو اور نیکی پھیلاؤ“ کا علمبردار ہے۔ اس لیے کوئی شخص اس وقت تک سچا مسلمان نہیں کہلا سکتا جب تک وہ ان چار صفات کا حامل نہ ہو جو اللہ تعالیٰ نے دنیا اور آخرت میں انسان کی کامیابی کے لیے ضروری قرار دی ہیں۔ یہ صفات ہیں ایمان، اعمال صالح، دوسروں کو حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کرنا۔ قرآن حکیم کی سورۃ العصر میں اللہ تعالیٰ نے زمانے کی قسم کھا کر کہا ہے کہ ان صفات سے نبی دامن شخص ہمیشہ غمناک نہیں رہے گا۔ غمناک فلاح کی ضد ہے اس لیے فرمان الہی کا صاف مطلب یہ ہے کہ ایسا انسان دنیا اور آخرت میں ناکام و نامراد رہے گا۔ یہاں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ قرآن حکیم کا تصور فلاح محض دنیوی خوشحالی کا نام نہیں ہے بلکہ یہ دنیا سے لے کر آخرت تک انسان کی حقیقی کامیابی پر حاوی ہے اور یہ حقیقی کامیابی اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کا حاصل ہوتا ہے۔ اگر ان صفات پر الگ الگ غور کریں

تو مظلوم ہو گا کہ یہ اسلامی معاشرے کے ہر فرد کے ہر پہلو کی داخلی نگران اور خارجی معیار ہیں، خلوت ہو یا خلوت، گھر ہو یا میدان، تجارت ہو یا سیاست، امن ہو یا جنگ، تنگ دستی ہو یا آسودہ حالی، سفر ہو یا قیام، ہر حالت میں یہ صفات انسان کو راہِ راست پر رکھیں گی۔

سب سے پہلی صفت ایمان ہے۔ ایمان لانے کا مطلب ہے اللہ و خدا لا آخر یک داس کے عقیدوں، ملائکہ، کتب الہیہ اور آخرت کو ماننا۔۔۔ یہ ایمان ہی ہے جو اخلاق اور سیرت و کردار کے لیے ایک مضبوط بنیاد فراہم کرتا ہے جس پر ایک پاکیزہ زندگی کی عمارت قائم ہو سکتی ہے۔ ورنہ جہاں سرے سے ایمان ہی نہ ہو وہاں انسان کی زندگی بظاہر کتنی ہی خوشنما کیوں نہ ہو اس کی حیثیت ایک ایسے جہاز کی ہے جس کا کوئی ٹنکر نہ ہو اور جو موجوں کے تھیمڑوں کے ساتھ بہتا چلا جائے۔ یوم آخرت پر عقیدہ دل میں اللہ کا خوف پیدا کرتا ہے یہی ایمان کی روح ہے۔

دوسری صفت نیک کاموں پر عمل کرنا ہے۔ نیک کاموں کی تعریف یہ ہے کہ اللہ اور رسولؐ نے جن کاموں کے کرنے کا حکم دیا ہے وہ کیے جائیں اور جن کاموں سے منع کیا ہے ان سے باز رہا جائے۔ اعمالِ صالح یا نیک کاموں میں سے چند کے عنوانات یہ ہیں: کچ بولنا، عہد کا پورا کرنا، بڑوسیوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا، نرمی سے بات کرنا، غمخوور گزر کرنا، اللہ کی راہ میں خرچ کرنا، والدین کی خدمت کرنا، صلہ رحمی، مہمان نوازی، امانت داری، تواضع اور انکسار، بڑوں کا ادب کرنا، چھوٹوں پر شفقت، بچی گواہی دینا، عدلی کرنا، رحم و کرم کرنا، اخلاص کے ساتھ اللہ کی عبادت کرنا، مخلوقِ خدا کی بے غرض خدمت کرنا جن کاموں سے اللہ تعالیٰ نے منع کیا ہے اللہ کی رضا کے لیے ان سے رک جانا بھی نیکی ہے۔ ایسے کاموں میں سے چند کے عنوانات یہ ہیں:

بد عہدی، بخل، قطع رحمی، ظلم، چوری، بے حیائی، بد چلنی، سود و غری، ہتکمر، نصیب، قتل و سار، قتل ناحق، دیا کا دری، سرشمت دینا اور لینا، خیانت، بدگمانی، دروغ گوئی،

ہاں قول میں کمی بخت، خوشامد، مسخر، فضول خرچی، جوئے بازی، شراب خواری  
ہاں نفس انسانی۔

نیکی کی ترویج کے لیے محسن انسانیت ہادی برحق ﷺ کے چند ارشادات  
ملاحظہ فرمائیے:

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا  
کہ قسم اُس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، کوئی بندہ سچا مومن  
نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ مسلمان بھائی کے لیے وہی نہ چاہے جو اپنے لیے چاہتا  
ہے۔ (صحیحین)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے  
فرمایا کہ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے نہ تو خود اس پر ظلم و زیادتی کرے نہ  
دوسروں کا نشانہ ظلم بننے کے لیے اس کو بے مدد چھوڑے۔ اور جو کوئی اپنے ضرورت  
مند بھائی کی حاجت پوری کرے گا اللہ تعالیٰ اس کی حاجت روائی کرے گا اور جو کسی  
مسلمان کو کسی تکلیف اور مصیبت سے نجات دلائے گا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کو  
مصیبت اور پریشانی سے نجات عطا فرمائے گا اور جو کسی مسلمان کی پردہ داری کرے گا  
اللہ تعالیٰ قیامت سے دن اس کی پردہ داری کرے گا۔ (صحیحین)

حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ  
ﷺ نے ارشاد فرمایا: اس شخص پر اللہ کی رحمت نہ ہوگی جو اس کے پیدا کیے ہوئے  
انسانوں پر رحم نہ کھائے گا اور ان کے ساتھ ترخم کا معاملہ نہ کرے گا۔ (صحیحین)

حضرت انس اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ  
رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ساری مخلوق اللہ تعالیٰ کی میال (گو یا اس کا کبہ)  
ہے اس لیے اللہ کو زیادہ محبوب اپنی مخلوق میں وہ آدمی ہے جو اللہ کی میال (یعنی اس کی  
مخلوق) کے ساتھ احسان اور اچھا سلوک کرے۔ (شعب الایمان، مشکوٰۃ)

خود فرمائیے کہ اگر ہم میں سے ہر فرد رحمت عالم ﷺ کے ان ارشادات کو  
اپنی زندگی کا شعار بنالے تو سارا معاشرہ نیکی کی خوشبو سے کیوں نہ مہک اٹھے گا اور اس

میں خود بخود ہی باطل سوز اجتماعیت کیوں نہ پیدا ہو جائے گی۔ خسارے سے بچنے کے لیے تیسری اور چوتھی صفحہ قرآن نے یہ بتائی ہیں کہ ایمان لانے اور نیک عمل کرنے والے لوگ ایک دوسرے کو حق کی فصاحت اور صبر کی تلقین کریں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اول تو ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں کو فرد فرد بن کر نہیں رہنا چاہیے بلکہ ان کے باہمی ربط و ضبط سے ایک صالح معاشرہ وجود میں آنا چاہیے۔ دوسرے یہ کہ اس معاشرے کے ہر فرد پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اسے بگڑنے سے بچائے اور اس کے تمام افراد ایک دوسرے کو حق اور صبر کی تلقین کریں۔ حق کا لفظ باطل کی ضد ہے اور بالعموم یہ لفظ دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ایک صحیح اور سچی بات اور دوسرے وہ حق جس کا ادا کرنا انسان پر واجب ہو خواہ وہ اللہ کا حق ہو یا بندوں کا۔ چنانچہ ایک دوسرے کو حق کی فصاحت کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی معاشرے میں اگر حق کے خلاف کام کیے جا رہے ہوں تو خاموشی کے ساتھ اس کا تماشہ نہ دیکھیں بلکہ حق کی قوت کے ساتھ اس کا مقابلہ کریں۔ معاشرے کا ہر فرد نہ صرف خود حق کے تقاضے پورے کرے بلکہ دوسروں کو بھی اس طرف عمل کی تلقین کرے۔ یہ وہ چیز ہے جو معاشرے میں حق کی سر بلندی اور نیکی کی ترویج کی ضامن ہے اور اس کو اخلاقی انحطاط سے بچاتی ہے۔ بعض اوقات باطل اتنا طاقتور ہوتا ہے کہ اس کا مقابلہ کرنا سخت دشوار ہوتا ہے اور اس حیلے میں حق کے ظہور کے لیے پناہ مصائب و آلام سے دو چار ہو سکتے ہیں۔ ان کو یہ سب کچھ صبر و استقامت سے برداشت کرنا ہوگا۔ اسی لیے معاشرے کے تمام افراد کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایک دوسرے کی ہمت بندھاتے رہیں اور ان حالات کو صبر سے برداشت کرنے کی فصاحت کرتے رہیں۔ صبر کی تلقین کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ معاشرے کا کوئی فرد کسی مصیبت میں مبتلا ہو، کسی اذیت ناک بیماری کا شکار ہو جائے یا اس کا کوئی پیارا بھٹ کے لیے دارم مفاتحت دے جائے تو اس کو فصاحت کی جائے کہ صبر سے کام لے، جزع فزع نہ کرے اور اللہ کی رضا کے سامنے سر تسلیم خم کر دے۔ سچی و راستہ ہے جس پر چل کر اسلامی معاشرے کا کوئی فرد نیکی کی ترویج میں مدد و معاون ثابت ہو سکتا ہے۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ ہم میں سے ہر ایک کو نیک بننے اور نیکی پھیلانے کی توفیق دے۔ آمین

## اخلاصِ عمل

دائے کوئین رحمتِ دو عالم ﷺ کے ذریعے بنی نوع انسان کو اخلاقی خصلہ کی جو تعلیم و ہدایت ملی ہے اس کی روح رواں اخلاصِ عمل ہے۔ اخلاصِ عمل کا مطلب یہ ہے کہ ہر اچھا کام یا کسی کے ساتھ اچھا برتاؤ صرف اس لئے اور اس نیت سے کیا جائے کہ ہمارا خالق اور پروردگار ہم سے راضی ہو ہم پر برکت اور رحمت نازل فرمائے اور ہم کو اپنے غضب اور ناراضی سے محفوظ فرمائے۔ کوئی بھی نیک کام صدقِ دل اور حسنِ نیت سے کیا جائے وہ اگرچہ دیکھنے میں کتنا ہی معمولی کیوں نہ ہو مگر فی الحقیقت وہ ایسا جہتِ ہوتا ہے جس کے ایک دانہ سے بھی تو بار آور درخت پھوٹ نکلتا ہے اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اس ایک دانے سے کئی کئی پودے نکلتے ہیں جن میں سے ہر ایک میں کئی کئی خوشے اور ہر خوشے میں اُن کثرتِ دانے ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس وہ نیک کام جس کی بنیاد اخلاص پر نہ ہو اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی نے پتھر پر حج رکھ دیا ہو اور اس امید پر تکیہ لگا بیٹھا کہ اس سے پودا پھوٹے گا جس میں پھل آئے گا یہ فریبِ عمل ہے۔ اور اس پر ایسی امید لگانا قطعاً بیکار ہے۔ قرآن حکیم اور ارشادِ اسوِ نبوی میں اخلاصِ عمل پر بے انتہا زور دیا گیا ہے اور ہمیں بتایا گیا ہے کہ جس کام میں اخلاص نہ ہو اور وہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے بجائے محض دکھاوے کے لئے کیا جائے کہ لوگ داد و داکریں وہ خواہ کتنا اچھا ہو بارگاہِ الہی میں ہرگز مقبول نہ ہوگا۔ مقبول ہونا تو ایک طرف یہ آخرت میں رسوائی اور عذاب کا موجب ہوگا کیونکہ مخلوق کے دکھاوے اور دنیا میں شہرت اور ناموسوری کے لیے کوئی نیک کام کرنا ایمان و توحید کے منافی اور ایک قسم کا شرک ہے۔

مسند احمد میں حضرت شداد بن اوس انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت

ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا، آپؐ فرماتے تھے جس نے دکھاوے کے لیے نماز پڑھی اس نے شرک کیا اور جس نے دکھاوے کیلئے صدقہ و خیرات کیا اس نے شرک کیا۔ اس حدیث پاک سے معلوم ہوا کہ کوئی اچھے سے اچھا عمل بھی اخلاص سے خالی ہو اور اس کا مقصد رضائے الٰہی نہ ہو بلکہ نام و نمود یا کوئی اور ایسا ہی جذبہ۔ اس کام کا خیرک ہو تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں بلکہ اسے ایک قسم کا شرک سمجھا جائے گا۔ حقیقی شرک تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات یا اس کے افعال اور اس کے خاص حقوق میں کسی دوسرے کو شریک کیا جائے یا اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت کی جائے۔

یہی شرک حقیقی یا شرک اکبر ہے جس کے بارے میں قرآن حکیم میں واضح طور پر فرمایا گیا ہے کہ اس کا کرنے والا ہرگز ہرگز نہیں بخشا جائے گا لیکن بعض اعمال ایسے ہیں جو اگرچہ اس معنی میں شرک نہیں ہیں لیکن ان میں شرک کا تھوڑا بہت شائبہ ضرور ہے ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کوئی شخص اللہ کی عبادت یا کوئی اور نیک کام اللہ کی خوشنودی کے بجائے اس غرض سے کرے کہ لوگ اس کو عبادت گزار اور نیکو کار سمجھیں، اسی کو ”رِیاء“ کہا جاتا ہے یہ اگرچہ حقیقی شرک نہیں ہے لیکن اس میں شرک کا شائبہ ضرور ہوتا ہے اور یہ ایک قسم کا نفاق اور سخت درجہ کا گناہ ہے۔ ایک حدیث میں اس کو شرک اصغر کہا گیا ہے۔ جیسا کہ مسند احمد میں حضرت محمود بن لبید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، مجھے تمہارے بارے میں سب سے زیادہ خطرہ شرک اصغر کا ہے بعض صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ! شرک اصغر کا کیا مطلب ہے؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا ”رِیاء“ یعنی کوئی کام لوگوں کے دکھاوے کیلئے کرنا۔

دوسری طرف اخلاص کی یہ اہمیت ہے کہ اگر کوئی شخص محض اللہ کی رضا جوئی کے لیے کسی نیک کام کی نیت کرے لیکن یہ کام انجام دینے سے پہلے ہی اس کو موت آجائے تو اللہ تعالیٰ اس کو نیک کام کا پورا اجر و ثواب دے گا۔ کیونکہ وہ

دلوں اور نیچوں کا حال خوب جانتا ہے۔

چنانچہ سرور عالم ﷺ کا ارشاد ہے۔ اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ .

”یعنی (سب انسانی) اعمال کا دار و مدار نیچوں پر ہے۔“

اگر ایک شخص میں بظاہر ایمان بھی ہے اور اس کے اعمال بھی اچھے ہیں لیکن بد قسمتی سے یہ اعمال صالح اخلاص سے خالی ہیں (یعنی ان اعمال سے اس کا مقصد اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی نہیں بلکہ اپنے آپ کو نیک اور پرہیزگار کہلوانا ہے) تو خدا اس کا ایمان اس کو کوئی فائدہ دے گا اور اس کے ان نیک کاموں کا کوئی اجر ملے گا لہذا اس کو رہا کاری کی سزا ملے گی۔ جو لوگ اچھے اعمال و اخلاق کا مظاہرہ دنیا والوں کی داد و تحسین اور شہرت طلبی کے لیے کرتے ہیں، یمن ممکن ہے ان کو دنیا میں یہ مقصد حاصل ہو جائے لیکن وہ اللہ کی رضا اور رحمت سے محروم رہیں گے اور انکی اس محرومی کا پورا غلہ وراثت میں ہو گا۔ گویا ایک مسلمان کی سیرت اور کردار کی صحیح خطوط پر تشکیل صرف اسی صورت میں ممکن ہو سکتی ہے جب اس کے تمام کاموں میں اخلاص کا ر فرمایا ہو۔ ان کاموں میں مہادت بھی شامل ہے اور خدمت غلط بھی، یا ہی میل جول بھی شامل ہے اور صلہ رحمی بھی، عیادت اور تعزیت بھی شامل ہے اور مہمانوں کی نگریم اور خدمت بھی۔

رسول اکرم ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ اسی عمل کو قبول کرتا ہے جو خاص اسی کے لیے ہو اور صرف اسی کی خوشنودی اس سے مطلوب ہو، وہ خالق و مالک تمہاری صورتوں اور مالوں کو نہیں، بلکہ تمہارے دلوں اور کاموں کو دیکھتا ہے۔ اسلام میں اخلاص عمل کو جو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے اس کا اندازہ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی صحیح مسلم کی اس حدیث سے کیا جاسکتا ہے جس میں وارد ہوا ہے کہ قیامت کے دن سب سے پہلے تین شخصوں کے متعلق خدا تعالیٰ سے جہنم کا فیصلہ سنایا جائے گا۔ سب سے پہلے ایک ایسا شخص اللہ



کے سامنے پیش کیا جائے گا جو بظاہر جہاد میں شہید ہوا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ پہلے اپنی نعمتیں اس کو بتائے گا اور پھر اس سے پوچھے گا کہ بتاؤ تو نے ان نعمتوں کا کیا حق ادا کیا اور کیا عمل کیے؟ وہ کہے گا خداوند! میں نے حیري راہ میں جہاد کیا اور اپنی جان عزیز حیري خاطر قربان کی۔ حق تعالیٰ فرمائے گا تو جھوٹ بولتا ہے تو نے صرف اس لئے جہاد کیا تھا کہ تو بہادر مشہور ہو جائے۔ سو دنیا میں حیري بہادری کا چرچا ہو چکا۔ پھر اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس کو اوندھے منہ جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔

اس کے بعد ایک عالم دین و قرآن کی پیشی ہوگی۔ اللہ تعالیٰ اس کو بھی اپنی بخشی ہوئی نعمتیں بتائے گا وہ سب کا اقرار کرے گا۔ پھر حق تعالیٰ اس سے پوچھے گا کہ تو نے میری نعمتوں کا کیا حق ادا کیا اور کیا عمل کیے؟ وہ عرض کرے گا یا اللہ میں نے حیري کتاب کے علم کو پڑھا اور دوسروں کو پڑھایا اور حیري رضا کے لئے حیري کتاب قرآن میں مشغول رہا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا تو جھوٹ بولتا ہے تو نے تو عالم، قاری اور عابد کہلانے کے لئے یہ سب کچھ کیا تھا سو دنیا میں تیرے عالم، عابد اور قارئی قرآن ہونے کا چرچا ہو چکا۔ پھر تکلم خدا اسے بھی جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔

اس کے بعد تیسرا شخص پیش کیا جائے گا جس کو اللہ نے دنیا میں بھرپور دولت دی ہوگی۔

اللہ تعالیٰ اس کو بھی اپنی نعمتیں بتائے گا۔ پھر پوچھے گا تو نے اس مال و دولت سے کیا کام لیا؟ وہ عرض کرے گا۔ الہی جس جس راستے میں اور جن جن کاموں میں خرچ کرنا تجھے پسند ہے میں نے تو حیرادیا ہوا مال ان سب ہی میں حیري رضا جوئی کے لئے خرچ کیا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا تو جھوٹ بولتا ہے تو نے تو صرف اس لئے مال خرچ کیا تھا کہ دنیا تجھ کو ملے کہ، سو دنیا میں حیري سخاوت کا چرچا خوب ہوا۔ پھر اس کو بھی اوندھے منہ جہنم میں ڈال دیا جائیگا۔

بعض لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ اگر وہ کوئی بُرا کام اچھی نیت سے کریں گے تو ان کا یہ بُرا کام عملِ صالح میں شمار ہوگا جس کا ان کو اجر ملے گا۔ مثلاً کوئی آدمی اس نیت سے چوری کرتا ہے کہ جو مال اس سے حاصل ہوگا اس سے وہ غریبوں اور محتاجوں کی مدد کرے گا، ایسے لوگوں کو جان لینا چاہیے کہ جو کام فی نفسہ بُرے ہیں اور جن سے اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ نے منع فرمایا ہے ان میں خُسنِ نیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا وہ تو بہر صورت فسق اور غضبِ الہی کا موجب ہیں۔

ایک مومن کا شعار زندگی یوں بیان کیا گیا ہے۔

إِنْ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَنْعَتِيْ لِّلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ۝

(الانعام۔ آیہ ۱۶۴)

”یعنی میری نماز، میرے تمام مراسمِ عبودیت، میرا بچنا اور میرا مرنا سب اللہ رب العالمین کے لیے ہے۔“

گویا ایک سچے مسلمان کا ہر کام رضائے الہی کے حصول کے لیے ہوتا ہے۔ اس کا اٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا، جاگنا سونا، ہنسنا رونا، کھانا پینا، رزقِ حلال کمانے کے لیے جگ و دو کرنا، مخلوق کی خدمت کرنا وغیرہ اور اس کے سوا تمام مراسمِ عبودیت نماز، روزہ، زکوٰۃ، قربانی، غرض اس کا بچنا مرنا سب اللہ ہی کے لیے ہوتا ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اخلاصِ عمل کی توفیق عطا فرمائے اور ہم ہر نیک کام اس لیے کریں کہ ہمارا خالق و مالک ہم سے راضی ہو، ہم پر اپنی رحمت فرمائے اور اس کی ناراضی اور غضب سے ہم محفوظ رہیں۔ آمین ثم آمین

# اسلامی ریاست میں جان، مال اور آبرو

## کے تحفظ کی ضمانت

اسلام دینی فطرت اور مکمل ضابطہ حیات ہے۔ یہ جس طرح زندگی کے تمام شعبوں میں نئی نوع انسان کی رہنمائی کرتا ہے اسی طرح وہ اسلامی ریاست کے دینی، سیاسی و فکری نظام کے اصول و ضوابط بھی صراحت کے ساتھ متعین کرتا ہے۔ اس نظام میں اصل مطاع اللہ تعالیٰ ہے اور باقی سب کچھ اُس کے بعد ہے۔ مسلمان کی انفرادی زندگی اور مسلمانوں کا اجتماعی نظام دونوں کا مرکز و محور اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری اور طاعت ہے۔ اسلامی نظام کی دوسری بنیاد رسولؐ کی اطاعت ہے۔ کیونکہ رسولؐ ہی کے ذریعے ہم تک اللہ کی اطاعت کے احکام و فرائض پہنچے ہیں پس رسولؐ کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہی کی عملی صورت ہے مختصر یہ کہ اسلامی نظام میں اللہ کا قلم اور رسولؐ کا طریقہ بنیادی قانون اور آخری سند (Final Authority) کی حیثیت رکھتا ہے۔ گویا تمام مسائل زندگی میں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کو سند مرجع اور حرف آخر تسلیم کرنا، اسلامی ریاست کی وہ لازمی خصوصیت ہے جو اسے دوسری ریاستوں سے تمیز کرتی ہے۔ قرآن و سنت کی روشنی میں اسلامی ریاست کی عمارت میں جو چیز بنیادی اینٹ کا درجہ رکھتی ہے وہ احترام انسانیت ہے۔ اسی سے امن و سلامتی، صلح و آشتی، اخوت و مساوات، اتحاد و اتفاق، عدل و انصاف اور رواداری کے سوتے پھونچے ہیں اور ریاست کے ہر فرد کو جان مال اور آبرو کے تحفظ کی ضمانت ملتی ہے۔ رحمت عالم ﷺ کی بخشش سے پہلے احترام انسانیت نام کی کسی چیز کا وجود نہ تھا انسان کی قدر و قیمت منکفی اور تحقر کے برابر بھی نہ تھی۔ ایک انسان کی ادنیٰ خواہش پر ہزاروں جانیں قربان کر دی جاتی تھیں، جنوں کے استخوانوں پر انسانی خون اور گوشت کے حلاوے

جہ جاتے تھے۔

سرور عالم ﷺ نے بنی نوع آدم تک یہ ارشاد خداوندی مانجھایا:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا بَنِي آدَمَ وَخَلَقْنَاهُمْ مِنْ نَارٍ وَالتَّيْرَ وَالْبَحْرَ وَزَوَّجْنَاهُمْ مِنَ الْعُثْيِ  
وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ مِمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا (بنی اسرائیل: ۷۰)

”یعنی یہ ہمارا کرم ہے کہ ہم نے بنی آدم کو بزرگی دی اور انہیں انگی اور تری میں  
سواریاں دیں اور ان کو پائیزہ چیزوں سے رزاق دیا اور اپنی بہت سی مخلوقات پر نمایاں  
فوقیت بخشی۔“

آپ ﷺ نے لوگوں کو بتایا کہ خالق کائنات نے انسان کو اپنا خلیفہ ٹھہرایا  
ہے اور انسان کائنات کا سب سے قابل احترام اور لائق محبت وجود ہے۔ اس کے  
ساتھ ہی آپ نے دنیا کو وحدت انسانیت کا مہتمم بالشان تصور دیا جس نے  
وحدت قومیت، عصیت اور انسانیت وغیرہ کے جوں کو پاش پاش کر دیا اور عالمگیر  
اسن و اشتی کی عمارت کے لیے بنیاد فراہم کر دی۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ارشاد فرمایا ہے:-

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاهُ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاهُمْ قُرُونًا  
وَلِقَاءَ لِقَاءٍ لِّتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاهُ (الحجرات آیت: ۱۳)

ترجمہ: ”لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہاری  
قومیں اور برادریاں بنادیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت تم میں سب سے  
عزت والا وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔“

رسول رحمت ﷺ نے حجۃ الوداع کے تاریخی ساز موقع پر اس ارشاد  
خداوندی کی توضیح یوں فرمائی:

”لوگو! تمہارا پروردگار ایک ہے اور تمہارا باپ بھی ایک ہے تم سب آدم کی  
اولاد ہو اور آدم سنی سے بنے تھے کسی عربی کو کسی گجی پر اور کسی گجی کو کسی عربی پر اور کسی  
گورے کو کسی کالے کو کسی گورے پر کوئی فضیلت نہیں ہے بجز تھوڑی کے، تم  
میں سے زیادہ عزت اور کرامت والا اللہ کے نزدیک وہی ہے جو اللہ سے ڈرنے والا

”ہے۔“

اس کے ساتھ ہی آپؐ نے ارشاد فرمایا:

”سارے مسلمان بھائی بھائی ہیں اور ہم سب ایک اُمت ہو تمہارے خون، مال اور عزتیں ایک دوسرے پر ہمیشہ کے لیے حرام کر دی گئی ہیں میرے بعد گمراہ نہ ہو جانا کہ آپس میں کشت و خون کرنے لگو۔“

اللہ اور رسولؐ کے ان ارشادات سے مدونہ روشن کی طرح عیاں ہے کہ اسلام ہر انسان کے لیے چند بنیادی حقوق مقرر کرتا ہے اور ہر حال میں ان کے احترام کا حکم دیتا ہے خواہ وہ انسان اسلامی ریاست کی کُھڑو میں رہتا ہو یا اس سے باہر، انسانی خون ہر حال میں محترم ہے اور حق کے بغیر یعنی قصاص یا فساد پھیلانے کے سوا کسی اور وجہ سے نہیں بہایا جاسکتا۔ سورۃ مائدہ میں ارشاد ہوا ہے:

مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا  
وَمَنْ أَحْيَاهَا فَكَأَنَّمَا أَحْيَا النَّاسَ جَمِيعًا (آیہ ۳۲)

”یعنی جس نے کسی انسان کو خون کے بدلے یا زمین میں فساد پھیلانے کے سوا کسی اور وجہ سے قتل کیا اس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کر دیا اور جس نے کسی کی جان بچائی اس نے گویا تمام انسانوں کی جان بچائی مطلب یہ ہے کہ جو شخص کسی کی ناحق جان لیتا ہے اس کا دل حیات انسانی کے احترام سے خالی ہے اور وہ پوری انسانیت کا دشمن ہے اس کے برعکس جو شخص کسی انسان کی زندگی بچاتا ہے وہ پوری انسانیت پر احسان کرتا ہے۔“

دوسروں کی جان لینا تو گناہ اسلام میں اپنی جان کو ختم کرنے سے بھی خفی کے ساتھ منع کیا گیا ہے یعنی خودکشی کو حرام قرار دیا گیا۔

اسلامی ریاست کی انتظامیہ اور عامۃ المسلمین کے لیے رجحانِ عالمِ <sup>میں</sup> کے یہ ارشادات بھی مشعلِ راہ ہیں۔

۱۔ مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور جس کے ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔  
(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

۲۔ اللہ کے بندو! ایک دوسرے کے بھائی بن جاؤ۔ مسلمان مسلمان کا بھائی ہے نہ اس پر ظلم کرے، نہ اس کی مدد کرنے سے گریز کرے اور نہ اس کو حقیر جانے۔ ہر چیز مسلمان کی مسلمان پر حرام کر دی گئی ہے اس کا خون، اس کا مال اور اس کی عزت (یعنی کسی مسلمان کو قتل کرنا یا اس کا مال غصب کرنا یا اس کی عزت و آبرو کے ورپے ہونا) (صحیح مسلم)

۳۔ خدا کی قسم تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنے مسلمان بھائی کے لیے وہی بات پسند نہ کرے جو وہ اپنے لیے کرتا ہے۔ (صحیحین)

۴۔ مسلمان اپنے مسلمان بھائی کا آئینہ ہے اور مومن مومن کا بھائی ہے اسے نقصان سے بچاتا ہے اور اس کے حقوق کی غائبانہ حفاظت کرتا ہے۔

(ابوداؤد و ترمذی)

۵۔ مسلمان مسلمان کا بھائی ہے اس پر ظلم کرے نہ اسے نقصان پہنچے دے، جو شخص اپنے مسلمان بھائی کی حاجت روائی کی کوشش کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کا حاجت روا بن جاتا ہے اور جو شخص کسی مسلمان کی مصیبت اور پریشانی دور کر دے اللہ تعالیٰ قیامت کے مصائب اور غموں میں سے اس کا کوئی بڑا غم دور کر دے گا۔ (صحیحین)

۶۔ مومن کا قتل اللہ کے نزدیک دنیا کے تہ و بالا ہونے سے بڑھ کر ہے۔

(نسائی)

۷۔ مسلمان کو گالی دینا گناہ ہے اور اسے قتل کرنا کفر ہے (صحیح بخاری)

۸۔ کوئی شخص اپنے مسلمان بھائی کی طرف ہتھیار سے اشارہ بھی نہ کرے۔

(صحیح مسلم)

ان احکام و ارشادات سے یہ نہ سمجھا جائے کہ اسلامی ریاست صرف مسلمانوں کی جان و مال اور آبرو کے تحفظ کی ضامن ہے۔ اسلام نے اسلامی ریاست کے غیر مسلموں کے لئے بھی واضح حقوق معین کیے ہیں۔ اسلامی اصطلاح میں ایسے غیر مسلموں کو ذمی کہا جاتا ہے یعنی وہ لوگ جن کی حفاظت کا اسلامی ریاست نے بطور

خاص ذمہ لیا ہے۔ ذہنی کی جان و مال اور آبرو بالکل مسلمان کی جان و مال اور آبرو کی طرح محترم ہے۔ فوجداری اور دہائی قوانین میں مسلم اور ذہنی کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ کوئی غیر مسلم حکومت اپنی مسلم رعایا پر جا ہے کتنے ہی ظلم توڑے ایک اسلامی ریاست کے لئے اس کے جواب میں اپنی غیر مسلم رعایا پر ذمہ داری زیادتی کرنا بھی جائز نہیں۔

حافظ ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں رسول اکرم ﷺ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ جس نے کسی معابد (ذہنی) کو قتل کیا وہ جنت کی لذت سے بھی محروم رہے گا۔

آنحضور ﷺ نے مدینہ منورہ کو مرکز بنا کر اسلامی ریاست کی تاسیس فرمائی تو ریاست کے تمام مسلم اور غیر مسلم باشندوں کو وہ تمام بنیادی حقوق عطا فرمائے جو قرآن نے متعین کیے ہیں مثلاً جان و مال، عزت و آبرو کا تحفظ، نجی زندگی کا تحفظ، مذہبی دل آزاری سے تحفظ، عبادت گاہوں کا تحفظ، عقیدہ کی آزادی کا تحفظ وغیرہ۔

صحیح بخاری میں حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ ایک دن ہمارے پاس سے ایک جنازہ گزرا۔ رسول اللہ ﷺ اس کو دیکھ کر کھڑے ہو گئے اور ہم لوگ بھی آپ کے اتباع میں کھڑے ہو گئے۔ پھر ہم نے عرض کیا، یا رسول اللہ! یہ تو ایک یہودی کی میت تھی آپ نے فرمایا، کیا وہ ایک فرد انسانی نہ تھا اس واقعہ سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کی رحمت عالم ﷺ کے نزدیک ایک انسان کی بلا لحاظ مذہب و عقیدہ کیا قدر قیمت تھی۔ آپؐ کا یہی اسوہ ایک اسلامی ریاست پر یہ فرض عائد کرتا ہے کہ وہ اپنے تمام باشندوں کی جان و مال اور آبرو کا تحفظ مسلم اور غیر مسلم کی تفریق کے بغیر کرے۔

## اسلام میں عدل کی اہمیت

صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ لوگ جو اپنے حکم میں اور اپنے گھر والوں میں اور ان لوگوں کے ساتھ جن کے وہ حاکم ہیں، عدل کرتے ہیں، قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے نزدیک نور کے منبروں پر بیٹھے ہوں گے۔

اس حدیث پاک میں دانائے کونین صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت طبع پورے میں عدل کی اہمیت واضح فرمائی ہے اور اُمت کو بتایا ہے کہ وہ لوگ جو اپنے تمام معاملات میں فیصلہ کرتے وقت یا کسی کو کوئی حکم دیتے وقت عدل سے کام لیتے ہیں اور اپنے اہل خانہ کے حقوق بھی انصاف سے پورے کرتے ہیں اور اگر وہ حاکم ہیں تو اپنی رعیت اور مائتوں کے ساتھ بھی عدل و انصاف کا برتاؤ کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ آخرت میں ان کو اتنا بلند مرتبہ عطا کرے گا کہ وہ حق تعالیٰ کے نزدیک نور کے منبروں پر بیٹھے ہوں گے۔

فی الحقیقت عدل و انصاف کسی بھی حکومت اور معاشرے کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسلام و سن فطرت ہونے کے اعتبار سے عدل و انصاف پر غیر معمولی زور دیتا ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں جا بجا عدل کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور اہل ایمان کو بتایا گیا ہے کہ اللہ عدل کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

سورۃ اللہ یہ کی جکیسویں آیت میں ارشاد ہوا ہے کہ ہم نے اپنے رسولوں کو روشن دلیلیں دے کر بھیجا اور اس کے ساتھ ہم نے اتاری کتاب اور میزان یعنی توازن عدل تاکہ لوگ عدل پر قائم ہوں۔۔۔ اس ارشاد ربانی سے یہ بات واضح ہے کہ رسولوں اور نبیوں کی بعثت کا ایک اہم مقصد یہ تھا کہ انسانی زندگی کا اخلاقی اور اجتماعی



دونوں طرح کا نظام عدل پر قائم ہو۔ انفرادی نظام عدل یہ ہے کہ انسان حقوق انفرادی حقوق العباد پر دے انصاف اور نیک نیتی کے ساتھ پورے کرے۔ ”عباد“ میں نہ صرف اس کے اہل خانہ بلکہ دوسرے رشتہ دار، پڑوسی، اہل محلہ یا اہل ہستی، غریب اور حاجت مند بھی شامل ہیں اور اجتماعی نظام عدل یہ ہے کہ معاشرے کی تشکیل ایسے اصولوں پر کی جائے جو ظلم و تعدی، جارحیت اور زیادتی کا راستہ روکیں۔ اجتماعی زندگی کے تمام پہلو افراط و تفریط سے خالی اور باہم متوازن ہوں اور معاشرے کے تمام طبقے انصاف کے ساتھ اپنے حقوق پائیں اور اپنے فرائض اخلاقیہ و عبادیہ کے ساتھ ادا کریں۔ معاشرے میں عدل و انصاف اور توازن وہم آہنگی ہی کا دوسرا نام اجتماعی یا سماجی عدل ہے جسے انگریزی میں سوشل جسٹس کہا جاتا ہے۔ عدل کی ایک قسم لیگل جسٹس یا عدول قانونی بھی ہے لیکن حقیقت میں یہ کوئی مقصود پالڈ اسٹ یا علامۂ عدم نہیں ہے بلکہ عدل کے حصول کا ایک ذریعہ ہے۔

اسلامی نقطہ نگاہ سے یہ طریقہ بھی نہایت سہل، فعال، تیز، مؤثر اور مساویانہ ہونا چاہیے۔ قرآن حکیم میں عدل کو تھکوی کی نزدیک ترین راہ بتایا گیا ہے۔ تھکوی سے مراد پرہیزگاری یا نفس کی وہ کیفیت ہے جو خوفِ خدا، احساسِ ذمہ داری اور آخرت کی جوابدہی کے احساس سے عبارت ہے۔ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم رحمۃ اللعالمین اور خاتم المرسلین ﷺ تھے۔ آپؐ نے عدل و انصاف کو جس معراج پر پہنچایا اور اس کے جو پیمانے قائم فرمائے ان کے نتیجے میں جو نظام برپا ہوا اس سے پوری کائنات پر رحمت کی گھنائیں اٹھ آئیں۔ تاریخِ عالم اس پر کتوں اور رحمتوں والے نظام کی مثال پیش کرنے سے عاجز ہے۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عدل اپنے بیگانے، دوست دشمن، مسلم غیر مسلم، امیر غریب سب کے لیے یکساں اور بلا امتیاز تھا۔ آپؐ فرمایا کرتے تھے کہ جو شخص لوگوں کو عصبیت کی دعوت دے وہ ہم میں سے نہیں۔ ایک مرتبہ حضرت واثلہ بن اسحاق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا، یا رسول اللہ! عصبیت کیا ہے؟ فرمایا، ظلم میں اپنی قوم کا

مددگار ہونا۔ سیرت طیبہ میں متعدد ایسے واقعات ملتے ہیں کہ آپؐ کے پاس کوئی مقدمہ لایا گیا جس میں ایک فریق مسلم تھا اور دوسرا غیر مسلم۔ آپؐ نے شہادتیں سننے کے بعد غیر مسلم کے حق میں فیصلہ صادر فرما دیا۔ صحیح بخاری میں ہے کہ فتح مکہ کے موقع پر قریش کے معزز قبیلے بنو مخزوم کی ایک خاتون فاطمہ بنت اسود سے چوری کی لغزش سرزد ہو گئی اور وہ پکڑی گئیں۔

چوری کی سزا قطع یہ تھی۔ بنو مخزوم کے لوگ گھبرائے ہوئے محبوب رسولؐ حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کے پاس گئے اور ان سے درخواست کی کہ وہ حضورؐ سے اس خاتون کے لیے رعایت کی سفارش کریں۔ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نے حضورؐ سے اس خاتون کے لیے رعایت کی سفارش کی تو آپؐ کے روئے انور پر غصہ کے آثار پیدا ہوئے اور آپؐ نے فرمایا، کیا تم مجھ سے اللہ کی قائم کی ہوئی حدود کے بارے میں گفتگو کرتے ہو؟ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ لرز اٹھے اور عرض کیا، یا رسول اللہ! میرے لیے اللہ سے مغفرت طلب فرمائیے۔

شام ہوئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے اور فرمایا، پہلے لوگ اس وجہ سے ہلاک ہوئے کہ جب ان میں کوئی معز یا امیر آدمی چوری کرتا تو اس کو چھوڑ دیتے اور جب ان کا کوئی کمزور یا غریب آدمی چوری کرتا تو اس پر حد قائم کرتے۔ قسم اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ اگر فاطمہ بنت محمد بھی چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ کاٹ دیتا۔ یہ تھی حضورؐ کی شانِ عدل۔

غزوہ خیبر کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک جاں نثار حضرت عبداللہ بن بکھل رضی اللہ عنہ سمجھوروں کی بھائی کے لیے خیبر گئے تو کسی نے انہیں وہاں شہید کر دیا۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کے چچا حضرت مخیمہؓ اور بھائی حضرت عبدالرحمنؓ نے حضورؐ کی خدمت میں استغاثہ دائر کیا اور یہود خیبر کو حضرت عبداللہؓ کا قاتل ظہر لیا مگر وہ کوئی یحییٰ شہادت پیش نہ کر سکے۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود خیبر کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی اور حضرت عبداللہؓ کا خون بہا اپنے پاس سے ادا کر

دیا۔ حضورؐ کی سیرت و طریقہ پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ عدل آپؐ کی جہان بینی کا بنیادی اصول تھا اور آپؐ دوسروں پر ہی نہیں بلکہ اپنی ذاتِ اقدس پر بھی اس کا اطلاق فرمایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ مالِ غنیمت تقسیم کرتے وقت ایک صاحبِ آپؐ کو چٹ مگے۔ آپؐ نے اپنے ہاتھ کی چھری سے ان کو ٹھوکا دیا جس سے ان کے منہ پر خراش آگئی۔ حضورؐ نے ان سے فرمایا: ”مجھ سے بدلہ لے لو“۔ انھوں نے عرض کیا: ”یا رسول اللہؐ میں نے معاف کر دیا“۔

یہی وہ عدل ہے جس کا اسلام ظلم بردار ہے۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کو راہِ عدل اختیار کرنے کی توفیق دے۔ آمین۔



## صلہ رحمی

اسلام محض عبادات و عقائد کے مجموعے کا نام نہیں بلکہ یہ ایک مکمل نظام حیات ہے جس میں زندگی کے ہر شعبے کے لیے اُنہ کی ہدایت و احکام موجود ہیں۔ دین اسلام اپنے انتخاب آفریں معاشرتی نظام میں حقوق العباد کی ادائیگی پر بہت زور دیتا ہے۔ حقوق العباد کا ایک خاص 'الحامض پہلو' 'صلہ رحمی' ہے۔ فی الحقیقت "صلہ رحمی" اخلاقی حسنہ کی ایک شاخ ہے وہی اخلاقی حسنہ جس کی تکمیل کے لیے خاتم الانبیاء و المرسلین ﷺ مبعوث ہوئے تھے۔ صلہ رحمی کا مطلب ہے قرابت داروں کے ساتھ حسن سلوک اسلام کی اخلاقی تعلیم میں قرابت داروں کے حقوق ادا کرنے اور اُن کے ساتھ اچھا سلوک کرنے پر دوسرے تمام مذاہب کی نسبت زیادہ زور دیا گیا ہے۔ انسانوں کی باہمی قرابت اور رشتہ داری کے تعلق کو اللہ تعالیٰ کے اسم پاک رحمان اور اُس کی صفت رحمت سے خاص نسبت ہے۔ سنن ابی داؤد میں حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا، آپ فرماتے تھے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ میں اللہ ہوں، میں اللہ رحمان ہوں میں نے رشتہ و قرابت کو پیدا کیا ہے اور اپنے نام رحمن کے مادہ سے نکال کر اس کو رحم کا نام دیا ہے پس جو اسے جوڑے گا میں اس کو جوڑ دوں گا اور جو اس کو توڑے گا میں اس کو توڑ دوں گا۔ اس حدیث مبارکہ کا مطلب یہ ہے کہ انسانی رشتوں اور باہمی قرابت کے کچھ فطری تقاضے اور حقوق ہیں جن کا عنوان اللہ تعالیٰ نے رحم مقرر کیا ہے پس جو بندہ صلہ رحمی کرے گا اس کے لیے اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ وہ اُس کو جوڑے گا یعنی اس کو اپنا بنا لے گا اور اس پر اپنی برکتیں اور رحمتیں نازل کرے گا اور جس شخص کا دل جذبہ رحم سے خالی ہوگا اور وہ صلہ رحمی کی بجائے قطع رحمی کرے گا اللہ اس کو اپنی رحمت اور فضل سے محروم کر دے گا۔

قرآن مجید میں چاہے جاصلہ رحمی یا قرابت داروں کے حقوق ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے  
مثلاً سورۃ البقرہ میں ارشاد ہوا ہے:

وَاعْبُدُوا اللَّهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَبِذِي الْقُرْبَىٰ  
(النساء: ۳۶)

”اللہ کی عبادت کرو اور کسی کو اس کا شریک نہ بناؤ اور ماں باپ اور قرابت داروں سے  
نیکی کرتے رہو“

سورہ روم میں فرمایا گیا ہے: فَاتِ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ ”تو قرابت داروں کو اس کا حق  
اداکر“ (آیہ ۲۸)

سورہ نبی اسرائیل میں حکم ہوا ہے: وَآتِ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ ”اور قرابت داروں کو اس  
کا حق ادا کر“ (آیہ ۲۶)

سورۃ النحل میں ارشاد ہوا ہے:

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَاءِ ذِي الْقُرْبَىٰ  
”یعنی جبکہ اللہ تعالیٰ عدل و احسان اور قرابت داروں کو دینے یعنی صلہ رحمی کا حکم  
دیتا ہے“ (آیہ ۹۰)

اللہ تعالیٰ کے واضح اور تاکید کی احکام کی روشنی میں ہر صاحب ایمان پر لازم  
ہے کہ اپنے والدین اور اہل و عیال کی کفالت کے بعد دوسرے رشتہ داروں کے ساتھ  
بھی صلہ رحمی کرے۔ اس کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ اپنی کمائی سے غریب اور حاجت  
مند رشتہ داروں کی مالی مدد کی جائے اور دوسری یہ کہ اپنے وقت اور زندگی کا کچھ حصہ  
ان کے کاموں میں لگائیں۔ صلہ رحمی کا یہ ایک عمل نہ صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی  
کا باعث ہوگا اور آخرت میں میزان اعمال میں نیکیوں کے پلڑے کو جھکانے کا  
سبب بنے گا بلکہ اس سے دنیوی برکات بھی حاصل ہوں گی جیسا کہ اس حدیث  
سے معلوم ہوتا ہے۔

صحیحین میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ  
رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو کوئی چاہے کہ اس کے رزق میں فراخی اور کشادگی

ہو اور دنیا میں اُس کے قدم تیار ہوں (یعنی اُس کی عمر دراز ہو) تو وہ (اہلِ قربت کے ساتھ) معاملہ رنجی کرے۔

گویا رحمتِ عالم ﷺ نے اہلِ ایمان کو بشارت دی ہے کہ مالی اعداؤ کی صورت میں رشتے داروں کے ساتھ صلہ رنجی کرنے سے ان کے مال میں کمی نہ ہوگی بلکہ اس میں برکت ہوگی اور اُن کے رزق میں اضافہ ہوگا۔ عمر میں برکت سے متعلق حضور ﷺ کے ارشاد پر اسبابِ نقطہ نگاہ سے غور کریں تو عام مشاہدہ اور تجربہ ہے کہ خاندانی جھگڑے اور تنازعے کٹھنی قربت کا پاس نہ رکھنے کی بناء پر پیدا ہوتے ہیں اور یہ آدمی کے لیے چھٹی پریشانی اور دینی ٹکڑھن کا باعث بنتے ہیں۔ ایسے ٹکڑھات لامحالہ صحت اور کاروبار ہر چیز پر نہایت برا اثر ڈالتے ہیں لیکن جو لوگ اہلِ قربت سے نیکی اور صلہ رنجی کا پتلا کرتے ہیں اُن کی زندگی روحانی آسودگی، طمانیت اور خوشدلی کے ساتھ گزرتی ہے اور ہر لحاظ سے اُن کے حالات بہتر رہتے ہیں پھر اہلِ قربت کی مدد کرنے میں وہ ہر اثواب ہے ایک صدقہ کا اور دوسرا صلہ رنجی کا۔ بعض دفعہ کوئی شخص اپنے کسی حاجت مند اور مستحق رشتے دار کے ساتھ صلہ رنجی کو اس بات سے مشروط کر دیتا ہے کہ اس نے بھی ان کے ساتھ کوئی نیکی کی ہو۔ یہ طرزِ عمل صلہ رنجی کے جذبے کے منافی ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص رشتے داروں کے احسان کا بدلہ دیکھتا ہے وہ صلہ رنجی کرنے والا نہیں بلکہ صلہ رنجی کا حق ادا کرنے والا دراصل وہ ہے جو اس حالت میں بھی صلہ رنجی کرے جب وہ اس کے ساتھ قطعِ رنجی (حق تلفی) کا معاملہ کریں۔

صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کیا، اے اللہ کے رسول! میرے رشتہ دار بیمار ہیں ان کے ساتھ ملاپ (یعنی حسنی سلوک) کرتا ہوں اور وہ مجھ سے قطعِ تعلقی کرتے ہیں میں ان سے نیکی کرتا ہوں اور وہ مجھ سے برائی کرتے ہیں، میں اُن سے بدکاری اور رگزار کا معاملہ کرتا ہوں ان کے برعکس وہ مجھ سے چہالت سے فحش آتے

ہیں اور گالیاں دیتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مگر ایسا ہی ہے جیسا تو کہتا ہے تو گویا تو ان کے منہ پر جلتی راکھ یعنی بھوبھل ڈالنا ہے اور ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی مدد تیرے شامل حال رہے گی جو تجھ کو ان پر غالب رکھے گی جب تک تو اس طرز عمل یا عادت پر قائم رہے گا۔ صلہ رحمی کی ضد قطع رحمی ہے یعنی رشتے داروں سے برا سلوک کرنا یا ان سے تعلقات توڑ لینا۔ یہ اتنا بڑا گناہ ہے کہ انسان کی آخرت برباد کر دیتا ہے۔ صحیحین میں حضرت محمد بن مسلم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قطع رحمی کرنے والا جنت میں نہ جائے گا۔ ایک اور حدیث میں وارد ہوا ہے کہ اس قوم پر رحمت نہیں اترتی جس میں قطع رحمی کا چلن ہو۔ (مشکوٰۃ)

اللہ تعالیٰ کے تاکید کی احکام اور رحمت عالم ﷺ کے ان ارشادات سے بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اسلام میں صلہ رحمی یعنی رشتے داروں اور اہل قرابت کے ساتھ حسن سلوک کی کتنی اہمیت ہے اور اس میں کوتاہی یعنی ان کو حاجت مند جانتے ہوئے بھی ان کی مدد نہ کرنا یا ان سے قطع تعلق کرنا اتنا بڑا گناہ اور کتنی بڑی محرومی ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کے دلوں میں صلہ رحمی کا جذبہ پیدا کرے اور ہمیں توفیق دے کہ ہم حاجت مند اہل قرابت کی داسے درے دے سکتے ہر طرح سے مدد کرنے پر ہمیشہ کمر بستہ رہیں۔

# راست گفتاری جنت کی کنجی ہے

قرآن حکیم اور احادیث نبوی میں مومنین کی جو صفات بیان کی گئی ہیں ان میں ایک اہم صفت راست گفتاری یعنی سچ بولنا ہے۔ ہندو مومن کسی بھی حالت میں صدق و راستی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتا اگرچہ سچ بولنے کے نتیجے میں اس کو کتنی ہی تکلیف اٹھانی پڑے (یہاں تک کہ اس کی جان بھی چلی جائے)۔ قرآن پاک میں مومنوں کو ہر حال میں سچ بولنے اور جھوٹ سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے خواہ یہ سچ (راست گفتاری) اُن کی اپنی ذات یا نزدیکی رشتہ داروں ہی کے خلاف کیوں نہ ہو۔

سورۃ النساء میں ارشاد ہوا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ هَذَا آءُ اللَّهِ وَلَوْ عَلَى أَنْفُسِكُمْ  
أَوِ الْوَالِدِينَ وَالْأَقْرَبِينَ (آیہ: ۱۳۵)

یعنی اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! انصاف پر قائم رہو اور اللہ واسطے کے گواہ بنو خواہ تمہاری یہ (جگہ) گواہی تمہاری اپنی ذات یا تمہارے والدین یا تمہارے نزدیک رشتے داروں ہی کے خلاف ہو۔

سورۃ بقرہ میں فرمایا گیا ہے:-

لَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكُنُوا لِلْحَقِّ وَالْبَاطِلِ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ (آیہ: ۴۲)

”یعنی سچ میں جھوٹ نہ ملاؤ اور نہ سچ کو جان بوجھ کر چھپاؤ“

سورۃ توبہ میں حکم دیا گیا ہے:-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ (آیہ: ۱۱۹)



”یعنی اسے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور بچوں کے ساتھ ہو جاؤ۔“

گویا سچے لوگ ایک جماعت ہوتے ہیں اور مسلمان صرف بچوں کی جماعت ہی میں شامل ہو سکتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض اوقات سچ بولنا تگوار کی دھار پر چلنے کے مترادف ہوتا ہے اور سچے آدمی کو بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن سچے لوگ کسی مشکل اور خطرے سے نہیں ڈرتے اور راست گفتاری یا حق گوئی کا فریضہ ادا کر کے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے اجر عظیم کا وعدہ کر رکھا ہے جیسا کہ سورۃ الاحزاب میں ارشاد ہوا ہے:-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَآمِنُوا بِكَلِمَاتِ رَسُولِهِ أَفَرَأَيْتُمْ لَكُمْ عُقْدًا يُغْلِبُ لَكُمْ أَنَّ تَصْلِيحَ لَكُمْ نَحْنُ نَحْنُ  
وَيُغْلِبُ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ ؕ (آیہ: ۷۰)

یعنی اے ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہو اور بات وہ کہو جو تمھیک (سچی، حقیقت پر مبنی) ہو۔ اس سے اللہ تمھارے اعمال درست کر دے گا اور تمھارے قصوروں سے دور کر دے گا۔

رسول اکرم ﷺ نے بھی راست گفتاری کی بے انتہا تاکید فرمائی ہے اور اس کو ایمان کا حصہ قرار دیا ہے۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، اے لوگو! سچ بولنے کو اپنے اوپر لازم کر لو اور ہمیشہ سچ بولو کیونکہ سچ بولنا نیکی کی راہ پر ڈال دیتا ہے اور نیکی بہشت میں پہنچا دیتی ہے اور جب کوئی آدمی ہمیشہ کے لیے سچائی کو اختیار کر لیتا ہے اور ہر حال میں سچ بولتا ہے تو اللہ کے پاس وہ بی بی بی (یعنی بڑا سچا لکھا جاتا ہے اور جھوٹ بولنے سے بچے کیونکہ جھوٹ بولنے کی حادث آدمی کو بدی کی راہ پر ڈال دیتی ہے اور یہ بدی اس کو دوزخ میں پہنچا دیتی ہے۔ جب آدمی جھوٹ بولنے کا عادی ہو جاتا ہے اور ہمیشہ جھوٹ بولتا ہے وہ اللہ کے پاس بڑے جھوٹوں (کاذبین) میں لکھا جاتا ہے۔

مشکوٰۃ شریف کی حدیث (عن صفوان بن سلیم رضی اللہ عنہ) میں آیا ہے کہ

ایک دلد رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا، یا رسول اللہ! کیا مومن بزدل بھی ہو سکتا ہے؟ آپؐ نے فرمایا، ہاں ہو سکتا ہے۔ پھر آپؐ سے پوچھا گیا، اے اللہ کے رسول! کیا مومن بغیل بھی ہو سکتا ہے؟ آپؐ نے فرمایا، ہاں ہو سکتا ہے۔ پھر پوچھا گیا، یا رسول اللہ! مومن کبھی جھوٹا بھی ہو سکتا ہے؟ آپؐ نے فرمایا، نہیں۔

اس حدیث پاک کی روشنی میں ہمیں اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ جھوٹ اور ایمان کبھی اکٹھے نہیں ہو سکتے۔ جھوٹ بولنا صرف اللہ تعالیٰ کی ناراضی کا موجب ہے بلکہ یہ دنیا میں (جھوٹ بولنے والے) آدمی کو بدنام اور ذلیل کر دیتا ہے اور لوگ اس کو ناقابل اعتبار سمجھ کر حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ایک حدیث میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد بھی امت تک بھی پہنچایا ہے کہ جھوٹ بولنے سے آدمی کا رزق گھٹ جاتا ہے۔ (صحیح بخاری و مسلم)

بعض لوگ جو کچھ کسی سے سنتے ہیں بغیر تحقیق کیے (کہ جو بات سنی ہے وہ صحیح ہے یا غلط) اسے دوسروں کے سامنے بیان کر دیتے ہیں۔ آنحضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ ایسا طرز عمل بھی آدمی کو جھوٹا بنانے کے لیے کافی ہے۔ (من ابو ہریرہ۔ صحیح مسلم)

رسول اکرم ﷺ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ جاہد حاکم (سلطان) کے سامنے کھڑے حق (جی بات) کہنا جہاد (کا دوسرا رکھتا) ہے۔ اگر ہم اپنی تاریخ پر نظر ڈالیں تو معلوم ہو گا کہ ہمارے بزرگ حق گوئی سے کبھی گریز نہیں کرتے تھے اور سچ کی خاطر اپنی جان کی پروا بھی نہیں کرتے تھے۔ یہاں ہم صرف دو مثالیں ہی پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مسئلے میں قرآن اور حدیث کے مطابق فتویٰ دیا۔ حاکمان وقت کو یہ فتویٰ پسند نہ آیا انہوں نے امام صاحبؒ پر بڑا زور ڈالا کہ وہ یہ فتویٰ بدل دیں (یعنی ان کی مرضی کے مطابق) فتویٰ دیں مگر امام صاحبؒ نے صاف انکار کر دیا۔ اس پر حکومت نے ان پر بڑی سختیاں کیں یہاں تک کہ ان کے مومنہ سے اکھڑوا ڈالے لیکن امام صاحبؒ اپنے جتنی برحق موقف پر قائم رہے اور کسی

صورت میں اس کو بدلنے پر تیار نہ ہوئے۔

حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے حاکمان وقت کی یہ بات ماننے سے انکار کر دیا کہ قرآن پاک مخلوق ہے اس کے برعکس انہوں نے اعلان کیا کہ قرآن اللہ کا لافانی کلام ہے اور یہ فانی مخلوق کی طرح مخلوق نہیں ہے۔ اس اعلان کی پاداش میں حاکمان وقت نے ان کو گرفتار کر لیا پھر ان کے پاؤں میں جیڑیاں ڈال کر ان کو بازار میں پھرایا اور اتنے کوڑے مارے کہ اگر کسی ہاتھی کو پڑتے تو وہ چیخ مار کر بھاگ جاتا لیکن امام صاحبؒ نے تمام اذیتیں نہایت صبر و استقامت سے جھیلیں اور اپنے اعلان سے سر مو بیچھے نہ ہٹے۔

حضرت محمد زوالہ ثانی شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ نے جلال الدین اکبر بادشاہ کے خود ساختہ دامن الہی کے خلاف آواز بلند کی، جہانگیر کو سجدہ کرنے سے انکار کیا اور انسان کے آگے سجدہ کرنے کو اسلام کی رو سے ناجائز ہونے کا اعلان کیا۔ جہانگیر نے ان کو قلعہ گوالیار میں قید کر دیا مگر وہ بادشاہ کے ناجائز احکام کے خلاف اپنے موقف پر قائم رہے آخر بادشاہ راہِ راست پر آ گیا اور اپنے خلاف شریعت احکام منسوخ کر دیے۔

فی الحقیقت سچائی اور راست گفتاری ایک شمع نور ہے وہ جس دل میں فروزاں ہوتی ہے وہ کبھی جھوٹ نہیں بولتا بلکہ کوئی ایسی بات بھی زبان سے نہیں نکالتا جس میں جھوٹ کی ذرا سی آمیزش بھی ہو۔ اگر وہ کسی سے عہد و پیمان یا وعدہ کرتا ہے تو اس کو ہر حال میں پورا کرتا ہے یہ بھی سچائی ہی کی ایک شاخ ہے جبکہ جھوٹا وعدہ کرنا بد اخلاقی اور گناہ کی بات ہے۔

جھوٹ بول کر کوئی دنیوی فائدہ حاصل کرنا نہ صرف شرعاً گناہ ہے بلکہ اخلاقی جرم بھی ہے۔ ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد روایت کیا گیا ہے کہ جب کوئی جھوٹ بولتا ہے تو اس کی بدبو سے فرشتے اس سے میل بھر (یا کوس بھر) دور چلے جاتے ہیں۔

(عن ابن عمر رضی اللہ عنہما)

دعا ہے اللہ ہم سب کو ہمیشہ سچ بولنے کی توفیق عطا فرمائے۔

## اللہ پر توکل

اللہ پر توکل کا مطلب یہ ہے کہ ہر حال میں اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کیا جائے۔ اس بھروسہ کی ایک صورت یہ ہے کہ آدمی اپنے کام میں دل و جان سے لگا رہے، اس کو پورا کرنے کی کوشش کرے مگر اپنی کوشش کے نتیجے کو اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دے اور بھلائی کی امید رکھے۔ اس کے ساتھ اسے یہ یقین بھی ہو کہ کامیابی اس کی اپنی کوشش کی وجہ سے نہیں بلکہ اللہ کی مہربانی سے حاصل ہوئی ہے اور کوشش جو وہ کر رہا ہے اس لیے کر رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کوشش کرنے کا حکم دیا ہے۔

توکل کی دوسری صورت یہ ہے کہ اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرے۔ بڑی سے بڑی مصیبت میں بھی اللہ پر بھروسہ رکھے اور امت سے اس مصیبت کا مقابلہ کرے اگر کوئی اس پر غلم کرتا ہے تو اللہ کے بھروسے پر عالم کا مقابلہ کرے۔ اگر مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں رکھتا تو پھر بھی اللہ پر بھروسہ کرے اور یقین کرے کہ اللہ اس کی مدد کرے گا۔

بعض لوگ توکل کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ انسان عمل اور کوشش کو چھوڑ دے اور یہ کہہ کر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہے کہ میرا خدا پر توکل ہے۔ ایسے لوگ غلطی پر ہیں۔ توکل بے عملی اور سستی کا نام نہیں ہے۔ جو شخص یہ چاہے کہ میں کچھ کام نہ کروں اور کامیاب ہو جاؤں، گھر سے نہ نکلوں اور دنیا بھر کی سیر ہو جائے، سمجھتی نہ بیوؤں اور مجھے اپنے کمیت میں لہلہاتی ہوئی فصل نظر آجائے، میزمرگی پر قدم نہ رکھوں اور مکان کی چھت پر چٹخی جاؤں، محنت نہ کروں اور دنیا بھر کی دولت سٹ کر میرے گھر میں آجائے۔۔۔۔۔۔ تو یہ امیدیں اس کے دل کو تو بہلا سکتی ہیں لیکن کبھی پوری نہیں ہونگئیں۔

اللہ تعالیٰ نے کامیابی کے لئے ایک قاعدہ دیا قانون بنا دیا ہے جو کبھی تہہ نہ

نہیں ہو سکتا۔ ہماری مشکلوں کا حل، ہمارے ارادوں میں کامیابی اور ہماری امیدوں کا پورا ہونا اسی قانون کے ماتحت ہے۔ وہ قانون یہ ہے کہ جب تک انسان کوشش نہیں کرے گا اس کو کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔ بغیر کوشش کے توکل کا آسرا وحموظ با قدرت کے اس قانون کے خلاف ہے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ اپنی طرف سے جس قدر ہاتھ پاؤں ہلا سکتا ہو ہلاتا جائے یا بچتی بھی دوڑ دھوپ اور محنت کر سکتا ہے کرتا جائے۔ اس کے بعد نتیجہ خدا پر چھوڑ دے کیونکہ توکل کا درجہ کوشش اور عمل کے بعد شروع ہوتا ہے۔ ایسا توکل دل کو بہت مضبوط بناتا ہے اور حالات کتنے ہی ناموافق کیوں نہ ہوں، انسان ناامیدی کا شکار نہیں ہوتا۔ جب وہ مانتا ہے کہ قدرت ماری کی ماری اللہ کے ہاتھ میں ہے تو پھر اس کا اس بات پر بھی یقین ہوتا ہے کہ اللہ جب چاہے حالات بدل سکتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر واقعہ کے پیچھے کوئی سبب ضرور ہوتا ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ تمام اسباب کا پیدا کرنے والا بھی اللہ تعالیٰ ہے۔ جب اسے کسی شخص یا قوم کو کامیابی عطا کرنا ہوتی ہے تو وہ ایسے اسباب پیدا کر دیتا ہے جن کے نتیجے میں وہ کامیابی حاصل ہو جاتی ہے مگر یہ بھی ممکن ہے کہ ہم وہ حالات نہ دیکھ سکیں یا ہم نہ سمجھ سکیں۔ خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ جب تم کسی کام کا پکا ارادہ کر لو تو اللہ پر بھروسہ رکھو، اللہ توکل کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

توکل کرنے والے اور توکل نہ کرنے والے میں یہ فرق ہوتا ہے کہ توکل کرنے والا خواہ مخواہ کوشش کے بعد کامیابی حاصل کرے وہ اس کامیابی کو خدا کی مہربانی کا نتیجہ سمجھتا ہے۔ اور اگر سخت کوشش کے بعد بھی اسے کامیابی نظر نہ آئے تو وہ بد دل نہیں ہوتا اور اللہ کے بھروسے پر کوشش جاری رکھتا ہے۔ دوسری طرف توکل نہ کرنے والا اپنی کامیابی کو اپنی کوشش کا نتیجہ سمجھتا ہے۔ ایسے شخص کو اگر کامیابی حاصل نہ ہو یا اس کے حاصل ہونے میں دیر لگ جائے تو وہ بد دل ہو کر کوشش چھوڑ دیتا ہے۔ اگر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ توکل عمل اور کوشش پر ابھارتا ہے اور توکل نہ کرنا اس خطرے میں مبتلا کر دیتا ہے کہ بد دل ہو کر عمل اور کوشش کو چھوڑ دیا جائے۔ چنانچہ جو لوگ یہ سمجھتے

ہیں کہ تدبیر اور کوشش کے بغیر ہی اللہ پر بھروسہ رکھا جائے۔ ان کو اللہ کے قانون کے مطابق کامیابی حاصل ہونا بہت مشکل ہے بلکہ کامیابی کے بجائے ان کو نقصان پہنچ جانے کا ذر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جتنے تدبیریں بھی ان سب کو توکل کا مکمل نمونہ بنایا لیکن تدبیر اور کوشش سے غافل رہنے پر کسی کو کامیابی کی امید نہ دلائی۔

حضرت نوح علیہ السلام ساڑھے نو سو سال تک لوگوں کو حق کی طرف بلاتے رہے۔ اُن کی قوم نے اُن کا مذاق اڑایا لیکن وہ ہدول نہ ہوئے اور ہمیشہ اللہ پر توکل کیا۔ آخر اللہ نے پانی کا ایک زبردست عذاب بھیجا جس میں حضرت نوح اور ان کے ساتھیوں کے علاوہ باقی سب لوگ فرق ہو گئے۔ طوفان آنے سے پہلے حضرت نوح نے ایک بہت بڑی کشتی تیار کی تھی۔ یہی کشتی انھیں اور ان کے ساتھیوں کو بچانے کا ذریعہ بنی۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت نوح نے اللہ پر توکل تو کیا لیکن تدبیر اور کوشش کو نہ چھوڑا۔ حضرت ہود علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت شعیب علیہ السلام، حضرت لوط علیہ السلام اور دوسرے سب پیغمبر بھی ہر حال میں اللہ پر توکل کرتے تھے لیکن ساتھ ہی لوگوں کی ہدایت کے لئے تدبیر اور کوشش بھی کرتے تھے۔

ہمارے رسول پاک ﷺ کو بھی اللہ پر پورا بھروسہ تھا۔ آپ ہر مصیبت کو بڑے حوصلے سے برداشت کرتے اور کسی قسم کے خوف کو اپنے دل میں جگہ نہ دیتے آپ نے لوگوں کو اسلام کی طرف بلانا شروع کیا تو انہوں نے آپ کو بہت ستایا اور آپ کے پیارے ساتھیوں پر بھی بہت ظلم ڈھائے لیکن آپ نے کچھ پروا نہ کی اور اللہ کے مجرّد سے پر لوگوں کو براہِ اسلام کی طرف بلاتے رہے۔ آخر اللہ نے جب آپ کو مکہ سے ہجرت کر جانے کا حکم دیا تو پہلے تین دن آپ غار ثور میں ٹھہرے۔ کافر آپ کو تلاش کرتے کرتے غار کے منہ تک پہنچ گئے۔ آپ کے پیارے ساتھی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان کے پاؤں دیکھ لیے اور گھبرا کر آپ سے کہا

”یا رسول اللہ ﷺ اگر یہ راجح کر دیکھیں گے تو ہم ان کو نظر آجائیں گے۔“

آپؐ نے حضرت ابو بکر صدیقؓ کو تسلی دی اور فرمایا: ”مکھبر! نہیں اللہ ہمارے ساتھ ہے۔“  
اور پھر واقعی اللہ نے آپؐ کو بچالیا۔ کافر آپؐ کو دیکھ ہی نہ سکے۔ اور واپس چلے گئے۔

مدینہ میں ایک رات کو کچھ صحابہ آپؐ کے گھر کے گرد پہرہ دے رہے تھے۔ آپؐ نے گھر سے برآمد ہو کر نکال کر فرمایا  
”لوگو! اپنے اپنے گھروں کو واپس چلے جاؤ میری حفاظت میرا رب فرمائے گا۔“

ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ ایک لڑائی سے واپس آتے ہوئے ایک درخت کے نیچے سو گئے۔ ایک کافر بدو لنگی لٹوار ہاتھ میں لیے آپؐ کو شہید کرنے کے ارادے سے آیا اور گستاخی کے ساتھ آپؐ کو جگا کر پوچھا: ”اب تم کو کون بچائے گا۔“  
آپؐ نے فرمایا ”اللہ!“

یہ سن کر بدو کا چہرہ لگا اور لٹوار اس کے ہاتھ سے گر گئی۔

ایک دفعہ صحابہؓ نے ایک شخص کو گرفتار کر کے آپؐ کے سامنے پیش کیا اور عرض کی کہ یہ آپؐ پر چب کر حملہ کرنا چاہتا تھا۔ آپؐ نے فرمایا ”اس کو چھوڑ دو“ یہ مجھ کو قتل کرنا بھی چاہتا تو نہیں کر سکتا تھا۔ اللہ میری حفاظت کرنے والا ہے۔“

ایک مرتبہ رسول پاک ﷺ کی خدمت میں ایک بدو حاضر ہوا۔ وہ اونٹ پر سوار ہو کر آیا تھا۔ اس نے آتے ہی عرض کی:

”یا رسول اللہ! میں اپنے اونٹ کو یونہی کھلا چھوڑ کر اللہ پر توکل کر لوں تو میرا اونٹ مجھ کو مل جائیگا، یا اسے ہاندھ بھی رکھوں اور اللہ پر بھی توکل کروں۔“  
آپؐ نے فرمایا: ”اونٹ کو ہاندھ کر بھی رکھو اور اللہ پر بھی توکل کرو۔“

جگ تو یہ ہے کہ جو شخص بھی اللہ پر توکل کرتا ہے وہ نہ کسی کے سامنے ہاتھ پھیلاتا ہے اور نہ کسی مصیبت میں ہمت ہارتا ہے۔ وہ بہادر اور غرور رہتا ہے اور مایوسی کو کبھی اپنی قریب نہیں آنے دیتا۔ اس کو اپنی کوشش کا نتیجہ جلد حاصل ہو یا نہ ہو، وہ خدا کی مرضی پر راضی رہتا ہے۔ اور اسی پر بھروسہ کرتے ہوئے اپنی کوشش کو جاری رکھتا ہے۔ کوشش اور محنت کے بغیر کسی چیز کی آرزو کرنا توکل نہیں ہے۔ حضرت علیؑ کا قول ہے کہ: ”جس کسی نے کوئی عزت اور بلندی کی جگہ بغیر کوشش کے اور تکلیف کے حاصل کرنی چاہی تو اس نے اپنی تمام عمر ایک ناممکن چیز حاصل کرنے میں ضائع کی۔“

حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی ذات پر بھروسہ کرنے کا حکم دے کر اسے حوصلے اور طاقت کا بہت بڑا اعزاز عطا فرمادیا ہے۔ یہ انسان کی بد نصیبی ہوگی کہ وہ اس خزانے سے فائدہ نہ اٹھائے۔



## اسلام میں عورتوں کے حقوق

ہر مسلمان کا اس بات پر پختہ اور کامل ایمان ہے کہ خاتم الانبیاء و المرسلین ﷺ کو اللہ جل شانہ نے سارے جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا۔ جیسا کہ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ

یعنی (اے نبی!) ہم نے آپ کو سارے جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا۔  
 حضور ﷺ کی حیات طیبہ پر ایک نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ آپ  
 مخلوق خدا کی ہر جنس کے لیے سراپا رحمت ہی رحمت اور خیر ہی خیر تھے۔ آپ کا  
 ہر رحمت دوستوں، دشمنوں، بوڑھوں، جوانوں، بچوں، بے زبان جانوروں، غریبوں،  
 یتیموں، ابا یتیموں، ذریعہ دستوں، مردوں اور عورتوں پر ہر وقت جھوم جھوم کر برسر ہوتا تھا۔  
 حضور ﷺ کی بعثت کے وقت اس عالم رنگ و بو میں ایک ایسی مخلوق بھی تھی جسے دنیا  
 کی تمام قوموں میں بہت ذلیل اور حقیر سمجھا جاتا تھا حالانکہ وہ انسانی زندگی کی گاڑی  
 کے دو پہیوں میں سے ایک پہرہ تھی۔ ہماری مراد طبقہ اناث یعنی عورتوں سے ہے۔  
 عورت کو اللہ تعالیٰ نے مرد کی ساتھی بنا کر پیدا کیا تھا۔ دکھ سکھ ہر حال میں وہ مردوں  
 کے ساتھ رہی لیکن رفتہ رفتہ ایسا وقت آ گیا کہ مردوں نے اس کی قدر و قیمت اور  
 اہمیت کو قصہ پارینہ بنا دیا۔ عیسائی عورت اور گناہ کو ایک چیز سمجھتے تھے۔ رومی عورت کو  
 غلام یا نوکر سمجھتے تھے اور اس پر ہر طرح کی سختی کرنے کو جائز قرار دیتے تھے۔ ہندو  
 عورت کو اپنی روحانی ترقی میں بڑی دکاوت جانتے تھے۔ یہودی عورت کو بعض خاص  
 حالتوں میں گھر سے نکال دیتے تھے۔ عرب میں عورت کو جوتی کی نوک کے برابر سمجھا  
 جاتا تھا۔ کسی کے گھر میں بیٹی پیدا ہوتی تو اس کو بڑی ذلت اور بے عزتی کا باعث سمجھا  
 جاتا۔ اکثر بے رحم لوگ بیٹی پیدا ہوتے ہی اسے زندہ زمین میں دفن کر دیتے تھے یا کسی

سکون میں پھینک دیتے تھے۔ رسول اکرم ﷺ نے مبعوث ہو کر عورت کو اتنا بلند مقام دیا کہ اس کے قدموں کے نیچے جنت رکھ دی۔ آپ نے عورت کو ماں، بیوی، بیٹی اور بہن ہر حیثیت میں اتنی عزت دی اور اتنے حقوق عطا فرمائے کہ دنیا کی کسی دوسری قوم میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرنے اور ان کی عزت کرنے کا حکم دیا ہے اس سلسلے میں رسول اکرم ﷺ نے بھی ماں باپ کی فرمانبرداری اور خدمت کرنے کی بار بار تاکید فرمائی ہے۔ آپؐ نے جہاں باپ کی ناراضی کو اللہ کی ناراضی قرار دیا ہے (یعنی باپ کو ناراض کرنے سے اللہ تعالیٰ ناراض ہو جاتا ہے) وہاں مسلمانوں کو یہ بھی بتایا ہے کہ ماں کے قدموں میں تمہاری جنت ہے مطلب یہ کہ ماں کی خدمت کرنے والا جنت کا حقدار بن جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے گناہ (ماں کی خدمت کے عوض) بخش دے گا اور اس کو جنت میں داخل کر دے گا۔

صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: بے شک اللہ تعالیٰ نے تم پر اپنی ماؤں کی تافرمانی کرنے اور ان کے حق غصب کرنے کو حرام قرار دیا ہے۔

عورت بیوی کی حیثیت میں ہو تو اللہ تعالیٰ نے مردوں کو حکم دیا ہے:

وَعَايِرُوا هُنَّ بِالْمَعْرُوفِ یعنی ان عورتوں کے ساتھ اچھے طریقے سے

زندگی گزارو۔ (سورہ نساء آیہ: ۱۹)

رسول پاک ﷺ نے بھی بیویوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی تاکید فرمائی ہے۔ آپؐ کا ارشاد ہے کہ مسلمانوں میں وہی شخص کامل الایمان ہے جس کا اخلاقی برتاؤ سب کے ساتھ بہت اچھا ہو خصوصاً اپنی بیوی کے ساتھ جس کا سلوک لطف و محبت کا ہو۔ (جامع ترمذی عن عائشہ)

آپؐ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ کوئی ایمان والا شخص اپنی سوتلہ بیوی سے نفرت نہیں کرتا اگر اس کی کوئی عادت اچھی نہیں تو دوسری کوئی عادت اچھی ہوگی (یا عادتیں اچھی ہوں گی)۔ (صحیح مسلم۔ عن ابو ہریرہؓ)

ایک دفعہ حضور ﷺ سے پوچھا گیا کہ یا رسول اللہ! کسی شخص کی بھئی کا اس کے شوہر پر کیا حق ہے تو آپؐ نے فرمایا، اس کا حق یہ ہے کہ جب ٹوکھائے تو اسے کھائے، اور جب تو پہننے تو اسے پہنائے اور اس کے چہرے پر نہ مارے اور اس کو بد دعا کے الفاظ نہ کہے اور اگر اس سے ترک تعلق کرے تو صرف گھر میں کرے۔

(ابوداؤد - عن حکیم بن معاویہ)

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنی عورتوں کے لیے بہتر ہے۔

(ابن ماجہ)

یہ وہ عورت کے بارے میں حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ اس کے لیے دوڑ دھوپ کرنے والا (یعنی اس کی خبر گیری کرنے والا) مجاہد فی سبیل اللہ کی طرح ہے اور اس کے برابر ہے جو دن بھر روزہ رکھے اور رات بھر نماز پڑھے۔ (صحیحین من ابی ہریرہ) عورت بیٹی کی حیثیت میں ہو تو رسول اکرم ﷺ نے جہاں اس کو نہایت سختی کے ساتھ زعمہ و رگور کرنے یا قتل کرنے سے منع فرمایا ہے وہاں اس کو اچھے طریقے سے پالنے پوسنے کا حکم دیا ہے اور ایسا کرنے کو جنت حاصل کرنے کا ذریعہ بتایا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، جس کے ہاں بیٹی پیدا ہوگی وہ نہ اسے زعمہ و رگور کرے اور نہ ذلت کی حالت میں رکھے اور نہ اولاد نہ رہے (یعنی بیٹوں) کو اس پر ترجیح دے تو اللہ تعالیٰ اس کو جنت میں داخل کرے گا۔

حضور ﷺ نے یہ بھی فرمایا ہے جس کسی نے تین یا دو بیٹیوں یا ایک بیٹی کی بھی پیار محبت کے ساتھ پرورش اور تربیت کی یہاں تک کہ اللہ نے انہیں بے نیاز کر دیا (یعنی وہ شادی کے بعد اپنے شوہر کے گھر پہنچ گئیں) تو ایسے شخص کے لیے اللہ نے جنت واجب کر دی۔ (مسلم و شریف عن ابن عباس)

حضورؐ نے بیٹیوں کے ساتھ بھی اچھا سلوک کرنے کی ہدایت فرمائی ہے۔

(ادب المفرد عن کلیب و مقدمہ ابن سعدی کرب)

اسلام نے عورتوں کو اور جو بڑے بڑے حقوق عطا کیے ہیں ان میں سے کچھ

یہ ہیں۔

۱۔ شادی کے لیے عورت کی رضا مندی ضروری ہے اس کی مرضی کے خلاف یا اس کی رضا مندی کے بغیر کسی کو اس کا نکاح کرنے کا حق نہیں۔

۲۔ عورت (خواہ وہ کتنی مالدار ہو) شوہر سے ہر حال میں عقدہ پانے کی حقدار ہے۔

۳۔ عورت باپ، شوہر اور اولاد سے (بعض صورتوں میں دوسرے قریبی رشتے داروں سے) وراثت پانے کی حقدار ہے۔

۴۔ عورت شوہر سے شرعاً، اخلاقاً اور قانوناً مہر پانے کی حق دار ہے۔

۵۔ ناکارہ، ظالم اور ناچندیدہ شوہر سے جان چھڑانے کے لیے عورت کو طلع کا حق دیا گیا ہے۔

۶۔ بیوہ، مطلقہ یا فسخ نکاح والی عورت کو دوسرے نکاح کا حق دیا گیا ہے۔

۷۔ وراثت اور مہر سے حاصل شدہ رقم کی عورت کو (بلا شرکت غیرے) مالک قرار دیا گیا ہے۔ اگر وہ یہ رقم تجارت میں لگا کر یا محنت مزدوری کر کے کچھ حاصل کرتی ہے تو وہ بھی اس کی ملکیت قرار دیا گیا ہے۔

۸۔ فوجداری اور دیوانی مقدمات میں اور جان مال عزت اور آبرو کے تحفظ میں عورت کو مرد کے برابر رکھا گیا ہے۔

۹۔ عورت کو علم حاصل کرنے کی نہ صرف اجازت دی گئی بلکہ ان کی تعلیم و تربیت کو اسی طرح ضروری قرار دیا گیا جس قدر مردوں کی تعلیم و تربیت ضروری ہے۔

۱۰۔ عبادت اور تزکیۂ نفس کے ذریعے عورت بڑے سے بڑا روحانی درجہ اسی طرح حاصل کر سکتی ہے جس طرح مرد۔

۱۱۔ عورت کا عمومی دائرہ کار وہی مقرر کیا گیا جو اس کی جسمانی طاقت اور فطری صلاحیتوں سے ہم آہنگ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے عورت کو اس کی ہر حیثیت میں جو اونچا مقام اور

حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے عورت کو اس کی ہر حیثیت میں جو اونچا مقام اور احترام دیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ عورتوں کے حقوق ادا کرنا جہاں ہر سچے مسلمان کی دینی، اخلاقی اور قانونی ذمہ داری ہے وہاں یہ اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کا ذریعہ بھی ہے۔



۱۔ حضرت ابو مسعود مدنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب آدمی اپنے گھرانوں پر آخرت میں اجر پانے کی نیت سے خرچ کرتا ہے تو یہ اس کے لیے صدقہ بن جاتا ہے۔

(صحیح)

۲۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب آدمی کے پاس وہ پیڑیاں ہوں اور اس نے ان کے حقوق میں انصاف اور برابری نہ کی تو قیامت کے دن وہ اس حال میں آئے گا کہ اس کا آدھا حوزہ گر گیا ہوگا۔

(ترمذی)

۳۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بلا حوں، کمزوروں اور عورتوں کا بیج اور عمرہ کرنا ثواب میں جہاد کبیر (جہاد فی سبیل اللہ) کے برابر ہے۔

(نسائی)

## غیر کی راہ۔ رحم

اسلام مسکاحی امن ہمدردی اور بھائی چارے کا دین ہے۔ یہ زندگی کے ہر شعبے میں انسان کو غیر اور بھلائی کی راہ دکھاتا ہے۔ اس پر چل کر انسان اپنی دنیا بھی سنوار سکتا ہے اور آخرت بھی۔ اسلام نے اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لیے نیکی کے جن کاموں کا بطور خاص حکم دیا ہے، ان میں رحم کو بنیادی حیثیت حاصل ہے خود اللہ جل جلالہ کا ایک صفاتی نام ”الرحمن“ ہے یعنی بزرگم کرنے والا رحم سے بھرا ہوا۔ اس ذات پاک کا ایک اور صفاتی نام ”الرحمن“ ہے اس کا مطلب بھی ہے بزرگم کرنے والا۔ ہر مسلمان کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ ہر اچھا کام شروع کرنے سے ”رحمن“ اور ”رحیم“ کا نام لے یعنی **بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ** پڑھے۔ ”رحمن“ اور ”رحیم“ دونوں ہی رحمت سے مشتق ہیں۔ اسلام چونکہ انسانیت کے لیے دین رحمت ہے اور **خَاسَمَ الْاَنْبِیَاءَ وَالْمُرْسَلِیْنَ** کو اللہ تعالیٰ نے دونوں جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا:

وَمَا اَرْسَلْنَاكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِیْنَ (النبا ۱۰۷)

(اور ہم نے آپ کو دونوں جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا)

اس لیے دین حق اسلام کے حکم بردار اور رسول رحمت ﷺ کا کلک پڑھنے والے بھی اہل ایمان آپس میں بھی ایک دوسرے کے لیے (رحیم) ہوں گے اور دوسرے انسانوں کے لیے بھی کیونکہ رسول اکرم ﷺ نے ظاہر آخرت یا جنت میں داخلے کے لیے رحم دلی کو لازمی شرط قرار دیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ جنت میں سوائے رحم کرنے والے کے کوئی نہ جائے گا، لوگوں نے کہا، ہم سب رحم کرنے والے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، نہیں (کوئی شخص جنت کا مستحق نہیں ہوگا) جب تک وہ عوام الناس پر رحم نہ کرے۔ (کنز العمال)

قرآن حکیم میں صحابہ کرامؓ (مؤمنین) کی امتیازی صفات یہ بیان کی گئی

ہیں:

مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ وَهَمَّاءٌ  
بَيْنَهُمْ وَرَحْمَةٌ مِّنَ اللَّهِ وَرِحْنٌ أُنْتَبِئُوا  
فِيهِمْ فِي ذُنُوبِهِمْ مِّنَ آتَمِرِ السُّجُودِ (الحج ۴۶)

ترجمہ: محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کفار پر سخت اور  
آپس میں رحیم ہیں تم جب دیکھو گے انہیں رکوع و سجود اور اللہ کے فضل اور  
اس کی خوشنودی کی طلب میں مشغول پاؤ گے۔ سجدوں کے اثرات ان کے  
چہروں پر موجود ہیں جن سے وہ الگ پہچانے جاتے ہیں۔

اس آیت مبارکہ میں مؤمنین کی امتیازی صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ  
آپس میں رحیم و شفیع ہیں، ان کی سختی جو کچھ بھی ہے دشمنانِ دین کے لیے ہے۔ اگر غور  
کریں تو معلوم ہوگا کہ دشمنانِ دین کے مقابلے میں مؤمنین کی سختی بھی ان (کفار) کی  
بہتری کے لیے ہے۔ مقصد اس کا یہ ہے کہ وہ راہِ راست پر آ جائیں اور اپنی عاقبت  
سنوار لیں۔ یہ سختی ایسی نہیں ہے کہ ان کو زبردستی اپنا مذہب بدلنے پر مجبور کیا جائے ایسا  
کرنے سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ دَاعِيَ حَقِّهِ صَفَتْ یہ ہے  
کہ وہ نرم حراج اور رحم دل ہوتا ہے۔ یہاں سختی سے مراد یہ ہے کہ مؤمنین میدانِ جنگ  
میں کفار کے مقابلے میں ثابت قدم رہتے ہیں نیز یہ کہ کفار کی ترغیب و تحریص کو سختی  
سے دبا کر دیتے ہیں اور دینِ حق سے منحرف ہونے کا خیال تک دل میں نہیں لاتے  
رسول اکرم ﷺ کی شانِ رحیمی اللہ تعالیٰ نے یوں بیان فرمائی ہے:

لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنْفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا غِيْبُكُمْ  
خَرِيصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِينَ وَوُفٍّ رَّحِيمٌ (الحج ۴۷)

ترجمہ: (تمہارے پاس خود تم ہی میں سے ایک ایسا رسول آیا ہے جسے ہر  
وہ چیز شانِ گزرتی ہے جو تم کو تکلیف (تقصان) پہنچائے، جو تمہاری بھلائی

کا ہے خداوند اور اہل ایمان پر نہایت شفیق اور مہربان ہے۔)

رحم کا مطلب ہے ترس، درد مندی، مہربانی، ہمدردی، کرم، رحمت۔ اللہ تعالیٰ نے رسول اکرم ﷺ کی حیات طیبہ کو مسلمانوں کے لیے بہترین نمونہ قرار دیا۔ چنانچہ آپ تمام مخلوق خدا سے بڑھ کر رحم دل اور نرم مزاج تھے۔ آپ دوست، دشمن، بڑھ، بچے، مرد، عورت، کافر، مسلمان حتیٰ کہ بے زبان جانور ہر ایک پر رحم فرماتے تھے۔ کسی کو مصیبت میں دیکھ کر آپ کو بہت دکھ ہوتا تھا اور آپ اس کا دکھ درد دور کرنے کے لیے جو کچھ بھی ہو سکتا تھا کرتے تھے۔ آپ نے لوگوں کو بتایا کہ اللہ تعالیٰ جو رحمان اور رحیم ہے اس کو وہی بندے محبوب ہیں جو لوگوں پر رحم کرتے ہیں، وہ اپنے ان بندوں کو اپنی بے پایاں رحمتوں سے نوازے گا۔ سنن ابی داؤد اور جامع ترمذی میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن عامر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

لوگوں (اللہ کی مخلوق) پر رحم کرنے اور ترس کھانے والوں پر اللہ تعالیٰ (رحمن) کی خاص رحمت ہوگی۔ دیکھو! تم زمین والی مخلوق پر رحم کرو، تم پر آسمان والا رحمت کرے گا۔

اس حدیث میں بڑے طبع انداز میں تمام مخلوق پر جس سے انسان کا واسطہ پڑتا ہے، رحم کھانے کی ترغیب دی گئی ہے کیونکہ دوسروں کے ساتھ ترحم کا معاملہ کرنے والا اللہ تعالیٰ کی رحمت خاص کا مستحق ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس جو شخص بے رحم ہے، مخلوق خدا پر ظلم کرتا ہے یا کسی محتاج مسائل یا مصیبت میں جھکا کسی انسان پر رحم نہیں کھاتا اس کے لیے سخت وعید آئی ہے کہ وہ اللہ کے رحم و کرم سے محروم ہو جاتا ہے۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”جو شخص اللہ کے بندوں پر رحم نہیں کرتا اللہ اس پر رحم نہیں کرتا“

اسی طرح جامع ترمذی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے



کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ جس شخص کے دل سے رحم ہٹایا جاتا ہے وہ باقی بد بخت ہوتا ہے۔ (ترمذی باب رحمت اللہ علیہ)

مولانا الطاف حسین حالی رحمت اللہ علیہ نے "مسدس حالی" میں اس مضمون کو یوں بیان کیا ہے:

خدا رحم کرتا نہیں اس بشر پر نہ ہو درد کی چوٹ جس کے جگر پر  
کسی کے گر آفت گزر جائے سر پر پڑے غم کا سایہ نہ اُس بے اثر پر  
کرد مہربانی تم اہل زمین پر  
خدا مہرباں ہو گا عرشِ بدیں پر

رسول اکرم ﷺ کا یہ ارشاد کہ جو لوگ دوسرے قاتلِ رحم انسانوں پر رحم نہیں کھاتے اور ان کی تکلیف اور ضرورت کو محسوس کر کے اپنی استطاعت کے مطابق ان کی مدد اور خدمت نہیں کرتے، وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے محروم ہو جاتے ہیں، معروف عالمِ دین مولانا محمد متکون نعمانی رحمت اللہ علیہ نے اس ارشادِ نبوی کی یوں تشریح کی ہے:-

"واضح رہے کہ چوروں، ڈاکوؤں اور اس طرح کے دوسرے مجرموں کو سزا دینا اور قاتلوں کو قصاص میں قتل کرنا، ترخم کی اس تعلیم و ہدایت کے خلاف نہیں ہے بلکہ یہ بھی عوام کے ساتھ ترخم ہی کا تقاضا ہے اگر مجرموں کو تعزیری قانون کے مطابق سخت سزائیں نہ دی جائیں تو پھر اے عوام ظالموں کے مظالم اور مجرمین کے جرائم کا اور زیادہ نشانہ بنیں گے۔ قرآن پاک میں ارشاد فرمایا گیا ہے:

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَوةٌ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ (البقرہ، ۱۷۹)

ترجمہ - اے اہلِ دانشِ قصاص کے قانون میں تمہارے لیے زندگی کا سامان ہے" (معارف المحدث جلد ششم ص ۷۷-۱۳۶)

یہاں یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ حضور درگزر اور صلہ رحمی (بارہم) رحمہ لی ہی کی شائیں ہیں لیکن موضوع کی وسعت کے پیش نظر ان کا ذکر الگ کیا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مخلوق خدا کے ساتھ اچھا سلوک خواہ ازراہ رحم کیا جائے یا صرف رضائے الہی (اللہ تعالیٰ کی خوشنودی) کی خاطر دونوں صورتوں میں ایک نہایت اعلیٰ عملِ خیر ہے جو خاصانِ خدا میں شامل کر سکتا ہے۔ حضرت انس بن مالک اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:-

”ساری مخلوق اللہ تعالیٰ کی غیاں (گویا اس کا کنبہ) ہے۔ اس لیے اللہ کو زیادہ پیارا اپنی مخلوق میں وہ آدمی ہے جو اللہ کی غیاں (یعنی اس کی مخلوق) کے ساتھ احسان اور اچھا سلوک کرے۔“

رحمب عالم ﷺ نے ”رحم“ کو صرف انسانوں ہی کے لیے مختص نہیں فرمایا بلکہ حیوانوں پر بھی رحم کھانے کی تاکید فرمائی ہے۔ حضور کی بعثت کے وقت عرب میں رواج تھا کہ لوگ زعمہ اونٹ کی کوہان اور زعمہ دُسنے کی چکتی کاٹ کر کھا جاتے تھے۔ حضورؐ نے کسی بھی زعمہ جانور کا کوئی عضو کاٹنے سے منع فرمایا اور ایسا کرنے والے پر لعنت بھیجی۔

ایک حدیث میں حضورؐ کا یہ ارشاد بھی آیا ہے کہ ”جس کسی نے کسی جانور کا منہ کیا (یعنی کان ناک دُم پکتی وغیرہ کاٹ کر اس کی صورت بگاڑ دی) اللہ تعالیٰ اس منہ کرنے والے کا قیامت کے دن منہ کرے گا۔“ (مسند احمد)

عرب میں یہ دستور بھی تھا کہ لوگ جانوروں کو باندھ کر ان پر نشانہ بازی کی مشق کرتے تھے اور جانوروں کو آپس میں لڑایا بھی کرتے تھے۔ حضور ﷺ نے ان دونوں کاموں سے لوگوں کو سختی سے منع فرمایا۔ (صحیح مسلم، ابوداؤد و ترمذی)

ان کے علاوہ حیوانوں پر رحم اور ان سے اچھا سلوک کرنے کے بارے میں اور بہت سی احادیث وارد ہوئی ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضور ﷺ نے اس سلسلے میں چند اصول مقرر فرمائے تھے اور مسلمانوں کو ان پر عمل کرنے کا حکم دیا تھا۔

ان اصولوں کا خلاصہ یہ ہے۔

- ۱۔ ہر جانور سے وہی کام لینا چاہیے جس کے لیے وہ پیدا کیا گیا ہے۔ (صحیح بخاری)
- ۲۔ ہر جاندار (مشمول حیوانات) سے اچھا سلوک کرنا موجب ثواب ہے۔

(صحیح بخاری)

(ان میں ضرر پہنچانے والے درندے سانپ بچھو وغیرہ)

موذی جانور شامل نہیں ان کو مارنا جائز ہے)

- ۳۔ کسی جانور کو ضرورت کے بغیر مارنا (قتل کرنا یا زخم کرنا) بہت بڑا گناہ ہے۔

(مسند رک حاکم)

- ۴۔ کسی جانور کو (ضرورتاً) زخم کرتے وقت اچھا طریقہ اختیار کرنا چاہیے، چھری کو تیز کر لینا اور ذبیحہ کو آرام پہنچانا چاہیے۔

(صحیح مسلم)

- ۵۔ جانوروں کے منہ پر تھامو اور تھام پر داغ دو (تھام کو داغ) ایسا کرنے والا ملعون ہے۔

(ابوداؤد)

- ۶۔ جانوروں کو بھوکا پیاسا مت رکھو۔

(صحیح مسلم)

- ۷۔ پرندوں کے گھونسلوں سے ان کے اعضاء مت اٹھاؤ اور نہ ان کے بچے پکڑو۔

(مسلم۔ ابوداؤد)

- ۸۔ زخم کیے جانے والے جانور کے سامنے چھری تیز نہ کرو بلکہ اس کو پچھاڑنے سے پہلے ہی اسے تیز کر لو۔

(مسند رک حاکم)

- ۹۔ حیوانوں کو آگ میں مت جلاؤ۔ آگ کی سڑک پر صرف اللہ تعالیٰ کو سزاوار ہے۔

(ابوداؤد و مسند احمد)

(اس ارشاد نبوی کی روشنی میں کسی دوسرے جاندار کو بھی آگ میں جلا نا جائز نہیں)

- ۱۰۔ حیوانوں اور پرندوں کو کنگر اور پتھر نہ مارو اور نہ ان پر ٹھیل چلاؤ۔ اس سے نہ شکار ہو سکتا ہے، اور نہ دشمن شکست کھا سکتا ہے لہذا اس سے کسی کا دانت ٹوٹ سکتا ہے اور آنکھ بھرت سکتی ہے۔

(بخاری)

مختصر یہ کہ رحم دلی ایک ایسی صفت ہے جو کسی انسان کو اللہ تعالیٰ کا محبوب اور جنت کا مستحق بنا سکتی ہے ہم سب کو دعا کرنی چاہیے کہ اگر ہمارے دلوں میں سختی ہے تو ہمارا رب جو رحیم اور کریم ہے اسے نرمی میں بدل دے، اور ہمیں مخلوق خدا پر رحم اور شفقت کرنے کی توفیق دے۔

حدیث نبویؐ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر چھ حق ہیں اول یہ کہ جب ملاقات ہو تو سلام کرے دوسرے یہ کہ جب ایک دوسرے کو دعوت پر بلائے تو وہ دعوت قبول کرے تیسرے یہ کہ جب وہ فصاحت (یا سوادے) کا طالب ہو تو اس سے دریغ نہ کرے چوتھے یہ کہ جب اس کو چھینک آئے اور وہ الحمد للہ کہے تو یہ اس کو برحک اللہ کہے۔ پانچویں یہ کہ جب بیمار ہو تو اس کی عیادت کو جائے چھٹے یہ کہ جب وہ فوت ہو جائے تو اس کے جنازے کے ساتھ جائے۔

حدیث نبویؐ

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کہ سب سے اچھا عمل کون سا ہے؟ آپؐ نے فرمایا، کسی مسلمان کا دل خوش کر دینا بڑے ثواب کا کام ہے۔ اگر بھوکا ہے کھانا کھلا دو، اس کے پاس کپڑے نہ ہوں تو کپڑے پہنا دو یا اس کی کوئی ضرورت انگی ہوئی تو اسے پوری کر دو۔

(ترغیب بحوالہ طبرانی)

## برداشت اور تحمّل

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو جن بھلائی اور نیکی کے کاموں یعنی اعمالِ خیر کا حکم دیا ہے ان میں ایک نیک عمل برداشت اور تحمل کا ہے۔ برداشت اور تحمل کا ایک مطلب یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں یا دین کی خاطر خواہ کتنی ہی مصیبتیں اور کٹھنائیاں پیش آئیں ان کو صبر اور حوصلے کے ساتھ برداشت کیا جائے، اللہ تعالیٰ پر پورا بھروسہ رکھا جائے اور کسی بھی حالت میں مایوس نہ ہوا جائے۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ اگر گھر کے کسی ملازم یا ملازمہ سے، کسی دوست یا سے یا کسی مسلمان بھائی سے کوئی قصور ہو جائے جس کے سبب غصہ آ جائے تو اس غصے کو پی لیا جائے یعنی اس پر قابو پا کر قصور وار کو معاف کر دیا جائے۔ اسی طرح زبان یا ہاتھ سے برائی کرنے والے کی بدگویی یا برائی کو بھی برداشت کر لیا جائے اگرچہ اس سے بدلہ لینے کی طاقت اور وسائل بھی ہوں۔ اس طرزِ عمل کو بھی برداشت اور تحمل کہا جائے گا یا غصہ و درگزر اور یہ صفت اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے۔ سورۃ آل عمران میں فرمایا گیا ہے:

وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ ؕ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ

(آیت ۱۳۴)

یعنی جو لوگ غصے کو پی جاتے ہیں اور دوسروں کے قصور معاف کر دیتے ہیں ایسے نیک لوگ اللہ کو بہت پسند ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا اپنا ایک پاک نام بھی ”العلیم“ ہے یعنی اللہ غفلت شائے بہت حلیم والا ہے، وہ گناہوں کو معاف کرنے میں بڑا حلیم ہے، گناہوں کی سزا جلد نہیں دیتا، گنہگاروں کا رزق بند نہیں کرتا، ان کی صحت و عافیت کو تباہ نہیں کرتا بلکہ ان کو اپنی

اسلام اور توبہ کی سہولت دیتا ہے۔

برداشت، تحمل اور غصہ و درگزر بھی جلم ہی کی شاخیں ہیں۔ جو مسلمان اللہ تعالیٰ کے ”آخِ ظہیم“ ہونے پر ایمان رکھتا ہے اس کا فرض بنتا ہے کہ وہ جلم، تحمل اور برداشت کو اپنی زندگی کا اصول اور اپنی عادت بنا لے کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔

ہمارے رسول پاک ﷺ قرآن مجید کی چلتی پھرتی تفسیر تھے آپ کے عمل اور قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ کے نازل کیے ہوئے احکام میں مطلق کوئی فرق نہ تھا اسی لیے اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کی حیات اطہرہ کو مسلمانوں کے لیے بہترین نمونہ قرار دیا ہے۔ جیسا کہ قرآن حکیم میں ارشاد ہوا ہے:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (الاحزاب)  
 حضور ﷺ کے جلم و تحمل اور آپ کی برداشت کی کوئی امتحا نہ تھی۔ اس کا جو نمونہ آپ نے امت کے سامنے پیش کیا اگر سارے مسلمان اس کو مشعل راہ بنائیں تو پھر کوئی عیب نہیں کہ باہمی غرت اور جھگڑے فسادِ امیٹ کے لیے ختم نہ ہو جائیں اور رحمتِ عالم ﷺ کے سارے نام لیا اِنَّهُمْ الْمُؤْمِنُونَ اِنْخَوْفٌ کی تصویر بن جائیں۔ اُن المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی ذات کے لیے کبھی کسی سے انتقام نہیں لیا، آپ برائی کے بدلے برائی نہ کرتے بلکہ معاف فرما دیتے اور درگزر کرتے تھے

(ابوداؤد، ترمذی)

آنحضرت ﷺ کی سیرتِ حقہ پر ایک نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ کوئی خفی اور مصیبت ایسی نہ تھی جو آپ نے کافروں اور منافقوں کے ہاتھوں نہ جھیلی ہو۔ انہوں نے آپ کی ایذا رسانی میں کینگی کی انتہا کر دی یہاں تک کہ آپ کو اپنا وطن اور گھر بار چھوڑنا پڑا۔ آپ نے یہ سب کچھ بڑے سبر اور تحمل کے ساتھ برداشت کیا اور جب فتحِ مکہ کے موقع پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان پر غلبہ دے دیا اور غلبہ بھی ایسا کہ آپ کے ایک

اشعارے پر وہ سب خاک و خون میں لوٹائے جاسکتے تھے لیکن آپؐ نے یہ فرما کر سب معاف فرمادیا ”میں تم سے وہی کہوں گا جو یوسف (علیہ السلام) نے اپنے بھائیوں سے کہا تھا، آج تم پر کوئی اثم (ملامت) نہیں، جاؤ تم سب آزاد ہو۔“

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، موسیٰ ابن عمران علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے سوال کیا کہ اے میرے پروردگار میرے نزدیک سب سے عزیز آدمی کون ہے، اللہ تعالیٰ نے جواب دیا، وہ شخص جو انتقام پر قادر ہو اور معاف کر دے۔ (مشکوٰۃ)

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے (قبیلہ) عبد القیس کے سردار بنی قریظ سے فرمایا کہ تم میں دو شخص تیس ایسی ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے ایک جلم اور دوسری آہستگی۔ (جامع ترمذی)

ایک دفعہ ایک ہڈ ڈالا گیا اور حضور ﷺ کی چادر مبارک اس زور سے کھینچی کہ اس کا کنارہ آپؐ کی گردن مبارک میں ٹکب گیا اور آپؐ کو بہت تکلیف ہوئی۔ پھر اس نے گستاخانہ بڑے شہد لہجے میں کہا:

”اے فخر خدا یہ میرے دروازن ہیں ان پر لادنے کے لیے مجھے سامان دو، حیرے پاس جو مال ہے وہ نہ تیرا ہے نہ حیرے باپ کا“  
ظہور ﷺ نے بڑی نرمی سے فرمایا:

”مال تو اللہ کا ہے، میں اس کا بندہ ہوں مگر جو سلوک تم نے میرے ساتھ کیا ہے کیا اس پر تم سزا سے نہیں ڈرتے؟  
بڑے نے کہا، نہیں۔

آپؐ نے پوچھا، کیوں؟

وہ بولا، مجھے پورا یقین ہے کہ تم بدی کا بدلہ بدی سے نہیں دیتے۔

اس کا جواب سن کر ظہور ﷺ مسکرائے گئے اور اس کے اذخوں پر کھجوریں اور خلد وادے۔

ایک دفعہ رسول اکرم ﷺ نے لوگوں میں کچھ مال تقسیم کیا۔ ایک شخص نے آپ کی تقسیم پر اعتراض کیا اور گستاخانہ کہا، اے اللہ کے رسول! اللہ سے ڈریں اور انصاف کریں۔ یہ بات سخت غصہ دلانے والی تھی لیکن آپ نے بڑے تحمل سے کام لیا اور صرف یہ فرما کر اس کو محاف کر دیا،

”اگر اللہ کا رسول انصاف نہیں کرے گا تو اور کون کرے گا۔ اللہ تعالیٰ موسیٰ علیہ السلام پر رحمت فرمائے، ان کی قوم نے اس سے بھی بڑھ کر ان کو ستایا تھا۔“

ایک صحابی زید بن سعد اسلام قبول کرنے سے پہلے یہودی تھے۔ اسی زمانے میں ایک دفعہ حضور ﷺ نے ان سے کچھ قرض لیا اور ایک مقررہ تاریخ تک اسے واپس کرنے کا وعدہ کیا لیکن زید نے مقررہ تاریخ سے پہلے ہی آکر قرض کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ ان کا رد یہ سخت قابل اعتراض تھا کیونکہ انہوں نے آپ کی چادر مبارک پکڑ کر ٹھنڈی اور نہایت گستاخی سے کہا: ”تم مال منول کر کے میری رقم مار لو گے۔“ اس کے علاوہ بھی کچھ اشتعال انگیز باتیں کہیں۔ اتفاق سے اس وقت حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بھی وہاں موجود تھے۔ ان کو زید کی گستاخانہ گفتگو سن کر غصہ آیا تو اس کو اٹھانے کی طرف بڑھے اور کڑک کر کہا:

”اے اللہ کے دشمن! تو اللہ کے رسول کے بارے میں ایسی بُری باتیں کہتا ہے۔“

رسول اکرم ﷺ نے مسکرا کر حضرت عمرؓ کو روکا اور فرمایا:

”اے عمر! تمہیں چاہیے تھا کہ مجھے قرضہ ادا کرنے کے لیے کہتے اور زید کو نرمی سے کام لینے کی تلقین کرتے۔“

اس کے بعد فرمایا:

”زید کا قرضہ میری طرف سے ابھی ادا کر دو اور اس کو بیس صاع (ایک وزن ہوتا تھا ایک صاع ۲ کلو ۷۶ گرام) گہوں کے وزن کے برابر) زیادہ دے دو۔“

زیدؓ حضور ﷺ کا خُسن اخلاق اور تحمل دیکھ کر اسی وقت مُشرّف پہ اسلام



ہو گئے اور گزرا کر حضورؐ سے معافی چاہی آپؐ نے جلا تا نکل معاف فرمادیا۔

حضرت عمر بن وہب رضی اللہ عنہ قبول اسلام سے پہلے رسول اکرم ﷺ کے سخت دشمن تھے ایک دفعہ آپؐ کو شہید کرنے کے ارادے سے مدینہ منورہ آئے لیکن پکڑے گئے۔ جب ان کو حضورؐ کے سامنے پیش کیا گیا تو آپؐ نے ان کو طاقت کے بغیر بالکل معاف فرمادیا آپؐ کے اس کریمانہ اخلاق کا تعمیر پر ایسا اثر ہوا کہ وہ حلقہ بگوش اسلام ہو گئے

اس طرح کے شبیہوں و اوقات حضور ﷺ کی حیات اطہر میں ملتے ہیں۔ کسی کی برائی اور زیادتی کو برداشت کرنا اور برائی یا زیادتی کرنے والے کو معاف کر دینا بڑا دل گروے کا کام ہے۔ ایسا کرتے ہوئے بعض اوقات اپنی ذلت کا احساس ہوتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ حضورؐ گزر بہت بڑی نیکی ہے اور ایسا کرنے والے کی عزت کم نہیں ہوتی بلکہ بڑھتی ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اگر کوئی شخص کسی کا قصور معاف کرے تو اللہ تعالیٰ اس کی عزت بڑھاتا ہے۔

یہاں یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ اگر کوئی شخص واقعی مظلوم ہے اور وہ ناحق ظلم اور زیادتی کا شکار ہوا ہے تو اللہ تعالیٰ نے اسے مجبور اور پابند نہیں کیا کہ وہ لازماً حضورؐ گزر سے کام لے۔ وہ بدلہ بھی لے سکتا ہے جیسا کہ سورہ النحل میں ارشاد ہوا ہے:

وَإِنْ عَاقَبْتُمْ لِعَاقِبْتُمْ مَا غَوَّيْتُمْ بِهِ ۖ  
(اور اگر تم لوگ بدلہ لینے لگو تو بس اسی قدر لے لو جس قدر تم پر زیادتی کی گئی)

(ہو)

یہاں بدلہ لینے کی اجازت کے ساتھ یہ پابندی عائد کر دی گئی ہے کہ بدلے کی مقدار اسی قدر ہو جس قدر زیادتی کی گئی ہو۔ اکثر حالات میں بدلہ لینے وقت کسی معین حد پر رہنا ممکن نہیں ہوتا اور حد سے بڑھ کر بدلہ لینے والا خود ظالم بن جاتا ہے اسی

لے بدلہ لینے کی اجازت کے ساتھ یہ بھی فرمایا گیا ہے

وَلَمَّا ضُمِرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِلضَّامِرِينَ  
(لیکن اگر تم صبر کرو تو یہ یقیناً صبر کرنے والوں ہی کے حق میں بہتر ہے)

گویا بدلہ لینے کی قدرت حاصل ہونے پر مخلوق درگزر سے کام لینا اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا باعث ہے۔ اس خوشنودی کی صورت کیا ہوگی سورۃ النساء میں اس کو یوں بیان کیا گیا ہے:

إِنْ تُبْسِلُوا خَيْرًا أَوْ تَغْلِبُوا أَوْ تَغْلِبُوا عَنْ سُوءٍ فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ  
عَفُورًا قَدِيرًا  
(آیت ۱۳۹)

یعنی تم غلامی ٹھکی کر دیا چھپا کر کر دیا دوسرے کی برائی معاف کر دو تو بے شک اللہ بھی بے حد معاف کرنے والا ہے وہ بڑا قدرت مند کھنڈے والا ہے۔

مطلب یہ کہ تم کسی کی برائی سے درگزر کرو گے اور اسے معاف کر دو گے تو اللہ کی صفت بھی یہی ہے کہ وہ بڑا معاف کرنے والا ہے وہ تمہارے لیے بھی معافی کا دروازہ کھول دے گا (یعنی تمہارے گناہوں سے بھی درگزر فرمائے گا) کیونکہ معاف کرنے کا اجر اللہ نے اپنے ذمے لے رکھا ہے جیسا کہ سورۃ النور میں ارشاد ہوا ہے

وَجَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ بِفُلْهَا ۖ فَمَنْ عَفَا وَأَصْلَحَ فَأَجْرُهُ  
عَلَى اللَّهِ ۖ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ ۝  
(آیت ۴۰)

برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے پھر جو کوئی معاف کر دے اور اصلاح (صلح) کرے تو اس کا اجر اللہ کے ذمے ہے۔ بے شک اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔

سورۃ النور میں ارشاد ہوا ہے:

وَلْيَغْفِرُوا أَوْ لْيَصْفَحُوا ۖ أَلَا تُحِبُّونَ أَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ ۗ وَاللَّهُ  
عَفُورٌ رَحِيمٌ  
(آیت ۴۲)

ترجمہ: تمہیں چاہیے کہ (تصور وار کو) معاف کر دو اور درگزر کرو، کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تمہیں (تمہارے تصور) معاف کرے اور اللہ بخشنے والا مہربان

ہے۔ (اللہ تعالیٰ کی جنت یہ ہے کہ وہ غفور اور رحیم ہے)

اس آیت مبارکہ میں واضح کر دیا گیا ہے کہ جو لوگ دوسروں کے قصور اور زیادتی معاف کر دیتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کے قصور (گناہ) معاف کر دیتا ہے۔ گویا قصور کرنے والے کو معاف کر دیتا اور قدرت ہونے کے باوجود اس سے انتقام نہ لینا ایک ”اچھا انتقام“ اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک نہایت پسندیدہ عمل ہے۔ ”اچھا انتقام“ ان معنوں میں کہ جس شخص کے علم اور زیادتی کو نظر انداز کر کے اس کو معاف کر دیا جائے گا اس کا خمیر اس کو ملامت کرے گا، وہ اپنے کیے پر نادم اور پشیمان ہوگا اور معاف کرنے والے کا احسان مند ہو کر اس کا دوست اور خیر خواہ بن جائے گا۔

ایک مومن اور دینی حق کی سبکی شان ہے کہ وہ جاہلوں اور ظالموں کی بدزبانی اور زیادتیوں کو صبر و تحمل کے ساتھ برداشت کرتا ہے ان سے الجھتا نہیں اور اللہ کے بھروسے پر اس بالمعروف کا فریضہ ادا کرتا رہتا ہے۔ سورۃ الاعراف میں رسول اکرم ﷺ کو مخاطب کر کے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

خُذِ الْعَفْوَ وَأَعْرِضْ بِالنُّفُورِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ (آیہ ۱۹۹)

یعنی (اے نبی) غمخوار و گمراہ کا طریقہ اختیار کرو، نیکی کی تلقین کیے جاؤ اور جاہلوں کی نادانی کی باتوں سے چشم پوشی کرو (ان کی پروا نہ کرو یا ان سے نا اہمو) چنانچہ حضور ﷺ نے مکی زندگی کے پُر آشوب دور میں ظالم کافروں کے مقابلے میں یہی طرز عمل اختیار فرمایا۔ اور بعد میں بھی آپؐ سے بڑھ کر غمخوار و گمراہ کرنے والا کوئی نہ تھا۔

دعا ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کو برداشت و تحمل اور غمخوار و گمراہی کی توفیق دے۔

## اُخُوّت و اِتحاد

اسلام امن، فحشیت، احرام انسانیت اور اُخُوّت و اِتحاد کا دین ہے۔ مسادات، رواداری، خدمتِ خلق، ایک دوسرے کی خیر خواہی، ایثار و عزم، مہمان نوازی، شیریں زبانی اور جلم و جمل اُخُوّت و اِتحاد ہی کی شاخیں ہیں۔ یہ دین اسلام ہی ہے جو معاشرے کے مختلف طبقوں کے درمیان نفرت و تصادم کو یکسر مسترد کرتا ہے۔ اس کے برعکس وہ ہر طبقے کے حقوق مسترد کرتا ہے اور ان کو حقوقِ العباد کا نام دے کر نجاتِ اخروی کو ان کے پورا کرنے سے مشروط کرتا ہے اور جو ساتھ ہی واضح کرتا ہے کہ وہی معاشرہ، اسلامی معاشرہ کہلانے کا مستحق ہے جس کی تشکیل باہمی اُخُوّت و اِتحاد کی بنیاد پر ہوئی ہو۔ ایسے ہی معاشرے کو دنیا اور آخرت میں کامیابی کی بشارت دی گئی ہے۔

اسلام کا ”دستور اساسی“ قرآن مجید جہاں یہ اعلان کرتا ہے:

إِنَّ الْبَلَدَيْنِ عِنْدَ اللَّهِ أَوْلَىٰ بِالْإِسْلَامِ (آل عمران: ۱۹)

(یعنی در حقیقت دین اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے)

وہاں یہ بھی واضح کر دیتا ہے:

لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ (البقرہ: ۲۵۶)

(یعنی دین کوئی زور و بروہت نہیں ہے)

ای حکمِ خداوندی کے قیاس نظر مسلمانوں کے ساتھ غیر مسلموں کو بھی وہ تمام بنیادی حقوق عطا کیے گئے جو قرآن پاک نے مسلمانوں کے لیے مثلاً جان و مال کا تحفظ، عزت و آبرو کا تحفظ، نجی زندگی کا تحفظ، عقیدہ کی آزادی کا حق، عبادت گاہوں کا تحفظ وغیرہ بنیاد اور نفرت کی جڑ کٹ گئی۔ جہاں تک اہل ایمان کا تعلق ہے تو اللہ تعالیٰ اور اللہ کے رسول ﷺ نے ان میں باہمی اُخُوّت و اِتحاد کو لازم قرار دیا۔

سورۃ الحجرات میں ارشاد ہوا ہے

يٰۤاَيُّهَا الْمُؤْمِنُونَ اِخْوَةٌ فَاَصْلَحُوا سَبِيْلَكُمْ اَعْلَمْتُمْ (آیت ۱۰)

یعنی مومن تو ایک دوسرے کے بھائی ہیں لہذا اپنے بھائیوں کے درمیان تعلقات کو درست کرو۔

سورۃ آل عمران میں مسلمانوں کو نظم دیا گیا ہے

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ ۚ اِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا ۚ وَلَا تُفْرِقُوا (آیت ۱۰۳)

یعنی سب مل کر اللہ کی ہر ایک چیز کو مضبوط پکڑ لو اور ہر قدم میں نہ چڑو۔

اس حقیقت کی نہ صرف تاریخی عالم گواہی دیتی ہے بلکہ یہ عام مشہور بھی ہے کہ فتنہ و فساد باہمی، شکت و خون، نا اہل و حق اور بد امنی کسی بھی قوم کے لئے طغاب کی حیثیت رکھتی ہے اور اگر اس کا بد وقت تدارک نہ کیا جائے تو یہ اس قوم کی جانی کا قتل خیر ثابت ہوتی ہے۔ آج سے تقریباً ۱۷ ہزار سال پہلے اہل عرب بھی اسی طغاب میں مبتلا تھے۔ باہمی شکت و خون، نسل در نسل رہنے والی جنگوں، تخت و تاج اور دوسرے گونا گوں دلائل نے ان کو جانی کے دہانے پر لاکھڑا کیا تھا۔ اگرچہ اسے اور بھی حالت رہتی تو قانون قدرت کے مطابق عرب قوم کا نام و نشان تک مضبوطی سے بٹ جاتا لیکن اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنا فضل کیا اور ایک زار عرب میں خاتم الانبیاء و المرسلین جناب محمد مصطفیٰ ﷺ کا ظہور ہوا۔ یہ ظہور گویا بد وقت تھا جو انسانیت کی سوچی ہوئی بے مرگ و بار کھیتی پر غم و غم کر برسا اور اس کو سرسبز و شاداب کر دیا۔ کفر و شرک کا طوفان ختم کیا، قتل و غارت گری کا بازو سرورچ گیا، مغایہ کا قلع قمع ہو گیا۔ فتحی رب قہاں باہم شیر و فخر ہو گئے۔ مسند و ان باطل کے بد بخار ایمان لا کر دنیا کے بہترین انسان بن گئے۔ دھج عالم ﷺ نے ان کو خدا کے واحد کے ذریعہ و رحمت بنا کر ان کے ایسے ایمانی رشتے میں پرو دیا جو نسلی اور فنی برادری سے کھینچا ہوا

نوعیت رکھتا تھا۔

اہل ایمان میں اس انوکھے و انجھا کو اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنا احسان قرار

ایا۔ چنانچہ اہل عرب کو مخاطب کر کے فرمایا کہ

وَاذْكُرْ ذَا بَعَثْتُ الْقُبُورَ عَلَيْكُمْ اَوْ تَخْتَمُ الْحَقَّ اَقَالَفَ مِنْ قُلُوبِكُمْ

فَاذْكُرْكُمْ بِبَعَثَةِ اَحْوَالِكُمْ وَتَخْتَمُ عَلَى صَفَا حَقْرَةِ بَيْنِ النَّارِ

فَاذْكُرْكُمْ مِنْهَا ۝ آل عمران: ۱۰۳

یعنی اللہ کے اس احسان کو یاد رکھو جو اس نے تم پر کیا ہے۔ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ اس نے تمہارے دل جوڑ دیے اور اس کے فضل و کرم سے تم بھائی بھائی بن گئے۔ تم آگ سے بھرے ہوئے ایک گڑھے کے کنارے کھڑے تھے۔ اللہ نے تم کو اس سے بچالیا۔

بجانب عربوں میں یہ مختصر انتساب اللہ تعالیٰ کا خاص احسان تھا اور غور کیجیے کہ وہی عرب جس میں امن و امان تمام کی کسی شے کا وجود نہ تھا اور انسان انسان کے ظمن کا بیڑا تھا وہاں انگوٹے و اتحاد کی بدولت امن و آشتی کی ایسی بہار آتی ہے کہ سسنان گھائیوں اور صحراؤں میں کوئی آدمی جن تباہیوں میں میل تک سوتا اچھا حال چلا جائے کوئی اس کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا۔

دعوتِ عالم ﷺ کو اختلاف اور تفرق سے سخت نفرت تھی اور آپؐ مسلمانوں میں تفرق ڈالنے کو کفر و شرک کے بعد سب سے بڑا جرم اور گناہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ کئی اصحابؓ میں آپؐ نے مسلمانوں میں پھوٹ اور تفرق ڈالنے والے شخص کو بڑی سے بڑی سزا کا نسخہ چھپ ٹھہرایا ہے۔

آنحضور ﷺ مسلمانوں کے باہمی تنازعات کا ختمی سے محاسبہ فرمایا کرتے تھے۔ ان کو ایک دوسرے سے الجھنے کی ممانعت فرماتے تھے۔ اگر باز آئے تو بڑا دردک دیتے یا فریقین میں مصالحت کرا دیتے آپؐ فرمایا کرتے کہ دو متخالب فریقوں میں انصاف کے ساتھ صلح کرا دینے سے صدقہ کا ثواب ملتا ہے۔

ظہور نے ہجرت سے پہلے مکہ میں اہل ایمان کے درمیان بھائی چارا قائم کر لیا اور ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں نہایت جریں اور انصار کے درمیان صلہ و امان

کا تم کرایا اور اپنی وفات تک مسلمانوں کو برابر قحط و اتحاد اور باہمی اُلفت و چاکلت کی تلقین فرماتے رہے۔ اس سلسلے میں آپؐ کے چند ارشادات سامع فرمائیں:

﴿ خدا کی قسم تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنے مسلمان بھائی کے لئے وہی بات پسند نہ کرے جو اپنے لئے کرتا ہے۔

﴿ مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور جس کے ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔ (صحیحین)

﴿ ایک دوسرے سے خندہ مست کرو۔ بازار میں کوئی چیز بکتی ہو اور کوئی اس کو خریدتا ہو تو خریدنے کی نیت کے بغیر اس کی قیمت مست ہو جائے، ایک دوسرے سے

بغض مت رکھو، ایک دوسرے سے لڑاو، عداوت ممتدہ مت بھجرو، اور تم میں سے کوئی دوسرے کے سودے پر موعامت کرے، اللہ کے بندو ایک دوسرے کے بھائی بن

جائے۔ مسلمان مسلمان کا بھائی ہے نہ اس پر عظم کرے، نہ اس کی مدد سے ہاتھ پیچھے اور نہ اس کو حقیر جائے۔ ہر چیز مسلمان کی مسلمان پر حرام ہے اس کی جزا، اس کا خون،

اس کا مال۔ (صحیح مسلم)

﴿ مسلمان اپنے مسلمان بھائی کا آئینہ ہے اور مومن مومن کا بھائی ہے اسے نقصان سے بچاتا ہے اور اس کی غیر ماضی میں اس کے حقوق کی حفاظت

کرتا ہے۔ (ابوداؤد)

﴿ مسلمان بھائی کی غیر خواہی کر دین (کی اصل) ہے۔ (ترمذی)

﴿ اللہ تعالیٰ تیرا سب کے دن فرمائے گا، کہاں ہیں وہ لوگ جو باہم قہقہہ رکھتے تھے۔ مجھے اپنے جلال کی قسم ہے انہیں میں آج اپنے سایہ میں جگ دوں گا اور آج میرے سایہ کے سوا کوئی سایہ نہیں۔ (صحیح مسلم)

﴿ اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔ حضورؐ سے پوچھا گیا کہ یا رسول اللہ ﷺ ظالم کی مدد کیسے کی جائے؟ آپؐ نے فرمایا: اس کو ظلم سے روک دے

لکھا انکی مدد ہے۔

﴿ کچے لہذاغ کے خطبہ میں وصیہ عالم علیہ السلام نے مجملہ دوسرے ارشادات کے یہ بھی فرمایا:

سارے مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں اور تم سب ایک نسل ہو۔  
 تمہارے خون، مال اور تمہاری عزتیں ایک دوسرے پر ہمیشہ کے لئے حرام کر دی گئی  
 ہیں، میرے بعد گمراہ نہ ہو جانا کہ آپس میں نشت و خون کرنے لگو۔

وہا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں میں اخوت و اتحاد اور یک نیت و محبت کا  
 جذبہ حقیقی معنوں میں پیدا کر دے اور ہم ملک و ملت کے دشمنوں کے مقابلے میں  
 ئسان قوا صوں یعنی سب سے بڑی ہوئی دلوں میں جائیں۔ آمین !





## روداداری اور کشادہ دلی

قرآن حکیم کتاب ہدایت ہے جو زندگی کے ہر شعبے میں ہدایت دہن والی رہنمائی کرتی ہے اللہ کی یہ پاک کتاب اخلاقی خندہ یا حسن سیرت و کردار کو بڑی اہمیت دیتی ہے اور واضح کرتی ہے کہ اخلاقی خندہ کو دین سے الگ کیا ہی نہیں جاسکتا، سرور عالم ﷺ کا ارشاد ہے کہ میں اسی لئے بھیجا گیا ہوں کہ اخلاقی خندہ کی تکمیل کروں۔ چنانچہ حضور ﷺ نے قرآن مجید کے احکام کے مطابق مسلمانوں کی سیرت و کردار کی تعمیر پر خاص توجہ دی۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ عرب کے صحرا نشینوں میں ایسے بلند کردار انسانوں کی ایک عظیم جماعت چار ہو گئی جنہوں نے تہذیب و تمدن کے ہر شعبے میں دنیا کی رہنمائی کی۔ روداداری، کشادہ دلی، کشادہ نظری یا کشادہ ظرفی اخلاقی خندہ ہی کی ایک شاخ ہے جس سے مکی اور شاخص بھی پھوٹتی ہیں مثلاً عدل و انصاف، غنودہ گزار، جلم و تحمل، خدمتِ خلق وغیرہ۔ قرآن پاک کا آغاز ہی زبِ تعالٰیٰ کی حمد سے ہوتا ہے یعنی اُس زبِ کی حمد سے جو سارے جہانوں اور ہر عقیدے والے ہب اور مسلک کے انسانوں کا زبِ ہے۔ مولانا حالی نے کیا خوب کہا ہے:

یہ پہلا سبق تھا کتابِ حدی کا

کہ ہے سازیِ مخلوق کتبہِ خدا کا

نی الحقیقت اسلام اپنے اندر کشادہ نظری یا انسانی روداداری کی جو روح دمکتا ہے، کوئی بھی انصاف پسند اس سے انکار نہیں کر سکتا۔ یہ کشادہ نظری تمام نوعِ انسانی کے لیے ہے جس میں کسی قوم یا وطن اسلام کے چرواہوں کی تخصیص نہیں۔ اس کا اندازہ ہمیں دعوتِ اسلام کی حقیقت سے ہو سکتا ہے کہ رحمتِ عالم ﷺ کس سے ہوئی کے ساتھ ہدایتِ انسانی کا فرض انہماک دیتے ہیں اور علم و فساد کی جڑیں کاٹتے ہیں۔ ایسا کرتے وقت نہ تو آپؐ کسی قوم کو غلام بناتے ہیں اور نہ آپؐ کے سینہ پاک میں کسی قوم یا مذہب کے خلاف کینہ یا عداوت ہوتی ہے۔ اسلام کی یکساں روح ہے جو دنیا میں

امن قائم کر سکتی ہے، مختلف قوموں اور نسلوں میں ہم آہنگی اور انسانوں میں باہمی  
روباداری، محبت اور رواداری پیدا کر سکتی ہے، باہمی حسد، خبیثاتی جنگ قومی پیکار اور  
مذہبی تعصب سے زندگی کی فضا کو پاک و صاف بنا سکتی ہے۔

سورۃ بقرہ میں ارشاد ہوتا ہے: لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ یعنی دین میں کوئی  
زبردستی نہیں ہے۔

سورۃ کہف میں فرمایا گیا ہے: فَاسْأَلْ خَلْقَهُ فَيَتَوَلَّى وَرُكْحًا لَهُ لَلْكُفْرُ  
یعنی جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کافر رہے۔ (آیہ ۲۹)

سورۃ الانعام میں ارشاد ہوا ہے: وَلَا تَسْئَلُوا اللَّهَ يَغْفِرَ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ  
اللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ (آیہ ۱۰۸)

یعنی جن لوگوں کو یہ شرک اللہ کے سوا پکار جاتے ہیں ان کو گالیاں شدہ کہیں ایسا  
نہ ہو کہ یہ شرک سے آگے بڑھ کر جہالت کی بناء پر اللہ کو گالیاں دینے لگیں۔

دوسرے لفظوں میں قرآن حکیم نے بت پرستوں کے ٹھوس کو بھی ان کے  
سامنے مذاکبے سے منع فرمایا ہے۔

ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے کہ لوگوں کو دعوت حق دو تو زور، تھک دہ اور دھتی اور  
خفت لگائی سے نہیں بلکہ حکمت اور عہد و پند و موعظت سے انہیں راہ حق کی طرف بلاؤ۔  
سورۃ فصل میں یہ حکم اس طرح دیا گیا ہے: نَذِيعُ إِلَيْكَ سُبْحَانَ رَبِّكَ يَا لِحَكْمَتِهِ  
وَالْعَوَظَةِ الْحَسَنَةِ

غرض قرآن حکیم میں جگہ جگہ کشادہ نظری یا اختلافی عقائد کی برداشت اور  
باہمی رواداری کی تلقین کی گئی ہے اور تعصب اور عنصرت کو سخت مذموم قرار دیا گیا ہے  
سرد عالم متکلف کی حیات طیبہ قرآن حکیم کی عملی تفسیر تھی آپ نے کشادہ نظری کا  
جو نمونہ پیش کیا اس کو یوں کہنا چاہیے

آسانوں دو گیتی تفسیر میں دو حرف است

با دوستان مختلف با دشمنان خدا را

حضرت ہارون علیہ السلام سے روایت ہے کہ ہمارے پاس سے ایک جنازہ گزرا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو دیکھ کر کھڑے ہو گئے اور ہم لوگ بھی آپ کے اتباع میں کھڑے ہو گئے۔ پھر ہم نے عرض کیا، یا رسول اللہ یہ جنازہ تو ایک یہودی کا تھا، آپ نے فرمایا، کیا وہ فرد انسانی نہ تھا؟ جب تم جنازے کو دیکھو تو کھڑے ہو جایا کرو۔ حضورؐ نے ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں نزول اہلال فرمایا تو سب سے پہلا کام آپؐ نے یہ کیا کہ یہود سے معاہدہ صلح و اشتی طے کیا جس میں یہود کو نہ صرف عمل مذہبی آزادی دی گئی بلکہ شہری اور ثقافتی معاملات میں بھی انہیں مسلمانوں کے برابر حقوق دیے گئے۔ آپؐ کی مدنی زندگی میں کئی بار ایسا ہوا کہ کوئی مقدمہ آپؐ کے سامنے لایا گیا جس میں ایک فریق یہودی تھا اور دوسرا مسلمان۔ آپؐ نے فریقین کے بیانات سن کر اگر یہودی کو حق پر پایا تو بلا تامل اس کے حق میں فیصلہ دے دیا۔

اسی طرح اگر آپؐ کسی عسائیہ یا شاکسائیہودی کی عداوت کی خبر سنتے تو اس کی عداوت کے لئے تحریک لے جاتے۔

حضرت بخیر بن مطعم سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص اپنی قوم کی بے جا عداوت کی طرف لوگوں کو بلانے وہ ہم میں سے نہیں اور جو حالت نصیب میں مر جائے وہ بھی ہم میں سے نہیں ہے۔

سرور عالم ﷺ نے ظلم و فساد کو مٹانے کے علاوہ اور کسی مقصد کے لئے بھی تلوار اٹھانے کی اجازت نہیں دی۔ مجاہدین کے لئے آپؐ کی واضح ہدایات تھیں کہ کسی عورت سے بچے بوڑھے، بیمار، خادم اور مذہبی پیشوا پر ہاتھ نہ اٹھایا جائے۔ فتح مکہ کے بعد آپؐ نے تمام جہاد قریش کو ان کے گھناؤنے ماضی کے باوجود معاف کر دیا غزوہ حنین میں مشرکین کی تیرہ ہاری سے مسلمانوں کو سخت نقصان پہنچا تھا لیکن جب ان کو شکست ہوئی اور ان کے چھ ہزار آدمی گرفتار کر کے آپؐ کے سامنے لائے گئے تو آپؐ نے ان سب کو نہ صرف آزاد کر دیا بلکہ اپنے پاس سے عمدہ کپڑے بھی عطا کیے۔ ہجری میں نجران سے یہودیوں کا ایک وفد حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپؐ

نے ساتھ آدمیوں پر مشتمل اس وفد کو مسجد نبوی میں ٹھہرایا اور اس کے ارکان کو اپنے طریق پر نماز پڑھنے کی اجازت دے دی۔ اگرچہ ان لوگوں نے اسلام قبول نہ کیا لیکن جب تک وہ رخصت نہ ہوئے حضورؐ نے ان کی تحریم اور مہمانداری میں کوئی کمی نہ فرمائی۔ اسی سال اہل طائف کا وفد مدینہ یاسر کی سرکردگی میں مدینہ آیا یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے مدینہ نبوت میں آپ سے سخت ہمدردی و سلوک کیا تھا، مہمانداری کر کے آپؐ کو بخروج کر دیا تھا لیکن آپؐ نے نہایت خندہ پیشانی سے ان کا استقبال کیا اور کئی دن تک بڑے احترام سے ان کی مہمانداری کی۔

ایک مرتبہ چند شریر یہودی آپ کے پاس آئے اور اذرا و خیانت اور تم غلظت یعنی جنہیں موت آئے کہا۔ نغم المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ قریب ہی موجود تھیں۔ انہوں نے غضبناک ہو کر جواب دیا: غلظتکم لکثام و غلظتہ

(یعنی جنہیں بھی موت آئے اور لعنت اس پر عزیذ) جب وہ چلے گئے تو حضورؐ نے فرمایا ”عائشہ تم نے کیوں ایسا جواب دیا اللہ تعالیٰ کو پسند کرتا ہے“ حضورؐ چاہتے تو ان یہودیوں کو سخت سزا دے سکتے تھے لیکن یہ آپؐ کی کشادہ نظری تھی کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ کا سخت جواب دینا بھی گوارا نہ فرمایا عرب میں دشمنوں کی لاشوں کا منظرہ کرنے کا رواج تھا یعنی لاش کے ہونٹ کان، ناک اور بعض دوسرے اعضاء کاٹ ڈالتے تھے۔ حضورؐ نے مسلمانوں کو اس وحشیانہ حرکت کی سختی سے ممانعت کر دی اور حکم دیا کہ دشمن کی لاش کی بھی بے حرمتی نہ کرو۔ اسی طرح آپؐ نے جنگی قیدیوں کے بارے میں حکم دیا کہ انہیں کوئی اوجھ نہ پہنچائی جائے اور ان کے کھانے پینے کا اچھی طرح خیال رکھا جائے غزوہ بدر کے بعد جہنم علیک نے یہ منظر بھی دیکھا کہ بعض صحابہ کرام خود بھوکے پیاسے تھے لیکن اپنے قیدیوں کو پیٹ بھر کر کھانا کھاتے تھے۔ جنت المورع کے موقع پر دستِ عالم منکشف کا یہ کہ مہلح انسانی پریوں پر ساکت آپؐ نے کم و بیش ایک لاکھ کے مجمع کے سامنے اعلان فرمایا:

”کسی عربی کو کسی عجمی پر کسی عجمی کو کسی عربی پر کسی گورنے کو کسی

کالے پر اور کسی کالے کو کسی گورے پر کوئی نصیحت نہیں ہے نظر پر ہی زکامی کے۔  
 تاریخ انسانی کے اس حدیثم المثال احسان نے رنگ و نسل کے تعصب اور  
 تحک نظری کی جڑیں کاٹ کر رکھ دیں اور کشادہ نظری کا ایسا نظریہ پیش کیا جو نئی نوع  
 انسان کی فلاح و بہبود کا ضامن ہے۔ حضور کے صحابہ کرامؓ بھی نہایت کشادہ دل اور  
 وسیع النظر تھے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں انہیں شام میں  
 ایک محاذ سے دوسرے محاذ کو منتقل ہونا پڑا تو جن شہروں کو خالی کیا وہاں کے غیر مسلم  
 باشندوں کو ان سے وصول کیا ہوا جزیہ واپس کر دیا کہ اب ہم تمہاری حفاظت نہیں  
 کر سکتے۔ وہ لوگ روتے تھے اور زانگھیں کرتے تھے کہ خدا تمہیں بھروا دیں بلائے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ ایک ضعیف العمر آدمی کو  
 ایک دروازے پر بھیک مانگتے دیکھا تو اس سے پوچھا تم کون ہو اور کس چیز نے تمہیں  
 بھیک مانگنے پر مجبور کیا۔ اس نے کہا میں یہودی ہوں اور جزیہ، احتیاج اور بڑھاپے  
 نے مجھے گداگری پر مجبور کیا ہے۔ حضرت عمرؓ چشمہٴ آب ہو گئے، اس کا ہاتھ پکڑ کر گھر  
 لائے اس کی ضرورت کی تمام چیزیں فراہم کیں اور بیت المال سے اس کا وظیفہ مقرر کر  
 دیا ساتھ ہی فرمایا ”خدا کی قسم یہ انصاف کی بات نہیں کہ ہم نے اس کی جوانی سے تو  
 فائدہ اٹھایا اور بڑھاپے میں اس کو اس طرح رسوائی کے ہاتھوں میں چھوڑ دی۔ یہ بھی  
 ایک غیر مسلم مسکین ہے اور صدقات میں اس کا بھی حصہ ہے۔“

اسی طرح جب حضرت عمرؓ نے دمشق کا سفر کیا تو کچھ گودھی جیسا بنیوں پر آپ  
 کا گزر ہوا۔ فوراً حکم دیا کہ صدقات کے مال سے ان کا وظیفہ مقرر کیا جائے اور ساتھ ہی  
 کھانا بھی۔

بیت المقدس تشریف لے گئے اور وہاں کے جیسا بنیوں سے معاہدہ کیا تو اس  
 میں ان کو جان و مال کی حفاظت اور مکمل مذہبی آزادی کی ضمانت دی اور یہ ذلت و ادنیٰ  
 قبول کی کہ ان کے گرجوں اور صلیب وغیرہ کو ہانکل نہیں چھیڑا جائے گا۔ مقدس  
 مقامات کی سیر کرتے کرتے ایک گرجا میں نماز کا وقت آ گیا تو چادری نے درخواست کی

کی آپ گرجا ہی میں نماز ادا کر لیں لیکن حضرت عمر فاروقؓ نے یہ فرما کر انکار کر دیا کہ اگر ہم نے یہاں نماز ادا کر لی تو ہمارے بعد مسلمان یہ دعویٰ کریں گے کہ یہ مقام ان کی عبادت گاہ ہے۔

یہ ہے وہ رواداری اور کشادہ دلی جس کی تعلیم اسلام دیتا ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس پر کار بند ہونے کی توفیق عطا فرمائے آمین ثم آمین۔

### حدیث نبویؐ

حضرت انسؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:۔ ساری مخلوق اللہ تعالیٰ کی عیال (گویا اس کا کنبہ ہے) اس لئے اللہ کو زیادہ محبوب اپنی مخلوق میں وہ آدمی ہے جو اللہ کی عیال (مخلوق) کے ساتھ احسان اور اچھا سلوک کرے۔

(شعب الایمان للبیہقی)

### حدیث نبویؐ

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:۔ جو نیک بیٹا ماں باپ کی طرف رحمت و شفقت کی نظر سے دیکھے اللہ اس کے حساب میں ہر نظر کے بدلے ایک مقبول حج کا ثواب لکھ دیتا ہے۔ (بخاری)

## اسلام کی خاص الخاص صفت حیا ہے

حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ”ہر دین کی ایک صفت ہوتی ہے (جو کہ اس میں حمود اور غالب ہوتی ہے) اسلام کی صفت (جو اس میں حمود اور غالب ہے) حیا ہے۔“ (مؤطا امام مالک)

”حیا“ جسے ہادئ برحق ﷺ نے اسلام کی خاص الخاص صفت قرار دیا ہے، اس کے لغوی معنی شرم، حجاب، غیرت اور لحاظ کے ہیں۔ ان میں سے ہر لفظ بڑا وسیع المفہوم ہے خصوصاً ایوں سمجھ لیجئے کہ کوئی بھی برا کام (جس سے اللہ اور رسولؐ نے منع فرمایا ہے) کرنے میں اللہ کا خوف نہ کرنا اور اسے بلا جھجک و پردہ یا دھوم دھڑنے سے کرنا بے حیائی ہے جو اللہ کے غضب کو دعوت دیتی ہے۔ حیاتی الحقیقت اخلاقی خستگی حمود ترین صفت ہے اسے ہم ایک پاکیزہ جذبہ بھی کہہ سکتے ہیں جو انسان کو برائیوں سے روکتا ہے اگر یہ نہ ہو تو پھر انسان بے حیا ہو کر جو چاہے کر سکتا ہے۔ مرد ہو یا عورت اگر اس میں حیائیں ہیں تو وہ سخت بد نصیب اور ایمان کی دولت سے محروم ہے۔ قرآن مجسم میں ارشاد ہوا ہے:

وَلَا تَقْرُبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ (الانعام: ۱۵)

”اور بے حیائی کی باتوں کے قریب بھی نہ جاؤ خواہ وہ کھلی ہوں یا چھپی۔“

ایک اور جگہ فرمایا گیا ہے:

قُلْ إِنَّمَا حَرَّمَ ذَاتِ الْفَوَاحِشِ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ  
وَالَّذِينَ هُمْ عَنْ غَوَاةٍ يَحْذَرُونَ (الاعراف: ۳۳)

”اے نبی! ان سے کہہ دیجئے کہ میرے دہ نے جو چیزیں حرام کی ہیں وہ تو یہ ہیں، بے حیائی کے کام خواء کھلے ہوں یا در پردہ اور گناہ اور حق کے خلاف زیادتی۔“

اب حیا کے بارے میں رجب عالم رحمہ اللہ کے کچھ ارشادات ملاحظہ

فرمائی:

حضرت ابو مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ انبیاء سابقین کی باتوں میں جو بات لوگوں نے پائی ہے وہ یہ ہے کہ جب کچھ میں حیا نہ رہے تو جو چاہے کر لیجئے بے حیا باشوہرچہ خواہی کن (صحیح بخاری)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ حیا ایمان کی ایک شاخ ہے اور الہی ایمان بہشت میں ہیں اور بے حیائی اکثرین ہے اور اکثریوں کا لٹکانا دوزخ ہے۔ (جامع ترمذی)

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ حیا سے صرف بھلائی ہی حاصل ہوتی ہے۔ (مشکوٰۃ المصابیح)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ حیا اور ایمان دونوں باہم ملے ہوئے ہیں تو جب کسی شخص کا ان میں سے ایک اٹھالیا جاتا ہے تو دوسرا بھی فوراً اٹھالیا جاتا ہے۔ (مشکوٰۃ المصابیح)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس چیز میں فحش ہوتا ہے اس کو محیب وار بنا دیتا ہے اور جس چیز میں حیا ہوتی ہے اس کی زینت بڑھاتی ہے۔ (مشکوٰۃ)

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ حیا ایمان کی علامت ہے اور ایمان جنت کا ذریعہ ہے اور بے حیائی گندگی ہے اور گندگی دوزخ کا موجب ہے۔ (مشکوٰۃ)

رسول اکرم ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے حیا داری کا جو نمونہ امت کے سامنے پیش کیا، اس کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اس کنواری لڑکی سے بھی زیادہ حیا ور تھے جو پردہ میں بیٹھی رہتی ہو اگر آپ کسی ایسی چیز کو دیکھتے جو آپ گونا گوار ہوتی تو آپ کثرم کی وجہ سے ناگواری کا اظہار (زبان مبارک



سے باز کرتے، ہم اس کو آپ کے چہرہ مبارک سے مطہر کر لیتے تھے۔ (صحیحین)  
 رسول اللہ ﷺ بھی کوئی نقش یا تذهبان سے نہ نکالتے۔ (صحیح بخاری)  
 رسول اللہ ﷺ عورتوں سے زبانی بیعت لیتے۔ کسی (غیر) عورت کے  
 ہاتھ کو آپ نے بھی ہاتھ نہیں لگایا۔ (صحیح بخاری)

انور المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ  
 ﷺ کو کبھی کسی شخص کے بارے میں کسی برائی کی اطلاع ملتی تو آپ اس کا نام لے  
 کر یہ نہ فرماتے کہ اس نے ایسا کیوں کیا۔ آپ یوں فرماتے کہ لوگوں کو کیا ہو گیا کہ  
 ایسا کہتے ہیں یا ایسا کرتے ہیں۔ شرم و حیا کی وجہ سے ناپسندیدہ کام کرنے والے کا نام  
 نہ لیتے۔ (سنن ابی داؤد)

اگر کوئی خطا کار حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر پشیمانی کا اظہار  
 کرتا اور حق ٹھیکر کی درخواست کرتا تو آپ شرم و حیا سے گردن مبارک جھکا لیتے تھے۔  
 (شمائل کبریٰ بحوالہ ترمذی و حفا)

رسول اکرم ﷺ میں شرم و حیا کی صفت بدرجہ کمال پائی جاتی تھی  
 فی الحقیقت آپ شرم و حیا کا پیکر جمیل تھے۔ کسی کسی پر طعن و تشنیع نہ فرماتے کیونکہ اسے  
 بھی شرم و حیا کے خلاف سمجھتے تھے۔ بازاروں سے گزرتے تو خاموشی سے نظریں نیچے  
 جھکائے چلتے۔ قہقہہ لگا کر کبھی نہ ہنستے۔ ہنسی کے موقع پر بھی اکثر زیر لب ختم ہر اکٹھا  
 فرماتے۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شرم و حیا کا یہ عالم تھا کہ روز بروز بندہ ہونے پر  
 بھی غسل خانے میں اذان نہ اتارتے اور فرماتے بھئی ایسی حالت میں جبکہ کرپائی لینے  
 میں شرم پاتی ہے۔

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ تاریکی میں غسل فرمایا کرتے تھے  
 اس پر بھی فرط حیا سے سیدھے کمرے نہ ہوتے تھے۔

رسول اکرم ﷺ کی ایک صحابیہ حضرت اُمّ غلاؤ رضی اللہ عنہا کے بیٹے

حضرت غلام رضی اللہ عنہ غزوہ بنی قریظہ میں رسول اکرم ﷺ کے ہم پرکاب تھے۔ ایک یہودی عورت نے اپنے مکان کی چھت سے ان پر بھاری پتھر گرا دیا جس کے مدد سے وہ شہید ہو گئے۔ والدہ کو خبر ملی تو اس سانحہ کی تحصیل جاننے کے لیے رسول اکرم ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئیں۔ عقل و خرد پر بجلی گرا دینے والے اس مدد سے کے باوجود انہوں نے اپنے چہرے پر غائب ڈال رکھی تھی۔ بارگاہ نبوی میں جو لوگ حاضر تھے، ان میں سے کسی صاحب نے کہا، اہل بی تمہارا بیٹا کُل ہو گیا ہے نہرت ہے کہ ایسی مصیبت کے وقت بھی تم نے چہرے پر غائب ڈال رکھی ہے؟

حضرت اُمّ غلاظہ نے نہایت اطمینان سے جواب دیا:

”اگر میں نے اپنا بیٹا کھویا ہے تو کیا شرم و حیا بھی کھودوں؟“

اس قسم کے بے شمار واقعات سیرت اور تاریخ کی کتابوں میں ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ملت اسلامیہ میں شرم و حیا اور تحفظِ عزت و ناموس کی قربانوں کی سی قدر و قیمت رہی ہے لیکن افسوس آج جب ہم اپنے اسلامی جمہور پر پاکستان کے ذرائع ابلاغ پر نظر ڈالتے ہیں تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ اللہ اور رسول کے احکام کا مذاق اڑا رہے ہیں اور ساری قوم بالخصوص بڑا بڑا کو شرم و حیا سے عاری بنانے پر محکمے ہوئے ہیں۔ اس معاملے میں سرکاری سرپرستی میں چلنے والا سب سے مؤثر ادارہ پاکستان ٹیلی ویژن پیش پیش ہے اگرچہ ہمارے اکثر قومی اخبار بھی اس کار خیر میں سرگرم نظر آتے ہیں لیکن حیرت ان قومی اخباروں پر ہے جو ایک طرف تو اسلامی نظام کے حامی ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور پی ٹی وی کے اخلاق ہائے پروگراموں کی ضمانت کرتے ہیں اور دوسری طرف اپنے صفحات پر فحش و عیا سے عاری دو شیروں کی مختلف پوزوں میں رنگین تصاویر دھڑا دھڑ چھاپ رہے ہیں اور یوں گیسر کچر کو فروغ دیتے ہیں پی ٹی وی سے بھرپور تعاون کر رہے ہیں صرف یہی نہیں بلکہ اپنے کارکنین کو بے ہودہ اخلاق سود طلبوں کی طرف راغب کرنے اور ان فلوں میں بے حیائی کا مظاہرہ کرنے والے ایکٹروں اور ایکٹریسوں کو عظمت کی مسندوں پر بٹھانے میں بھی

کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کر رہے۔

اسلامی جمہوریہ پاکستان کا ٹیلی ویژن جسے تبلیغی اسلام، تعمیرِ ملت اور اصلاحِ معاشرہ کا سب سے بڑا ذریعہ ہونا چاہیے تھا (اس کے چند دینی اور مطربی پروگراموں کو چھوڑ کر) 'مرد و زن کے آزادانہ اختلاط، بے حیائی و فحاشی اور تہذیبِ مطرب کی آشوب سازانیاں اور برائیاں پھیلانے کا سب سے بڑا آلہ یا ذریعہ بن گیا ہے۔ اس پر قرض و سرود و لہو و لعب، بے انگھم اچھل کود اور فن کے نام پر رقاصاؤں اور شرم و حیا سے عاری مطرب زور و جہانوں اور دوشیزاؤں کا قبضہ ہو چکا ہے۔ پی ٹی وی کو ان کے ناجائز کانوں سے فرصت ملتی ہے تو ان کے اعتراضات چار دیوے جاتے ہیں۔ پاکستان کی نثر اور نثر کو اسلام کے پاکیزہ اخلاق کا حامل بنانے کے بجائے پاپ میوزک، حیا سوز قرض و سرود اور لٹکھو دین کا رسیا بنایا جا رہا ہے۔ پی ٹی وی میں کام کرنے والی ناکھڑاڑکیوں کی حیا کا جو عالم ہے اس کو ایک ایک شرکی زبان ہی سمجھئے:

ہوئیں بے تکلف وہ ٹی وی پہ مجھ سے  
بیش میری بیوی ڈراموں میں اکثر  
جو پہنچا کسی نے مرا ان سے رشتہ  
تو بولیں یہ ہیں میرے منہ بولے شوہر

(ہدایت علی خان ناظم)

پاکستان ٹیلی ویژن کے کرنا دھرتیا پر سے کیسے لوگ ہیں اس لیے یہ تو کوئی بھی حلیم نہیں کر سکا کہ وہ ہمارے قوی نظریہ یا ہماری معاشرتی اور دینی اقدار و روایات سے نا بلند ہیں..... اس لیے لامحالہ یہی رائے قائم کی جاسکتی ہے کہ ان اقدار و روایات کا ایک خاص مشن کے تحت جان بوجھ کر مذاق اڑایا جا رہا ہے۔ یہ مشن کیا ہے؟ اہل ہر بھی معلوم ہوتا ہے کہ "ملت پاکستان کے بدن سے رو بہ لمحہ نکال دو۔" پی ٹی وی کے تقریبی پروگراموں کو دیکھ کر کسی بھی وطن اور درویش پاکستانی کے ذہن میں یہ سوالات پیدا ہو سکتے ہیں۔

- ۱۔ کیا کنواری نوجوان لڑکیوں کا غیر عزم نوجوانوں کی محدود یا محدودیت اور زندگی کی کیفیت سے گزر کر بچوں کی ماں بننا اسلامی روایات کے مطابق ہے؟ جن گھرانوں کی یہ لڑکیاں ہیں وہ کس تہذیب کے نظم بردار ہیں؟
- ۲۔ کیا ہماری معاشرتی روایات بھی ہیں کہ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں آپس میں معاشرے لڑاتے پھریں اور ایک دوسرے سے تہائی میں غصہ ملاقاتیں کریں؟ آخر بیٹی دی اپنے ذرا سوں میں خزانوں کو کس چیز کی تربیت دے رہا ہے؟
- ۳۔ کیا باپ سگرنو جوانوں کو تنگ تنگ کر چلتے کودتے (اپنی ٹانگوں کو شرمناک انداز میں حرکت دیتے) یا بھنگڑا لاتے ہوئے ارضی پاک کی کسی (حیا سے عاری) بیٹی کو مخاطب کر کے انتہائی فحش اور لہر گیت گاتے ہوئے دکھانا اسلامی یا پاکستانی معاشرت کی عکاسی ہے؟
- کیا ان نوجوانوں اور ان کے سامنے آنے والی دو شیرازوں کو شرم و حیا سے کوئی نسبت ہے؟
- ۴۔ کیا اسلام کی خطیوں کو بنی نہیں کراٹھ پر آنا، گانا، ناچنا، تھرکنا، بھاگنا اور فحش گیت گانا کرکوں کے سٹلی جذبات کو بھڑکانا اسلامی روایات کی عکاسی کرتا ہے یا تزیین جہلیہ کی؟
- ۵۔ کیا راگ رنگ کے مخلوط اجتماعات دکھانا اور ان میں شوقین مزاج نوجوان عورتوں کا فحش گیتوں پر بے تحاشا تالیاں بجانا اور "اسلام کے نوجوان لا ایالی فرزندوں" کا ناچ ناچ کر ایسے گیتوں کی دہرانا، اسلامی معاشرت کی عکاسی ہے؟
- ۶۔ کیا بچوں کے پروگراموں میں وطن عزیز کی کم سن بچیوں کو ناچ گانے کی تعلیم دینا ہمارے قومی نظریہ کے مطابق ہے؟
- ۷۔ کیا پاکستان کے نوے فی صد گھرانوں کو اس گھبر پھرے کوئی نسبت ہے جو بیٹی دی پر تسلسل کے ساتھ فحش کیا جا رہا ہے؟
- ۸۔ کیا بلوڑے گھر، چنگ باز بھانا، ان گڈی گڈی سے دی ملاقات اسے وغیرہ

جیسے شرمناک اور کنوارے دو، اور مائی گاؤ وغیرہ جیسے لغو ذرائع پاکستانی معاشرت کے عکاس ہیں؟

کاش ہمارائی وی اپنے نوجوانوں کو گانے ناچنے کا رسیا بنانے کے بجائے حیدر و خالد کا ہاشمین بننے اور اپنی نوجوان بہنوں اور بھٹیوں کو نور جہاں اور شازیہ منظور بننے کے بجائے عائشہ صدیقہؓ اور زہرا بتولؓ کے نقوش قدم پر چلنے کی توفیق دے۔

### حدیث نبویؐ

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص تم سے کوئی برا کام دیکھے، اس کو ہاتھ سے روکے، اگر ایسا کرنے کی طاقت نہ ہو تو زبان سے منع کرے اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو دل میں برا سمجھے اور یہ ضعیف زرا ایمان ہے۔

(مشکوٰۃ شریف)

### حدیث نبویؐ

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جب ان کو یمن کی طرف روانہ کیا تو بھیمت فرمائی کہ: معاذ! آرام طلبی اور خوش بھیش سے بچتے رہنا، اللہ کے خاص بندے آرام طلب اور خوش بھیش نہیں ہوا کرتے۔

(مسند احمد)

## رزقِ حلال کی برکتیں

اسلام میں رزقِ حلال کے حصول اور اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق اس کے استعمال پر بڑا زور دیا گیا ہے۔ قرآن حکیم اور احادیث نبویؐ میں پاک چیزیں اور حلال رزق کھانے کی جاہل تلقین کی گئی ہے اور اس کو نہ صرف اطمینان و سکون اور برکتوں کا باعث بتایا گیا ہے بلکہ اللہ کی خوشنودی اور آخرت میں کامیابی کی نگینہ بھی قرار دیا گیا ہے۔ اس کے برعکس حرام مال کو سخت محسوس اور بد انجامی کا باعث بتایا گیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے۔

طَلَبُ مَحَلِّ الْخَلَالِ فَرِيضَةٌ تَقْلِبُ الْفَرِيضَةَ

یعنی رزقِ حلال حاصل کرنے کی کوشش اور نگر فرض کے بعد فریضہ ہے۔ (نسب و ریح)۔ اس حدیث پاک کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کے اولین اور بنیادی ارکان و فرائض یعنی اللہ اور رسولؐ پر ایمان، نماز، زکوٰۃ و طہرہ کے بعد رزقِ حلال حاصل کرنے کی کوشش بھی ہم پر فرض ہے۔ جس طرح ظاہری نکاح، پاکیزہ لباس اور جسمانی طہارت سے حاصل ہوتی ہے اسی طرح قلبی آسودگی اور باطنی پاکیزگی رزقِ حلال کی بدولت نصیب ہوتی ہے۔ حلال رزق وہی ہے جو جائز طریقے سے حاصل کیا گیا ہو خواہ زراعت سے حاصل ہو یا تجارت سے، ملازمت سے دستیاب ہو یا محنت مزدوری سے، اصحاب کے ہر یہ کی صورت میں ملے یا کسی اور جائز ذریعے سے منجر آئے اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا جس شرط یہ ہے کہ کسب رزق کے لیے جو طریقہ بھی اختیار کیا جائے اس میں فریب مگر چوری جھوٹ اور عاکی آمیزش نہ ہو کہ گناہی آمیزش سے رزقِ حرام ہو جاتا ہے، اس کے استعمال سے قلب سیاہ ہو جاتا ہے اور عاقبت برباد ہو جاتی ہے۔ ایک شخص فریب ہے مگر ناجائز طریقے سے رزق حاصل کرنا اسے پسند نہیں

تو اسے ایک ایسی دولت حاصل ہو جاتی ہے جس کا بدلہ دوزخ و جہنم کے عیسوں ادا بھی نہیں ہو سکتے اس دولت کا نام ہے "الطمینان قلب" جو خدا کا دوزخ و جہنم سے دل کو کمانے والے کسی شخص کو بھی حاصل نہیں ہو سکتی۔ شہید احمد میں حضرت چار بن عبد اللہ انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ وہ گوشت اور وہ جسم ہلکے میں نہ جائے گا جس کی نشو و نما حرام مال سے ہوئی ہو۔ شہید احمد علی کی ایک اور روایت میں آنحضور ﷺ کا یہ ارشاد نقل کیا گیا ہے کہ ایسا نہیں ہوتا کہ کوئی بندہ حرام مال کمانے لگے اس میں سے بڑھ صدقہ کرے تو اس کا صدقہ قبول ہو اور اس میں سے خرچ کرے تو اللہ کی طرف سے اس میں برکت ہو اور جو شخص حرام مال اپنے پیچھے چھوڑ کر جائے گا تو وہ اس کے لیے جہنم کا قوس ہوگا یقیناً اللہ تعالیٰ بدی کو بدی سے نہیں مٹاتا بلکہ بدی کو نیکی سے مٹاتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ گندگی کو گندگی نہیں دھو سکتی، مطلب یہ کہ صدقہ و خیرات اور اہل و عیال پر خرچ اگر صحیح اور حلال رزق سے ہو تو وہ گنہگاروں کا کفارہ اور مغفرت کا وسیلہ بن جاتا ہے لیکن حرام مال سے جو صدقہ کیا جائے وہ نجس اور نا پاک ہوگا اور بارگاہ الہی میں ہرگز قبول نہ ہوگا۔ بڑی کمانے کے لیے جو بھی طریقہ اختیار کیا جائے اس کی بنیاد چٹائی اور ایمانعداری پر رکھنا ضروری ہے۔ سچائی اور ایمانعداری کے ساتھ کاروبار کرنے والے تاجر کا اسلام میں جو بڑھ مقام ہے اس کا اندازہ جامع ترمذی میں رسول اکرم ﷺ کے اس ارشاد مبارک سے کیا جاسکتا ہے:

النَّاجِرُ الصَّدُوقِي الْأَمِينُ مَعَ النَّسْتِ وَالْفَقِيرِ يَتَّقِنُ وَالشُّهَدَاءِ

یعنی پوری سچائی اور ایمانعداری سے کاروبار کرنے والا تاجر آخرت میں نیچوں،

صدیقوں اور شہیدوں کے ساتھ ہوگا۔

تحصیلی رزق کے ذرائع میں حضور ﷺ نے سب سے اچھے دو ذرائع

قرار دیے ہیں، ہاتھوں کی محنت (یعنی دستکاری، صنعت و حرفت، محنت مزدوری وغیرہ)

اور تجارت۔

حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے دریاخت کیا گیا کہ یا رسول اللہ کوئی کھائی زیادہ پاک اور اچھی ہے؟ آپ نے فرمایا کہ آدمی کا اپنے ہاتھ سے کوئی کام کرنا اور ہر تجارت جو پاکبازی کے ساتھ ہو۔

(مسند احمد)

حصولِ رزق کے لیے کسی قسم کی متعین سازی، قریب کاری یا بددیانتی سے انحصار ﷺ کو اس قدر نفرت تھی کہ آپ کیا کرنے والے سے نطفن کوئی تعلق رکھتا پسند نہیں فرماتے تھے۔ ایک دن آپ بازارِ حریف لے گئے۔ ایک دکان کے سامنے ٹھیکہ دار کو حیرت و غصہ کے لیے پڑا تھا۔ حضورؐ نے اپنا وسیع مبارک اس و حیر کے اندر والا تو بچے کچھ تری محسوس ہوئی۔ آپ نے غصہ بھردارے باہر نکالے تو دیکھا کہ وہ جھپٹے تھے۔ آپ نے دکاندار سے پوچھا، یہ کیا معاملہ ہے؟ اس نے عرض کیا، یا رسول اللہ! یہ دانے بارش میں بھیگ گئے تھے۔ آپ نے فرمایا تو تم نے ان کو حیر کے اوپر کیوں نہ رکھا تا کہ خریدنے والا ان کو دیکھ لے۔ ایک مسلمان کا یہ کام نہیں کہ وہ کسی کو دھوکا دے۔ مَنْ خَفَا فَلْيَسْجُنْ بِنَا یعنی جو کسی کو دھوکا دے ہو ہم میں سے نہیں ہے۔ ایک اور حدیث میں آپؐ نے فرمایا ہے کہ جس نے کوئی عیب دار چیز فروخت کی اور خریدار سے اس کا عیب چھپایا، اس پر ہمیشہ اللہ کا غضب رہے گا۔ حرام کی کھائی سے نہ صرف عاقبت برباد ہو جاتی ہے بلکہ دنیا بھی تباہ ہو جاتی ہے۔ حرام مال سے پٹنے والی اولاد انسان کے لیے وبال بن جاتی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ارشادِ نبویؐ کے مطابق حرام کھانے والے کی دعا قبول نہیں ہوتی خواہ وہ کہے کا پروا پکڑ کر کرے گویا وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور کرم سے محروم ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس رزقِ حلال کھانے والے پر اللہ کی رحمتیں بارش کی طرح برتی ہیں۔ اس کے کاروبار اور مال میں برکتیں ہوتی ہیں۔ اس کو اطمینانِ قلب کی نعمت عظمیٰ حاصل ہوتی ہے اس کی دعا اس کو حق تعالیٰ شرفِ قبولیت عطا ہے، دنیا میں بھی اس کو عزت عطا کرتا ہے اور آخرت میں بھی اس کے لیے جنت کا وعدہ ہے۔



جس طرح رزقِ حلال کا حاصل کرنا ہم پر فرض ہے اسی طرح اولاد کی عمرہ طریقے سے پرورش اور تربیت کرنا بھی ہمارے فرائض میں داخل ہے۔ رزقِ حلال اور اولاد کی پرورش و تربیت کا آپس میں گہرا تعلق ہے کیونکہ انسان جو کچھ کماتا ہے وہ بنیادی طور پر اپنی اور اپنے اہل و عیال ہی کی پرورش کے لیے کماتا ہے۔ اگر وہ رزقِ حلال سے اپنی اولاد کی پرورش کرتا ہے تو اسے اتنا ہی ثواب ہوگا جتنا اللہ کی راہ میں صدقہ و خیرات دینے سے ہوتا ہے۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ تم اپنی بیوی کے منہ میں جو قلم ڈالتے ہو اللہ تعالیٰ اس کا ثواب صدقہ کے برابر دے گا۔ اس حدیث کا اطلاق اولاد پر بھی ہوتا ہے کہ بیوی کی طرح اس کی پرورش بھی ہمارے ذمہ ہے اس کے برعکس اگر اولاد کی پرورش حرام مال سے کی جائے تو وہ انسان کے لیے وبال بن جاتی ہے اور اولاد پر اس کے بہت برے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ قرآن پاک میں مال اور اولاد کو انسان کے لیے آزمائش قرار دیا گیا ہے۔ سورۃ الانفال میں ارشاد ہوا ہے:

اِنَّمَا اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ (آیہ ۲۸)

یعنی جان رکھو کہ تمہارا مال اور تمہاری اولاد بڑی آزمائش ہے

سورۃ النعائم میں فرمایا گیا ہے:

اِنَّ مِنْ اَرْوَاحِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ غِلُوْا لَكُمْ فَا خَذَرُوْهُمْ (آیہ ۱۴)

یعنی تمہاری بیویوں اور اولاد میں سے بعض تمہارے دشمن ہیں ان سے ہوشیار رہو۔

اس آیت سے بچنے اور آزمائش میں پورا اترنے کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ اولاد کی خاطر حرام اور ناجائز ذرائع سے مال نہ کمایا جائے۔ حرام مال کمانے والا نہ اپنا خیر خواہ ہے اور نہ اپنی اولاد کا۔ اس کی اپنی عاقبت تو یقیناً برباد ہوگی اولاد کے حق میں اس کی کوئی دعا بھی قبول نہ ہوگی۔ اولاد کی حقیقی خیر خواہی یہ ہے کہ اس کی پرورش رزقِ حلال سے کی جائے اور ساتھ ہی اس کی عمرہ تربیت میں بھی کوئی کسر اٹھانہ ہوگی جائے حلال کی نگرانی سے بچوں کی پرورش اور تربیت میں یقیناً برکت ہوگی۔ شیخ ابن ماجہ میں

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، اپنی اولاد کا اکرام کرو اور اچھی تربیت کے ذریعے ان کو خُشن ادب سے آراستہ کرو۔

حضورؐ کے اس ارشاد پر غور کریں تو ہمارا ضمیر گواہی دے گا کہ اولاد کا اکرام حقیقی معنوں میں اسی طرح ہو سکتا ہے کہ ان کی پرورش حلال کی کمائی سے کی جائے۔ اس بات پر ہمارا پختہ ایمان ہونا چاہیے کہ کسب حلال ہمارے اپنے لیے بھی اور ہماری اولاد کے لیے بھی دنیا اور آخرت میں بھلائی کا موجب ہوگا۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کو ہمیشہ رزقِ حلال کمانے کی توفیق دے۔ (آمین)



## جس سے مشورہ کیا جائے وہ ایمان ہے

بائیں مٹھاؤ زنت کو اسلام میں اس قدر اہمیت حاصل ہے کہ قرآن حکیم کی ایک سورہ کا نام ہی الشوری یعنی مشورہ یا صلاح ہے۔ اگر کسی شخص کو اخلاقی طور پر کوئی ایسا وجہیہ اور مشکل معاملہ پیش آ جائے جس سے عہدہ برآ ہونے کی کوئی صورت نظر نہ آئے تو اس کے لیے مناسب اور بہتر یہی ہے کہ اپنے کسی خیر خواہ سے مشورہ کر لے۔ اخلاقی معاملات میں مٹھاؤ زنت کو بہتر اور مناسب ہی کہا جاسکتا ہے۔ بہت اجتماعی معاملات میں تو مٹھاؤ زنت کو نہ صرف اسلامی طرز زندگی کا ایک اہم ستون قرار دیا گیا ہے بلکہ اسے اہل ایمان کی بہترین جہلات میں شمار کیا گیا ہے جیسا کہ سورہ الشوری کی آیات ۳۸، ۳۹ میں ارشاد ہوا ہے:

”جو کچھ اللہ کے ہاں ہے وہ بہتر بھی ہے اور پائیدار بھی وہ ان لوگوں کے لیے ہے جو ایمان لائے ہیں اور اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں جو بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے پرہیز کرتے ہیں اور اگر غصہ آ جائے تو درگزر کر جاتے ہیں، جو اپنے رب کا حکم مانتے ہیں اپنے معاملات آپس کے مشورے سے چلاتے ہیں، ہم نے جو کچھ انہیں دیا ہے اُس میں سے خرچ کرتے ہیں۔“

سورہ آل عمران میں رسول اکرم ﷺ کو حکم دیا گیا ہے **خُذُوا مِنْ دُونِ** جس الاصل ”یعنی اسے نبی! دین کے کاموں میں ان لوگوں (یعنی اپنے اصحاب) کو بھی شریک مشورہ رکھا کریں۔ یعنی اجتماعی معاملات میں مشورہ سے کام چلاؤ ایک دینی حکم ہے یہی مشورہیت، جمہوریت کی روح ہے۔ اس کے بغیر اجتماعی کام چلاؤ اللہ کے صالح احکام کی صریح خلاف ورزی ہے اور اس سے کسی اچھے نتیجے کی توقع رکھنا

۱۔ البتہ ائمہ شیعی سے بعید ہے۔ اب رہی یہ بات کہ جس سے مشورہ کیا جائے اس پر کیا فرض عائد ہوتا ہے تو اللہ کے رسول ﷺ نے یہ بات ہمیشہ کے لیے طے کر دی ہے۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا ہے کہ جس شخص سے مشورہ کیا جائے وہ اس بات کا وعدہ اور ادا کرنا ہے کہ جس کی مشورہ دے اور خائن ہے وہ شخص جس نے اپنے مشورہ طلب کرنے والے کو غلط مشورہ دیا۔ گویا دانائے کونین ﷺ نے مشورہ کو امانت اور جس سے مشورہ طلب کیا گیا اس کو امانت قرار دیا ہے۔ "امین" اس معنی میں کہ اس پر بھروسہ کر کے اس سے مشورہ طلب کیا گیا ہے اس لئے اس کے لیے کج مشورہ دینا اسی طرح ضروری ہے جس طرح مال و متاع کے امان کے لیے مال و متاع کی امانت پوری دیانت کے ساتھ تنجیبہ و انکس کرنا۔ سورۃ بقرہ میں امانت اور امان کے بارے میں ارشاد ہوا ہے۔

لَا تَأْمِنُ بِنَفْسِكَ نَفْسًا لِلْيَوْمِ الَّذِي أُولَئِكَ أَعْتَدَتْ لَهُمْ سَعِيرًا

(آیہ ۸۳)

"یعنی اگر تم میں سے کوئی شخص دوسرے پر بھروسہ کر کے اس کے ساتھ کوئی معاملہ کرے تو جس پر بھروسہ کیا گیا ہے اس سے چاہے کہ امانت ادا کرے اور اللہ سے ڈرے جو اس کا ذمہ ہے۔"

علامہ اسلام کے نزدیک وہ غلط مشورہ امانت میں خیانت سمجھا جائے گا جو جان و مال کو نقصان پہنچاتے ہوئے بھی دیا گیا ہو۔ ایسے غلط مشورے کو امانت میں خیانت نہیں سمجھا جائے گا جو نیک فتنی کے ساتھ کج سمجھ کر دیا گیا ہو لیکن احکامات کی عقلی، مطہرات کی نیک یا کسی اور وجہ سے غلط ثابت ہوا ہو۔

امانت دہی کا حق ادا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کا حکم یہ ہے:

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا ۝ (نہی اسرائیل آیہ ۳۶)

"یعنی کسی دیکھ بھج کے پیچھے نہ لگا کر جس کا ہمیں علم نہ ہو چیز یا کلمہ کان اور دل سب ہی کی بابت میں ہونی ہے۔"

مفسرین نے اس آیت کی تخریج کرتے ہوئے لکھا ہے کہ بعض مکالمات یا محاورے یا جملے جو کوئی دے گا میں دینی چاہیے بلکہ اس چیز کے بارے میں پوری معلومات حاصل کرنے کے لیے وہ وقت کار لوگوں سے مشورہ کرتا چاہیے تاکہ مشورہ طلب معاملہ کے تمام پہلو سامنے آجائیں لیکن یہ مشورہ **اِئْتِمُوا بِمَا يُخْلَصُونَ** "یعنی مکتوب یا زیادتی" کے لیے نہیں ہوتا چاہیے بلکہ تنگی بھلائی اور تنگی (یعنی پرہیزگاری یا احکام الہی کے مطابق زندگی گزارنے) کے لیے ہونا چاہیے جیسا کہ سورہ نحل میں فرمایا گیا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا قَاتَيْتُمْ فَلَا تَقَاتُوا بِلِئَالِيكُمْ وَالْعُلُوِّ

وَالْعَنِيتِ الرُّسُولِ وَتَنَاجَوْا بِالْهَرِّ وَتَقْوَى مَا (آیہ: ۹)

"یعنی اے لوگو! جو ایمان لائے ہو جب تم آپس میں پوشیدہ بات کرو تو گناہ اور زیادتی اور رسول کی نافرمانی کی باتیں نہیں بلکہ تنگی اور تقویٰ کی باتیں کرو۔"

مثلاً بعض لوگوں کے ذہنوں میں یہ خیال پیدا ہو کہ مشورہ تو مشورہ ہوتا ہے اسے امانت کا درجہ کیسے حاصل ہو گیا۔ ان اصحاب کو معلوم ہونا چاہیے۔۔۔ کہ امانت ایک وسیع المفہوم لفظ ہے اور قرآن حکیم کی جہ آنتوں میں مختلف مواقع پر استعمال ہوا ہے۔ یہ آیتیں سورہ بقرہ، سورہ آل عمران، سورہ انفال، سورہ مؤمنون اور سورہ نساء میں درج ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ امانت نہ صرف روپے پیسے یا کسی خاص مادی شے کی نہیں ہوتی بلکہ اللہ اور اللہ کے رسول کے احکام بھی ایک مسلمان کے لیے امانت کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کی خلاف ورزی کرنا امانت میں خیانت کرنے کے مترادف ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص آپ پر مہر و سار کے رازداری کے ساتھ کسی معاملے میں مشورہ طلب کرتا ہے تو یہ بھی امانت ہے اس کو دوسروں کے سامنے فاش کرنا امانت میں خیانت کے مترادف ہے ہاں یہ ضرور دیکھ لینا چاہیے کہ اس میں کوئی نحر ہوا گناہ کی بات نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے

لَقَدْ خَلَقْنَا لَكُمْ فِي رُسُولِ اللَّهِ أَمْرًا خَيْرًا

فرمایا کہ حضور ﷺ کی ذمہ داری کو اللہ کے لیے بہت نیک کام ہے۔ آپ

کی حیات اطہر پر ایک نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ آپ اجتماعی معاملے میں فیصلہ کرنے کا اختیار مطلق رکھنے کے باوجود صحابہ کرام سے مشورہ کرنے کے بعد اپنا فیصلہ صادر فرماتے تھے۔ خلفائے راشدین کا بھی یہی طریقہ عمل رہا اور آج بھی اسی طریقہ عمل کو اپنانے کی ضرورت ہے کیونکہ انہی مقدس ہستیوں کا اجتہاد ہماری فلاح اور نجات انفرادی کا ضامن ہے۔

☆ ☆ ☆

۱۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی شخص اپنے بھائی سے مشورہ طلب کرے تو اسے چاہیے کہ اسے نیک مشورہ دے۔

(ابن ماجہ باب استخارہ من)

۲۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص حق سے مشورہ لے تو اس کو نیک مشورہ دے اگر تو نے ایمان کیا تو امانت میں خیانت کی۔

(مسند امام اعظم کتاب صلوٰۃ)

## قناعت

(ایک لازوال خزانہ ہے)

قناعت کے معنی ہیں کہ انسان اشیائے خود و فروش میں صرف اشیائے ضروریہ پر اکتفا کرے اور مال جمع کرنے کی ہوس میں جھلا نہ ہو، دوسرے لفظوں میں اللہ تعالیٰ نے اس کو جو کچھ دے رکھا ہے اس پر راضی رہے، اپنے خالق کی دی ہوئی نعمتوں کا شکر ادا کرتا رہے۔ اپنے دل سے لافچی اور حسد کو نکال دے۔ دوسروں کے زیادہ مال سامان اور جائیداد وغیرہ کو نہ کچھ کر ہرگز نہ ٹوٹے، ہاں اگر اپنی محنت اور جائز طریقے سے زیادہ مال یا دوسرا سامان راحت ملتا ہے تو اس کو اللہ تعالیٰ کا انعام سمجھے اور حقوق اللہ کے ساتھ حقوق العباد کے ادا کرنے میں بھی غفلت نہ کرے۔ قناعت کی نسبت ایک حدیث میں آیا ہے:

”الْفَقَاةُ مَخْمُورٌ لَا يَهْلِي“ یعنی قناعت ایک خزانہ ہے جو کبھی خالی نہیں ہوتا ہے۔ فی الحقیقت قناعت اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ بہت بڑی نعمت ہے۔ بعض کے نزدیک اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو نعمتیں دے رکھی ہیں قناعت ان میں سب سے بڑی نعمت ہے اور اگر اسے سب سے بڑی نعمت کے بجائے عام نعمت ہی سمجھا جائے تو بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ انسان کو قناعت سے بڑھ کر کوئی چیز سکون اور اطمینان دیتا نہیں کر سکتی۔ قناعت نہ کرنے والے لوگ ہمیشہ اس فکر میں جھک رہتے ہیں کہ ان کو زیادہ سے زیادہ دولت مل جائے، زیادہ سے زیادہ سہولتیں اور آرام میسر ہو۔ اس کے لیے وہ ہر جائز اور ناجائز طریقہ استعمال کرتے ہیں۔ یہ لوگ سکون کی نعمت سے محروم ہو جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ان کو جو نعمتیں عطا کر رکھی ہیں، وہی مال ان کو ان نعمتوں کو شکر ادا کرنے کا فرض بھی ہوا نہیں کرنے دیتی۔ وہ ہمیشہ پریشان رہتے ہیں۔ ان کے پاس خواہ کتنی ہی دولت جمع ہو جائے دنیا کے مال اسباب کے کتنے ہی

ڈھیر لگ جائیں، ان کو سکون اور اطمینان نصیب نہیں ہوتا بلکہ ان کی حرص اور پریشانی میں اضافہ ہی ہوتا جاتا ہے۔ شیخ سعدی رحمت اللہ علیہ نے کیا خوب کہا ہے

گفت چشم تنگ دنیا دوست را  
باقا عت نہ کند یا خاک گور

یعنی دنیا کو دوست رکھنے والے آدمی کی تنگ آنکھ یا قوتِ عت بھرتی ہے یا پھر قبر کی مٹی۔ تشریح اس قول کی یہ ہے کہ ایک دنیا دار انسان کو قوتِ عت اختیار کر کے ہی سکون و اطمینان جینا آسکتا ہے ورنہ دوسرے دم تک حرص (یا آسودگی اور پریشانی) کی آگ میں جلا رہے گا۔

اگر ہم اپنے معاشرے میں پھیلی ہوئی برائیوں پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ ہماری بیشتر خرابیوں کا سبب مال و دولت کی محبت ہے۔ اس محبت میں جکڑا دنیا پرست لوگوں پر رات دن یہی ذہن سوار رہتی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ مال و دولت، دنیاوی فوائد و لذت اور جاہ و اقتدار حاصل کر لیں۔ اس ذہن میں نہ ان کو حقوق اللہ کا پال رہتا ہے نہ مخلوق اعلیٰ کا یہاں تک کہ موت ان کے دوزخ سے پر آدمی تک دیتی ہے اور وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اپنی ”محبوب“ دنیا سے کوچ کر جاتے ہیں۔ قرآن حکیم کی سورۃ النفاث میں ایسے لوگوں کو اس طرح نکال کر طے کیا گیا ہے۔

ترجمہ ”تم لوگوں کو زیادہ سے زیادہ ایک دوسرے سے بڑھ کر دنیا حاصل کرنے کی ذہن نے غفلت میں ڈال رکھا ہے یہاں تک کہ (اسی فکر میں) تم لوگ گور تک پہنچ جاتے ہو۔ ہرگز نہیں، مغربِ تم کو معلوم ہو جائے گا پھر (سن لو) ہرگز نہیں، مغربِ تم کو معلوم ہو جائے گا، ہرگز نہیں، اگر تم یقینی علم کی حیثیت سے (اس روش کے انجام کو) جانتے ہو تو تمہارا یہ طریق عمل نہ ہو تا تم دوزخ کو کچھ کر دو گے، پھر (سن لو کہ) تم یقین کے ساتھ اس کو دیکھ لو گے۔ پھر ضرور تم سے ان فتنوں کے بارے میں جواب پوچھی ہوگی۔“

مفسرین نے اس سورۃ مبارکہ کے فوائد (تفسیری نکات) بیان کرتے



ہوئے کھسا ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو اس دنیا پرستی (قامت نہ کرنے بلکہ کفرانِ نعمت) کے نہرے انجام سے خبردار کیا گیا ہے جو ان کو نہ اپنے خالق و مالک کا دھیان آنے دیتی ہے اور نہ آخرت کی فکر کرنے دیتی ہے۔ ان کو مال و دولت اور دنیا کے ساز و سامان کی حرص غفلت میں پھنسانے رکھتی ہے، حرص و ہوا ان کو ہر وقت اس فکر میں جکارت رکھتی ہے کہ جس طرح میں پڑے ہمارے پاس مال و دولت کی بہتات ہو اور ہمارا تکیہ اور ہمتادوسرے سب کنیوں اور جنسوں پر غالب ہو۔ یہ پردہ غفلت کا نہیں اٹھتا یہاں تک کہ موت آجاتی ہے تب قبر میں پہنچ کر پتا چلا ہے کہ سخت غفلت اور بھول میں پڑے ہوئے تھے وہ تو محض چند روز کی جاہل پہل تھی موت کے بعد وہ تمام مال و دولت اور ساز و سامان بچ بچہ و بالی جان ثابت ہوئے۔ اس سورۃ میں لوگوں کو بار بار حجتہ کیا گیا ہے کہ تمہارا یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ مال جاکدا اور دنیوی ساز و سامان وغیرہ میں دوسروں سے بڑھ جانا ہی کامیابی ہے اور یہی کام آنے والی چیز یہ ہیں، مغربِ تم کو معلوم ہو جائے گا کہ تم ساری عمر تقویٰ بڑی غلطی میں جکارت رہے اگر تم جتنی طور پر اس بات کو جان لیجے کہ آخرت کے مقابلے میں دنیا کے سب سامان بچ ہیں تو ہرگز اس غفلت میں نہ پڑے رہتے۔ اس غفلت اور کفرانِ نعمت کا نتیجہ دوزخ ہے وہ تم کو یقیناً دیکھنا پڑے گا۔ یومِ حساب کو تم سے ضرور پوچھا جائے گا کہ جو نعمتیں (ظاہری و باطنی، جسمانی و روحانی) کو دنیا میں تمہیں عطا کی گئی تھیں ان کا حق تم نے کیا ادا کیا اور منعم حقیقی کو راضی کرنے کی کہاں تک سعی کی۔

جس دنیا پرستی کی اس قدر مذمت کی گئی ہے اس کا علاج قامت اور صرف قامت ہے۔ یہ ایک ایسی اخلاقی اور روحانی صفت ہے جو حرص اور حسد جیسی مہلک روحانی بیماریوں سے محفوظ رکھتی ہے۔ قانع (قامت کرنے والا) ہر حال میں اللہ کی رضا پر راضی رہتا ہے جو کچھ اس کو میسر ہے وہ اسی پر صابر و شاکر رہتا اور دوسروں کو اللہ تعالیٰ نے جو کچھ دیا ہے وہ اس کے پاس سے اللہ کی عطا کردہ نعمتیں ذرا کم ہونے کی ترغیب نہیں کرتا اور نہ اپنے سے آسودہ حال کی لوگوں سے حسد کرتا ہے۔ قامت کی ایک

اور خوبی یہ ہے کہ یہ قانع آدمی کو گدائی یا دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی ذلت سے بھی محفوظ رکھتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انسانی زندگی میں بعض اوقات ایسی ناگزیر صورتیں یا ضرورتیں پیش آجاتی ہیں جب ایک انسان کو دوسرے انسان کا دست نگر ہونا پڑتا ہے لیکن خودداری اور حمیت کا تقاضا یہ ہے کہ انسان جہاں تک ممکن ہو اپنے دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے گریز کرے۔ رسول اللہ ﷺ اس بات کو سخت ناپسند کرتے تھے کہ کوئی شخص بغیر شدید ضرورت کے دوسرے کے سامنے سب سوال دراز کرے آپ صرف تین قسم کے آدمیوں کے لیے دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلاتا جائز سمجھتے تھے ایک وہ جو قرض کے پوچھ تلے ڈب گیا ہو دوسرا وہ جس پر کوئی ناگہانی مصیبت آجائے اور اس کا مال و اسباب ہر یاد ہو جائے تیسرا وہ جو فاقہ میں مبتلا ہو اور محلے کے تین آدمی شہادت دیں کہ وہ فی الواقع فاقہ سے ہے۔ ان کے علاوہ جو کوئی مانگ کر حاصل کرتا ہے وہ حرام کھاتا ہے۔

قناعت کا یہ مفہوم قطعاً نہیں ہے کہ آدمی ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ جائے رزق حلال کے حصول کے لیے محنت اور سعی و کوشش کرنا بالکل جائز ہے اپنی حلال کی آمدنی میں جائز طریقے سے اضافہ کرنا قناعت کے منافی نہیں۔ دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض لوگوں کے پاس کثیر دولت، عالی شان مکان، آرام و سواری، عمدہ لباس اور دوسری تمام آسائشیں موجود ہیں اس کے باوجود وہ غیر مطمئن اور پریشان رہتے ہیں۔ اس کے برعکس جس شخص کا دل لالچ، حرص، طمع اور حسد سے خالی ہے اور وہ ہر حال میں صبر اور شکر کرتا ہے اس کو روحانی سکون اور اطمینان حاصل ہوتا ہے اس کا اندازہ وہی شخص کر سکتا ہے جس کو قناعت کی نعمت میسر ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو قناعت کی نعمت عطا فرمائے۔

# اسلام کا عائلی نظام

خاوند اور بیوی کے علاوہ دیگر رشتہ داروں کی اہمیت

اسلام میں طہارت ہے اور اس نے نئی نوع انسان کو ایک ایسا رابطہ حیات دیا ہے جو انسانی زندگی کے ہر شعبہ اور ہر پہلو کا نہایت مکمل ان انداز میں احاطہ کرتا ہے اور ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کی طرف رہنمائی کرتا ہے جو باہمی اصلاح، کفایت و نفاذ، مساوات، عدل و انصاف اور امن و سکون کا گہوارہ ہو۔ اسلام کو ماننے والے ہر فرد کا اس بات پر کمال ایمان ہے کہ قرآن حکیم میں اسلامی ضابطہ حیات کے خود خدخال طور بنیادی اصول واضح طور پر بیان کر دیے گئے ہیں۔ خاتم الانبیاء و المرسلین ﷺ نے ان پر عمل کر کے اپنے انوارِ خداداد کا جو ثمرہ اعلیٰ ایمان کا سامنے پیش کیا، دنیا اور آخرت میں کامیابی کا انحصار ہی پر عمل کرنے میں ہے۔

آنحضور ﷺ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو ہدایت، پیغام یا تعلیم لے کر مبعوث ہوئے اس کے بنیادی طور پر دو حصے ہیں، ایک کا تعلق مخلوق اللہ سے ہے، ان مخلوق میں ایمان، توحید، خالص، ذکر و شکر اور ہر قسم کی عبادت شامل ہیں۔ دوسرے کا تعلق مخلوق العباد سے ہے۔ ان مخلوق کی دو قسمیں ہیں۔ ایک کا تعلق معاشرتی احکام و آداب سے ہے مثلاً شوہر کا بیوی سے، بیوی کا شوہر سے، وھذین کا اولاد سے، اولاد کا وھذین سے، قرہین اور ذور کے رشتہ داروں کے ساتھ، ہمسایوں کے ساتھ، زیر دستوں کے ساتھ اور عام مخلوق کے ساتھ کیسا میرتاؤ اور ذوقیہ ہونا چاہیے اور ان کے ایک دوسرے پر کیا حقوق ہیں۔

دوسری قسم کے مخلوق العباد کا تعلق معاملات سے ہے یعنی تجارت، زراعت، قرض و امانت، خرید و فروخت، ہتہ، وصیت، مالی لین دین، وغیرہ اس وقت ہماری گفتگو کا موضوع مخلوق العباد کی پہلی قسم سے ہے اس کا جامع عنوان

”معاشرت“ ہے۔ جس کا ایک نہایت اہم پہلو اسلام کا عائلی نظام ہے۔ عام طور پر عائلی سے مراد شادی بیاہ نکاح طلاق وغیرہ جیسے امور رہے جاتے ہیں لیکن فی الحقیقت اس کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ اس نظام میں میاں بیوی کے باہمی تعلق کے علاوہ خاندان کے نزدیک اور دوسرے کے دوسرے رشتہ داروں کو بھی خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس میں خاوند یا بیوی کے رشتے داروں کی قطعاً کوئی تخصیص نہیں۔ میاں بیوی دونوں کے لیے لازم ہے کہ ایک دوسرے کے رشتہ داروں کے ساتھ ان کا معاملہ حسنِ سلوک کا ہو۔ گویا اسلام کے عائلی نظام کا اطلاق صرف دو افراد کی ازدواجی زندگی ہی پر نہیں بلکہ پورے خاندان پر ہوتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس نظام میں میاں بیوی کے درمیان باہمی اعتماد اور خوشگوار تعلقات کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ قرآن حکیم میں جہاں عورتوں کو شوہروں کی فرمانبرداری کا حکم دیا گیا ہے وہاں مردوں کو بھی خاص طور پر حکم دیا گیا ہے **وَمَا يَنْبَغُ ذِكْرُنَا فِي الْكُتُبِ** یعنی عورتوں کے ساتھ حسنِ سلوک یا نبھنے طریقے کی زندگی بسر کرو۔ صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کوئی ایمان والا شوہر اپنی مومنہ بیوی سے نفرت نہیں کرتا، اگر اس کی کوئی عادت ناپسندیدہ ہوگی تو دوسری کوئی عادت پسندیدہ بھی ہوگی۔ اسی طرح جامع ترمذی میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مسلمانوں میں وہ شخص کمال الایمان ہے جس کا اخلاقی پرہیز سب کے ساتھ بہت اچھا ہو اور بالخصوص جس کا سلوک بیوی کے ساتھ لطف و کرمت کا ہو۔

اب رہے میاں بیوی کے دوسرے رشتے داروں میں دونوں کے والدین، اولاد، بہن بھائی اور دیگر قریبی اقرباء شامل ہیں۔ اللہ اور اللہ کے رسول نے ان کے ساتھ بھی حسنِ سلوک انسان کے حقوقِ قربت یاد کرنے کا حکم دیا ہے۔

قرآن حکیم میں ارشاد ہوا ہے

وَاتَّقُوا اللَّهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا وَلَا يَفْزَحُ الْفَزْنَ إِحْسَانًا وَبِذِي الْقُرْبَىٰ (النساء: ۳۶)

یعنی اللہ کی عبادت کرو اور کسی شے کو اس کا شریک نہ ٹھہراؤ اور ماں باپ اور قرابت داروں سے نفی کرتے رہو۔

اہل قرابت کے ساتھ خسی سلوک کا نام صلہ زنجی ہے جو اسلامی تعلیمات کا خاص عنوان ہے اور جس پر بہت زور دیا گیا ہے۔ شیخین ابی داؤد میں حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا، آپ فرماتے تھے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ میں اللہ ہوں میں اہل نعم ہوں، میں نے دھو قرابت کو پیدا کیا ہے اور اپنے نام رحمان کے مآذہ سے نکال کر اس کو رحم کا نام دیا ہے۔ پس جو اسے جوڑے گا میں اس کو جوڑوں گا اور جو اس کو توڑے گا میں اس کو توڑوں گا۔

شامی حدیث نے اس حدیث کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت اور مشیت سے انسان کی پیدائش کا ایسا نظام بنایا ہے کہ ہر پیدا ہونے والا انسان رشتوں کے بندھنوں میں بندھا ہوتا ہے۔ ان رشتوں کے کچھ فطری تقاضے اور حقوق ہیں۔ جو بندہ ان حقوق کو چار کرے گا، اللہ تعالیٰ اس کو اپنا بنالے گا اور اس پر اپنی برکتیں اور رحمتیں نازل کرے گا۔ اس کے برعکس جو ان حقوق کو پامال کرے گا یعنی قطع رحم کرے گا اللہ تعالیٰ اس کو اپنی رحمت اور فضل سے محروم کر دے گا۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جو شخص یہ چاہتا ہے کہ اس کی روزی میں فراخی اور کھانا کی ہوا اور اس کی عمر میں زیادتی ہو تو اس کو چاہیے کہ اپنے رشتہ داروں کے ساتھ صلہ زنجی کرے گویا اسلام کے عائلی نظام میں رشتے داروں کو اس قدر رعیت حاصل ہے کہ ان سے خسی سلوک کو رذق اور عمر میں برکت کا موجب قرار دیا گیا ہے۔ اس خسی سلوک کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں مثلاً ان میں سے جو غریب اور محتاج ہوں، ان کی مالی مدد کرنا، اپنے وقت اور زعم کی کچھ حصہ ان کے کاموں میں لگانا، جو بوڑھے، کمزور یا

معذور ہوں، ان کی خدمت کرنا و فہم رہ۔ اسہالی نقطہ نگاہ سے یہ عام مصلحت ہے اور تجربہ ہے کہ خاندانی جھگڑے اور تنازعات بالعموم بخیر و قریبیت کا پاس بند کھینے کی بناء پر پیدا ہوتے ہیں اور یہ آدمی کے لیے جتنی پریشانی، اندرونی ٹکڑھن اور کشمکش کا باعث بنتے ہیں۔ ایسے ظفرات لامحالہ صحت اور روزمرہ کے معمولات کو مختل کرتے ہیں لیکن جو لوگ رشتے اور اولوں کو مناسب اہمیت دیتے ہیں اور ان سے تنگی اور مسئلہ رنجی کا ہر تاج کرتے ہیں، ان کی زندگی روحانی آسودگی، طمانیت اور خوش دلی کے ساتھ گزرتی ہے اور ہر لحاظ سے ان کے حالات بہتر رہتے ہیں۔ پھر اہل قریبیت کی مدد کرنے میں دوبرا ثواب ہے جیسا کہ جامع ترمذی کی ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد نقل ہوا ہے کہ مساکین کو صدقہ دینا ایک صدقہ ہے اور اہل قریبیت کو دینے میں دوبرا ثواب ہے ایک صدقہ کا اور دوسرا صلہ رحمی کا۔

احادیث میں تو یہاں تک آیا ہے کہ اگر رشتے دار بد سلوکی اور خستہ بھی کرتے ہوں تو بھی ان سے نردباری، درگزر اور حسن سلوک ہی کا معاملہ کرنا چاہیے یہ طرز عمل نہ صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا باعث ہوگا بلکہ تنگی کرنے والوں کو بد سلوکی اور خستہ کرنے والوں پر غالب رکھے گا۔ اس کے برعکس رشتے داروں سے بے اعتنائی برتنا اور اپنے مفادات کا اسیر رہنا اسلام کے عائلی نظام کی روح سے روگردانی کے مترادف ہے۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے قریبیت داروں سے حسن سلوک کی توفیق عطا فرمائے، آمین ثم آمین۔

## اسلام کا نظام معیشت

جاریہ عالم پر ایک نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ ابتدائے آخر فیض سے آج تک روئے زمین پر شیعوں انقلاب برپا ہوئے جن کے نتیجے میں بعض قومیں مغربِ ہستی سے مٹ گئیں، بعض قومیں اُمت سے نکل کر اوجِ ثریا تک جا پہنچیں، بعض حکام کی زنجیریں توڑ کر آزادی کی نعمت سے بہرہ ور ہو گئیں اور بعض آزادی کی نعمت سے محروم ہو کر ابدِ وحشت کا شکار ہو گئیں۔ برپا ہونے والے بڑے بڑے انقلابات کا تقابلی مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ بعض انقلاب محض سیاسی تھے، بعض محض اقتصادی، بعض محض ثقافتی اور بعض محض تعمیری و ملی تھا لہذا لقیاس، مگر آج سے پندرہ سو سال پہلے جو انقلاب سرور کائنات فجرِ موجودات جناب محمد مصطفیٰ ﷺ نے برپا فرمایا، اس سے زیادہ جامع، ہمہ گیر اور بھرپور انقلاب اس روئے زمین پر آج تک برپا نہیں ہوا۔ یہ انقلاب اخلاقی بھی تھا اور معاشرتی بھی، مادی بھی تھا اور روحانی بھی، سیاسی بھی تھا اور اقتصادی بھی، طبعیاتی (Physical) بھی تھا اور ما بعد طبعیاتی (Meta Physical) بھی۔ فرض یہ انقلاب زندگی کے ہر شعبے پر محیط تھا۔ پہلے اس نے ریگِ زارِ عرب کی کالیانچلی اور بھرپور سارے عالم کے لیے سرچشمہِ ہدایت اور منارِ انوار بن گیا۔ آنحضرت ﷺ فی الحقیقت عسکری انسانیت تھے۔ آپ کے برپا کیے ہوئے انقلاب کا خاص الغامض پہلو کائناتِ عالم کے ایک انتہائی مؤخر اور حیاتِ کُل نظام کا قیام ہے۔ اصطلاحی طور پر کائناتِ عالم سے مراد ہے عام لوگوں یا مخلوقِ خدا کی مادی ضروریات کو پورا کرنا اور کائناتِ عالم کے مؤخر نظام کا مطلب ہے فرسودہ نظام معیشت میں انقلابی تبدیلیاں لاکر اسلامی نظام معیشت قائم کرنا۔ اسلامی نظام معیشت کو ہم بلا تاخیر ایمانِ اسلامی نظام کہہ سکتے ہیں جو تک وقتِ روحانی بھی تھا، اخلاقی بھی اور معاشی بھی۔ یہ تینوں پہلو ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح مربوط ہیں کہ ایک دوسرے کا

تجدیدِ اخلاق ہیں کہ کسی ایک کے بھی بغیر اسلامی نظامِ معیشت کا تصور تک نہیں کیا جاسکتا۔ یہاں اس بات کو ذہن میں رکھنا نہایت ضروری ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ کی حیاتِ حبیبہ قرآن مجسم کی عملی تفسیر تھی۔ قرآن پاک کے احکام و فطائرہ اور حضور ﷺ کے عمل میں سرسوفرق نہ تھا۔ آپؐ نے جو انقلاب برپا فرمایا، یا جو نظام قائم فرمایا وہ حکمرانیِ انقلاب یا قرآنی نظام تھا۔ قرآن پاک بنی نوع انسان کو معاش اور معیشت کا جو تصور دیتا ہے وہ ایک اخلاقی اور روحانی دستورِ العمل ہے جو روح اور جسم دونوں کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے اور دونوں کے نشوونما اور بالیدگی کی ضمانت دیتا ہے۔ عسکری انسانیت ﷺ کی سیرتِ مطہرہ کے مطالعے سے معیشت میں آپؐ کے لائے ہوئے انقلاب کا جو نقشہ ذہن میں الجھتا ہے اس کا بنیادی نقطہ رزقِ حلال اور جائز ذرائع سے اس کے حصول کے لیے جدوجہد ہے۔ لیکن بات کسبِ حلال ہی پر غم نہیں ہو جاتی۔ اسلام جائز ذرائع سے حاصل کیے ہوئے مال پر بھی انسان کو کھلی تصرف اور اختیار نہیں دیتا بلکہ اس پر کچھ ایسی شرائط اور پابندیاں عائد کرتا ہے جن پر عمل کرنے سے معاشرہ ایک ایسی بحکمت بن جاتا ہے جس میں شرفِ انسانی کا احترام بھی ہے اور انسان کی روحانی اور معاشی احتیاج کا علاج بھی۔ اس میں غریب پر زندگی دو بھر نہیں ہوتی اور امیر و امیر تر اور خزانے کا سانپ بننے کا موقع نہیں پاسکتا۔ وہ غریبوں کو اپنی دولت میں حصہ دار بنانے پر مجبور ہوتا ہے۔ اس میں کمزوروں، ملہا جھوں، بوزھوں، بے روزگاروں، یتیموں، یتیموں اور ناداروں کے حق کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس میں صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ قوم کے غیر مسلم افراد بھی مسلمانوں کی طرح بیت المال سے اپنی احتیاج پوری کر سکتے ہیں۔ اسلامی نظامِ معیشت کے نمایاں خدو خال یہ ہیں:

رزقِ حلال

اسلام نے اسی رزق کو حلال قرار دیا ہے جو نہ صرف دیکھنے میں پاکیزہ ہو، حلال ہو بلکہ اسے حاصل بھی جائز طریقوں سے کیا گیا ہو اور پھر اس میں سے حقوقِ اللہ اور حقوقِ العباد بھی ادا کیے گئے ہوں۔ جائز ذرائع سے رزقِ حلال کے لیے



تک و ذکر کرنے کو عبادت کا وہب حاصل ہے۔ ناجائز و مائع سے حاصل کردہ حلال چیز بھی حرام ہو جاتی ہے۔ یہ ناجائز و مائع ہیں، ملاوٹ، لہین، تقار، بازی، ذخیرہ اندوزی، دھوکے بازی، کم تو لیا، کم مانجا، رشوت خوردی، کام چوری، کسی کا حق غصب کرنا، اپنے اختیارات کا غلط استعمال، ان چیزوں کا کاروبار جو شریعت نے حرام قرار دی ہیں۔ حضورؐ نے ہاتھ کی تکلی کو سب سے بہتر کمائی اور عز و دور اور محنت کش کو اللہ کا دوست قرار دیا ہے۔

### انعام زکوٰۃ

زکوٰۃ ہر صاحب حیثیت یا صاحب نصاب پر فرض قرار دی گئی ہے۔ یہ ہر غریب کا حق اور حاجت مندوں، معذوروں اور یتیموں کی کفالت کا ذریعہ ہے۔ زکوٰۃ ادا کرنے کی وجہ سے حب مال کم ہوتی ہے اور دنیا پر کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ جس طرح نماز حقوق اللہ کا سفر ہے۔ اسی طرح زکوٰۃ حقوق اللہ کا سفر ہے۔ صحیح مطلق پر نظام زکوٰۃ کا قیام نہ صرف غنا میں اور غریبوں کی کفالت کا ضامن بلکہ گداگری کے خاتمہ کا بھی بڑا ذریعہ ہے۔

### انفاق فی سبیل اللہ

اس کا مطلب ہے اللہ کی راہ میں خرچ کرنا۔ قرآن پاک میں جگہ جگہ انفاق فی سبیل اللہ کا حکم دیا گیا ہے اور دولت مندوں سے کہا گیا ہے کہ تم تنگی کو نہیں پہنچ سکتے جب تک اپنی وہ چیزیں اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرو جن کو تم عزیز دیکھتے ہو۔ آنحضرتؐ نے بھی انبیاء کو بار بار تاکید فرمائی کہ تمہارے پاس جو کچھ مال و منال ہے اس میں غریبوں، یتیموں اور مسکینوں کا بھی حق ہے ان کا حق انہیں لوٹا دو۔ اپنے مال کی زکوٰۃ نکال کر اپنے آپ کو فارغ نہ سمجھو بلکہ زکوٰۃ کے علاوہ بھی بے دریغ صدقہ و خیرات کرتے رہا کرو۔

قرآن پاک میں نفل، مال کو بہت بھرت کر رکھنے اور یتیموں اور مسکین سے بد سلوکی کرنے کی سخت مذمت کی گئی ہے۔ سورۃ غافر، میں ارشاد ہوا ہے:

ہلاکت ہے ہر محبِ چشتی اور غیبت کرنے والے کے لیے جو مال جمع کرتا اور اس کو گن گن کر رکھتا ہے اور بکھتا ہے کہ اس کا مال اسے ہمیشہ کی زندگی بخش دے گا۔ ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔ مسودہ مساعون میں فرمایا گیا ہے کیا تو نے اس شخص کو نہیں دیکھا جو جزا کے دن کو جھوٹ بکھتا ہے۔ یہی ہے جو عظیم کو دھکے دے کر نکال دیتا ہے اور مسکین کو خود کھانا کھاتا تو درکنار اس کی ترغیب بھی نہیں دیتا تو ایسے شخص کے لیے ہلاکت ہے۔

صحیحین کی ایک حدیث میں رسول اکرم ﷺ نے فرمایا ہے ہر شخص کے پاس صبح کے وقت روزانہ دو فرشتے آتے ہیں۔ ان میں سے ایک کہتا ہے، یا اللہ تعالیٰ کو نعم البدل عطا فرما۔ دوسرا کہتا ہے، یا اللہ تجھ کو اس کے مال کو تباہ کر دے۔

گو یا رزقِ حلال، اتفاق فی سبیل اللہ، سخاوت و ایثار، صلہ رحمی، باہمی بھروسہ اور خدمتِ خلق، نظامِ زکوٰۃ کے ساتھ مل کر ایسا نظامِ معیشت وجود میں لاتے ہیں جس میں دنیوی اور اخروی خیر و فلاح کا راز مضمر ہے۔ رسول اکرم ﷺ نے مدینہ کی اسلامی ریاست کی تاسیس کے بعد یہی نظامِ معیشت اس شان سے قائم فرمایا کہ زمین اللہ کے نور سے جگمگا اٹھی اور ہر طرف رحمت و برکت کے سوتے پھوٹ نکلے یہاں تک کہ ملک بھر میں کوئی زکوٰۃ اور خیرات لینے والا بہت مشکل سے ملتا تھا۔

## اسلامی زاویہ نگاہ سے بچوں کی تعلیم و تربیت

ذرا اپنے معصوم بچے کو دیکھیے، اس کی آنکھوں میں کتنی ہلک ہے، کتنی خوشی ہے اور کتنی قدر سحر سے بھری ہوئی ہے۔ اب اسے ذرا گھمکھمائیے اور پھر اس کی ہلکا ریاں دیکھیے انہوں نے سارے گھر میں سحر سے کیلور و ڈاڈی۔ اس کے ہونٹ گلاب کی پنکھوں کی طرح ڈنک رہے ہیں۔ اس کی محفوظ ماند ادائیں اور خوشیاں دیکھ کر کیا آپ کا دل نہیں چاہتا کہ اس کو کتنی پیار کریں؟ حقیقت چاہتا ہوگا۔ آپ اس کو اپنے سے لگائیں گے اس کا منہ سر جو میں گے اس کے ساتھ قوت ملی جائیں گے اور اس کو خوش کرنے کے لیے ہلکا نہ حرکتیں کریں گے۔ اگر آپ سے پوچھا جائے کہ کیا آپ پسند کریں گے کہ اس بچے کو آگ میں ڈال دیا جائے یا کسی اندھے کو نہیں میں دیکھ لیا دیا جائے۔ آپ کا جواب یقیناً نفی میں ہوگا بلکہ شاید آپ ایسا سوال کرنے والے کا منہ سرنوچ لیں۔ لیکن یہ بات اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ اگر آپ نے اس بچہ کو سے بچنے کی مناسب پرواز اور عمدہ تعلیم و تربیت کی طرف سے بے پروائی برتی تو آپ نے یقیناً اسے آگ میں ڈال دیا یا اندھے کو نہیں میں دیکھ لیا دیا۔ کیا وہ بات ہے جس کی طرف قرآن حکیم نے نہایت طرغ انداز میں یوں اشارہ کیا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ وَأَطِيعُوا اللَّهَ (المحرم: ۶)

یعنی اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ۔ گویا اولاد کی تربیت کی طرف سے غفلت برتنا نہ صرف اس کو آگ میں ڈالنے کے مترادف ہے بلکہ اپنے آپ کو بھی عذاب الہی کا مستوجب بنا دیتا ہے۔

اولاد کی اچھی تربیت کو اسلام میں جو اہمیت دی گئی ہے اس کا اندازہ والے کو نہیں جس نے انسانیت پر عذابِ خداوندی کے ان ارشادات سے بھی کیا

جاسکتا ہے :

جامع برعدی میں حضرت سعید بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کسی باپ نے اپنی اولاد کو کوئی صلیبہ خنس آداب اور انجلی میرت سے بہتر نہیں دیا یعنی باپ کی طرف سے سب سے اعلیٰ اور گراں بہا شے یہی ہے کہ وہ اپنے بچوں کی تربیت اس طرح کرے کہ وہ اچھے اخلاق اور کردار کے مالک بنیں۔ بخاری میں جامع میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اپنی اولاد کا اکرام کرو اور انجلی تربیت کے ذریعے ان کو خنس آداب سے آراستہ کرو بخیر ﷺ کے اس کلمہ ارشاد میں حقائق و معارف کا ایک سمندر رکھی ہے۔ اولاد کی تربیت کے سلسلے میں یہ ایک نہایت ہی جامع اور ذہین گم ہے کہ اولاد کا اکرام کیا جائے۔ اکرام کا مطلب یہ ہے کہ اولاد کو اللہ تعالیٰ کا عطیہ اور امات سمجھ کر اس کی نگہ راور لیا جائے۔ اسی صورت میں وہ بڑی ہو کر نیک صالح رہد اور خوش اخلاق ہوگی۔

پرانے بزرگ اولاد کی نگریم کا کس قدر خیال رکھتے تھے اس کا اندازہ ایک پھولی سی مثال سے کیا جاسکتا ہے۔ مشہور ادیب خواجہ محمد شفیع دہلوی بیان کرتے ہیں کہ میں جب چھوٹا بچہ تھا اور دلی میں رہتا تھا تو مولانا الطاف حسین حالی اکثر ہمارے گھر تشریف لایا کرتے تھے۔ ایک روز مولانا تشریف لائے تو میں گھر کے کچن میں کھیل رہا تھا۔ میری والدہ نے مجھے آواز دی :

”کو شفیع ادھر آکر مولانا کو سلام کر“

اس پر مولانا حالی نے نہایت شفقت سے میری والدہ سے فرمایا۔

”بچی! بچوں سے اس طرح بات نہیں کرتے وہ اس طرح ان کے اخلاق بگڑتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے۔ تمہیں اس طرح کہنا چاہیے تھا، یہاں محمد شفیع یہاں آکر جب تک تم اولاد سے انجلی طرح نہیں بولوگی اولاد کس طرح

اچھے طریقے سے بولنا سکھائی۔"

یہ بات کسی دلیل کی محتاج نہیں کہ بچے ہر ملک اور ہر قوم کا قیمتی سرمایہ ہوتے ہیں آج کے یہ معصوم اور پیارے بچے کل کے جوہن ہیں۔ قوم اور ملک کی حفاظت اور خدمت کی ذمہ داری انہی کے کندھوں پر ہوگی۔ یہی کسی قوم اور ملک کا مستقبل ہیں اور انہی سے ملک و قوم کی امیدیں وابستہ ہیں۔ معاشرے میں بچوں کی غیر معمولی اہمیت کے واضح نظریں سالہا سال پہلے مجلس اقوام متحدہ نے بچوں کے حقوق طعنے کرتے ہوئے اعلان کیا۔

"نوع انسانی بچوں کے معاملے میں اخلاقی طور پر اس بات کی پابند ہے کہ انہیں ہر وہ بہترین چیز فراہم کرے جو اس کے قبضے میں ہے۔"

بلاشبہ یہ ایک شاندار اصول ہے اور برقی یافتہ ممالک میں اس پر بڑی حد تک عمل بھی ہو رہا ہے۔ ان ملکوں میں بچوں کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ دی جاتی ہے اور اس مقصد کے لئے بجٹ میں بہت بڑی رقم دہی جاتی ہیں لیکن یہ ممالک بچوں کی تعلیم و تربیت کے بارے میں ایک مخصوص نقطہ نگاہ رکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک اس تعلیم و تربیت کا حاصل یہ ہونا چاہیے کہ بچے بڑے ہو کر اچھے شہری، اچھے تاجر، اچھے صنعت کار، اچھے مزدور، اچھے ماہر اور اچھے سائنس دان بنیں۔ اس کے ساتھ ہی ان میں اپنے نقطہ زمین یعنی وطن اور قوم سے اتنا گہرا رونا دھونا ہو جس کے ذائقے پر مشغول سے جائیں۔

ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ بچوں کی تعلیم و تربیت کے بارے میں اسلام کا راز کیا ہے کیا ہے۔ اسلام محض دینی عبادات کا مذہب نہیں بلکہ یہ اللہ کا دین ہے جو زندگی کے ہر شعبے میں نئی نوع انسان کی رہنمائی کرتا ہے اور انسانوں کے ہر طبقے کے حقوق تحفظ کرتا ہے۔ اس کے نظریہ و حیاتیات میں نہ تنگ نظری ہے اور نہ تعصب بلکہ یہ آفاقیت اور پوری انسانیت کی فلاح کا علمبردار ہے اس نے ولید بن یزید بچوں کی پرورش کے ساتھ

ان کی حمد و تربیت کی ضرورت ہی بھی مانگنی ہے۔ اسلام میں بچوں کی حمد و تربیت سے صرف یہ مراد نہیں کہ وہ بڑے ہو کر اچھے شہری بنیں اور مختلف علوم و فنون میں مہارت حاصل کریں بلکہ اس کے ساتھ وہ اس بات کو بنیادی اہمیت دیتا ہے کہ وہ حقے مسلمان اور اللہ تعالیٰ کے عبادت گزار بندے بنیں۔ خود بھی نیک ہوں اور نیک کو پھیلانے یا نیکہ حق کو پھیلانے کی خاطر سر و سزا کی بازی لگا دینے والے ہوں کہ یہی قرآن حکیم کا انسان مطلوب ہے اگر یہ نہیں تو بابا بھروسہ کہاں ہیں۔ اشترائی اور سرمایہ دارانہ معاشروں میں بچوں کی تعلیم و تربیت کے معاملے میں دین اور مذہب کو سرے سے کوئی اہمیت ہی نہیں دی جاتی۔ اس کے برعکس اسلامی معاشرے میں بچوں کی تربیت کے معاملے میں دین کو بنیادی اہمیت حاصل ہے اور یہی چیز اس کو مغربی اور لادینی انداز تربیت سے تمیز کرتی ہے۔ یہاں اس بات کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ چھہ کسی بھی ملک یا قوم کا ہو اس کی فطرت یکساں ہوتی ہے۔ اس فطرت کو سمجھنے کے لئے والدین اور اساتذہ (خواہ وہ کوئی بھی عقیدہ یا نظریہ رکھتے ہوں) ان کا بچوں کی نفسیات سے کسی نہ کسی حد تک واقف ہونا بہت ضروری ہے ترقی یافتہ ممالک میں بچوں کی نفسیات کے مختلف پہلوؤں پر بے شمار کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ اس قسم کی کتابیں وہاں کے والدین اور اساتذہ کی قدم قدم پر رہنمائی کرتی ہیں کہ وہ بچوں کی تعلیم و تربیت کے لئے کیا انداز اختیار کریں۔ بد قسمتی سے ہمارے ہاں ایسے لڑکچڑکی شہید کیے جہ بچوں کی تربیت اسلام کے نظریہ حیات کے مطابق کرنے میں والدین اور اساتذہ کی رہنمائی اور مدد کر سکے۔ اگر والدین اور اساتذہ کو واضح طور پر یہ معلوم ہی نہ ہو کہ اللہ اور رسولؐ کی طرف سے ان پر بچوں کی تربیت کے سلسلے میں کیا فرائض عائد ہوتے ہیں، بچے کی دلچسپیوں اور ضروریات کے تقاضے اسلامی حدود کے اندر رہتے ہوئے کیسے پورے کیے جاسکتے ہیں اور اس کے طبی رجحانات، فطری میلانات اور نفسیاتی کیفیات کا لحاظ رکھتے ہوئے اس کے ذہن کو اسلامی سانچے میں کس طرح اضملاع جاسکتا ہے۔ تو وہ بچوں کی اچھی تربیت اور اسلامی خطوط پر ان کی سیرت

و کردار کی تکمیل کیسے کر سکتے ہیں؟ اس صورت حال سے عہدہ بردار ہونے کے لئے ایسے مناسب اور سوزوں لڑچکر کا وہ مقدار میں ہونا ہماری الفہ ضرورت ہے جو والدین اور اساتذہ کی فکر و نظر کا صحیح نوع حصّین کر سکے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دینی لڑچکر کی ہمارے ہاں کوئی کمی نہیں۔ مگر اس میں سے صحیح قسم کا لڑچکر منتخب کر لیا جائے تو یہ بڑی حد تک والدین اور اساتذہ کی رہنمائی کر سکتا ہے لیکن ہر واقعہ یہ ہے کہ اس وقت بچوں کی تربیت کے سلسلے میں جن کتابوں پر انحصار کیا جا رہا ہے ان میں سے بیشتر لادین یا مغرب زدہ ذہنوں کی تخلیق ہیں۔ فنی اعتبار سے تو یہ کتابیں بہت خوشنما اور مفید معلوم ہوتی ہیں لیکن ان میں قدم قدم پر اسلام کے بنیادی اصولوں سے انحراف پایا جاتا ہے۔ فنی الحقیقت ان کتابوں کا نقطہ نظر خاص مادہ پرستانہ ہے یا ان میں ڈارون کا نظریہ ارتقا کا فرما ہے۔ جب اس قسم کی کتابوں سے مدد لے کر بچوں کی تربیت کی جائے گی تو اس کا نتیجہ ظاہر ہے۔ آج ہماری نئی نسل دین سے باغی اور اخلاقی اقدار سے دور گردن ہو کر مصالح و مفاح کے بجائے فساد فی الارض کا سبب بنتی جا رہی ہے تو اس کا سبب یہ ہے کہ اس کی تربیت اسلامی خطوط پر نہیں کی گئی۔ اس حقیقت سے تواضعاً نہیں کیا جاسکتا کہ اس ناخوشگوار صورت حال کی ذمہ داری ایک حد تک والدین اور اساتذہ پر عائد ہوتی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اس سلسلے میں والدین اور اساتذہ کی رہنمائی کے لئے قومی سطح پر کیا کیا گیا ہے؟ اس کا جواب بہت مایوس کن ہے۔ یہ درست ہے کہ بچوں کے لئے کچھ نہ کچھ کام ضرور ہوا ہے اور ہمارے بعض اہل علم نو نہالان قوم کے لئے ان کی ذاتی استعداد کے مطابق مفید لڑچکر پیش کرنے کی طرف توجہ دے رہے ہیں لیکن والدین اور اساتذہ کے لئے مناسب لڑچکر دور دور تک نظر نہیں آتا حالانکہ بچوں اور والدین و اساتذہ کے لئے مناسب لڑچکر ایک دوسرے کے ساتھ لازم و ملزوم ہیں اور اسی سے صحیح نتائج حاصل ہو سکتے ہیں۔ یہاں یہ بات ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ فرد کی شخصیت کے مختلف عناصر کی بنیاد اس کے بچپن ہی میں رکھی جاتی ہے۔ بعد میں اسے تبدیل کرنا اگر ناممکن نہیں تو محال ضرور ہے۔ اس لیے اسلامی خطوط پر بچوں کی تربیت

کے سلسلے میں والدین اور اساتذہ کے لئے مناسب لڑچجر کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔  
اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ والدین اور اساتذہ کی رہنمائی کے لئے کس قسم کے  
لڑچجر کو ”مناسب“ کہا جاسکتا ہے۔ اس سلسلے میں دوسرے لڑچجر سے قطع نظر سب سے  
اہم اور ضروری رہنما ”کتاب اللہ“ ہے۔ والدین اور اساتذہ کے لئے ضروری ہے کہ  
وہ قرآن حکیم پڑھنا جانتے ہوں اور سچوں کو بھی پڑھا سکتے ہوں۔ خود اس کا آسان  
زبان میں ترجمہ کر سکتے ہوں تو بہت بہتر ہے ورنہ وہ کُرْخُم قرآن پاک سے مدد لے  
سکتے ہیں اور قرآن حکیم کے معارف، احکام اور قصص کو سچوں کے ذہن فطین کر سکتے  
ہیں۔

قرآن حکیم کے بعد جس لڑچجر سے رہنمائی حاصل کی جاسکتی ہے وہ دو قسم کا  
ہے پہلی قسم دینی لڑچجر کی ہے اس میں سر فہرست سیرت رسول ﷺ ہے۔ والدین  
اور اساتذہ کو رہبر کامل خاتم الانبیاء والمرسلین ﷺ کی سیرت طیبہ سے عملی طور پر  
واقف ہونا ضروری ہے۔ اسی صورت میں وہ غلطیوں سے بچیں اور غلطیوں کی حیات طیبہ کے  
واقعات، آپؐ کے ارشادات اور اسوۂ حسنہ سے سچوں کو آگاہ کر سکیں گے۔

دوسرے درجے پر صحابہ کرام صحابیات اور دوسرے سلف صالحین کی  
سیرتیں ان سے سچی آموز واقعات اخذ کر کے آسان زبان میں سچوں کو سناتا بڑی  
افادیت کا حامل ہے۔

تیسرے درجے پر تاریخ اسلام ہے اس موضوع پر مختلف لیکن جامع کتابیں  
بہت مفید ہیں۔ والدین اور اساتذہ کا اپنی تاریخ سے واقف ہونا بہت ضروری ہے  
بالخصوص تاریخ کے وہ ابواب جن میں ہمارے شاندار ماضی کی عکاسی کی گئی ہو، سچوں کو  
ان سے آگاہ کرنا بھی ان کی عمدہ تربیت کا ایک حصہ ہے ان کو سچی کہانیوں کے سچے ایسے  
میں سچی بیان کیا جاسکتا ہے۔

چوتھے درجے پر دین کے ضروری مسائل اور دینی اصطلاحات ہیں ایسی  
کتابیں جن میں دین کے ضروری مسائل بیان کئے گئے ہوں اور دینی اصطلاحات کی



مخرج کی گئی ہو مثلاً تو حید، رسالت، فرشتے، یوم آخرت، غیر، خنز، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، طہارت، فرض، واجب، سنت، وغیرہ۔ والدین اور اساتذہ کے لئے ان سے واقف ہونا ضروری ہے تاکہ وہ بچوں کو اسلام کے ارکان اور اس کی روح سے آشنا کر سکیں۔ فی الحقیقت قرآن حکیم کے بعد اس قسم کے لڑچکر کی سب سے زیادہ اہمیت ہے۔ بالخصوص ذرا بڑی عمر کے بچوں کے لئے تو اس قسم کے لڑچکر سے استفادہ کرنا ناگزیر ہے۔

پانچویں درجے پر دلچسپ اخلاقی کہانیاں ہیں جن میں بچوں بہتوں جادوگروں وغیرہ کے بجائے نیک لوگوں کے واقعات بیان کئے گئے ہوں۔ بچوں کو ایسی کہانیاں سنا کر ان کے دلوں میں دین اور وطن سے محبت، خدمتِ خلق، ایثار، نیکی، بہادری اور ہمدردی کے جذبات پیدا کئے جاسکتے ہیں۔

دوسری قسم کے لڑچکر میں ایسی کتابوں کی ضرورت ہے:-

1- جو بچوں کی نفسیات کے مختلف پہلوؤں مثلاً بچوں کی ضد، بچوں کی شرارتیں، بچوں کا خوف، بچوں کی لغزت، بچوں کا چنور پن، بچوں کے جھوٹ، وغیرہ کے بارے میں مکمل معلومات بہم پہنچاتی ہوں۔

2- جو بچوں کی جسمانی صحت اور پرورش کے بارے میں صحیح اور مستند معلومات مہیا کرتی ہوں۔

3- جو بچوں کو کھانے پینے کے آداب سکھاتی ہوں، ان کے اخلاق درست کرتی ہوں اور اچھی عاداتیں اپنانے کی تحریک پیدا کرتی ہوں۔

4- جو تکمیل اور دوسرے ذرائع سے بچوں کی تربیت کے طریقے بتاتی ہوں۔

5- جو مسئلہ درپیش کی نگہداشت اور تربیت کے بارے میں رہنمائی کرتی ہوں۔

والدین اور اساتذہ کے لئے مناسب لڑچکر کا یہ ایک مختصر سا خاکہ ہے اس کی اہمیت اور ضرورت اپنی جگہ مسلم ہے لیکن سب سے اہم بات جو بچوں کی تربیت اور

کردار کی تشکیل میں مدد دے سکتی ہے یہ ہے کہ دلہہ میں اور ساتھ خود چلنے کے لئے ایک عمدہ نمونہ بنیں۔ ہر اسی بات اور فعل سے پرہیز کریں جو اللہ تعالیٰ کے حکم اور فرمودہ رسولؐ کے خلاف ہو، نہ خود ان کے سامنے کوئی نئی بات کریں، نہ ان کو کوئی نئی بات کرنے دیں، اگر ان کا اپنا نمونہ درست نہیں ہوگا تو چلنے پر بھی اس کا اپنا اثر نہیں پڑ سکتا اور وہ کبھی مہذب ہو نہ سکتا اور شائستہ نہیں ہو سکتے، اگر ہم خود سچ نہیں بولیں گے، وقت کی پابندی نہیں کریں گے، صحیح سویرے نہیں اٹھیں گے، رات کو دیر دیر تک گھر سے باہر رہیں گے، وقت پر نہیں سوئیں گے، کھانے پینے میں اعتدال سے کام نہیں لیں گے، نماز نہیں پڑھیں گے، روزہ نہیں رکھیں گے، بڑوں کا ادب نہیں کریں گے تو چلنے سے ان باتوں کی توقع کیسے کر سکتے ہیں؟

چلنے کے ساتھ والدین اور ساتھ زادہ کے طرز عمل اور سلوک میں اعتدال اور توازن ہونا چاہیے وہ بچوں سے لازماً یاد ضرور کریں لیکن یہ نہ حد سے زیادہ ہونا چاہیے اور نہ بے موقع۔ کبھی کبھی چلنے پر سختی کرنے کی ضرورت بھی پیش آ جاتی ہے لیکن یہ سختی بھی حد سے زیادہ نہیں ہونی چاہیے اور مار پیٹ تک تو اس کی قربت ہرگز نہیں پہنچنی چاہیے۔ ان کی عزت کریں اور عزت نفس کا خیال رکھیں لیکن ساتھ ہی ان کے دلوں میں بڑوں کی عزت کرنے کا جذبہ پیدا کریں۔ ان کے ساتھ نرمی اور شفقت کا برتاؤ کریں اور ان کی جائز ضروریات کو پورا کرنے میں سستی سے کام نہ لیں۔ ان کو کھیل کود سے منع نہ کریں لیکن ایسی کھلی کھلتی بھی نہ دیں کہ وہ پڑھنے لکھنے سے جی ہٹانے لگیں، بس یہ ہو کہ وقت پر کھیلیں اور وقت پر پڑھیں، ان کے دلی رہنمائی کے مطابق تعلیم دلائیں یا کوئی دھڑکھائیں لیکن دینی تعلیم کو ہر حال میں مقدم نہ رکھیں۔ نہ خود بے راہرو ہوں اور نہ ان کو بے راہر دھونے دیں، نہ خود نئی عادتوں میں مبتلا ہوں اور نہ ان کو مبتلا ہونے دیں۔ بچے ایک سے زیادہ ہوں تو سب کے ساتھ یکساں سلوک کریں اگر ایک کو دوسرے پر ترجیح دیں گے تو وہ آپس میں حسد کرنے لگیں گے اور احساس کمتری کا شکار

ہو جائیں گے یا احساس برتری میں مبتلا ہو جائیں گے لڑکوں اور لڑکیوں کے درمیان  
 بھی تفریق نہ کیجیے (ہارنی اکرم علیہ السلام نے ایسی تقریق کرنے سے منع فرمایا ہے) اور  
 سب کے ساتھ یکساں حسن سلوک کیجیے۔ مختصر یہ کہ بچوں کی تربیت کے لیے اپنی  
 تربیت کرنا بھی ضروری ہے اور جو لڑکے بچوں کی تربیت کے لیے والدین اور اساتذہ کی  
 رہنمائی کر سکتا ہے وہی ان والدین اور اساتذہ کی اپنی تربیت کے لئے بھی مفید ثابت  
 ہو سکتا ہے۔

اس مسئلے میں سب سے اہم بات جس پر ہر مسلمان کا ایمان ہونا چاہیے وہ  
 یہ ہے کہ ہدایت اور ترویج حقیقی فی الحقیقت اللہ تعالیٰ کا کام ہے اس لیے بچوں کی  
 تربیت اور ان کے نیک مستقبل کے بارے میں صرف اسی ذات رحیم و کریم پر پورا  
 بھروسہ کرنا چاہیے اور اسی سے اس مقصد کے لیے بھروسہ و علاج کے ساتھ ڈھانڈھ کرنا  
 چاہیے۔ اپنی ذات یا لڑکے یا کسی اور طریقے یا ذریعے پر بھروسہ کرنا مناسب نہیں  
 ہے۔ بچوں پر غفلت کرنے والوں کو بات بات پر روکنے اور ٹوکنے کا مطلب یہ ہوگا کہ گویا  
 ہدایت یا تربیت کا نتیجہ ہمارے اپنے ہاتھ میں ہے اور ہم ان کی سیرت و کردار کو اپنی  
 مرضی اور خواہش کے مطابق ڈھال لیں گے۔ یہ ایک قسم کا شرکِ نفسی ہوگا اس سے  
 احتساب کرنا چاہیے۔ والدین (یا بچوں کے سرپرستوں) کا کام (اچھی تعلیم و تربیت  
 کے ذریعے) صرف کوشش کرنا ہے کہ جن کے بچے اچھے اخلاق و کردار کے مالک  
 نہیں لیکن کوشش کا نتیجہ اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دیں۔ دیکھا گیا ہے کہ بعض نہایت نیک اور  
 احکامِ الہی کے پابند مسلمانوں کی اولاد بھی اچھی تعلیم و تربیت کے باوجود بگڑ جاتی ہے  
 (جیسا کہ حضرت نوح علیہ السلام کا بیٹا بگڑ گیا تھا) اس کے اسباب و جمل کاظم  
 اللہ تعالیٰ ہی کو ہوتا ہے۔ ہم صرف یہ کر سکتے ہیں کہ جہاں بچوں کی تعلیم و تربیت کا  
 مناسب اہتمام کریں وہاں ان کے لیے تسلسل کے ساتھ ڈھانڈھائی کرتے رہیں اور اپنا  
 پورا بھروسہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کے فضل پر رکھیں۔

وَعَا عَلَيْنَا الْاَمْلَاحُ

## لمبی امید میں نعمتوں کی خوشی کو دُور کرتی ہیں

قرآن حکیم اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے اور اس کی بے شمار صفوں میں سے ایک خاص صفت یہ ہے کہ یہ انسان کے اندر سے تبدیلی لاتی ہے، اس کا نقص اللہ جلّ جلالہ سے استوار کرتی ہے اور اس کے نفس کی برائیوں کو مغلوب کر کے اچائیوں کو غالب کرتی ہے۔ ایک مومن کی اچھائی یا صفت محمود قرآن حکیم نے یہ بیان کی ہے کہ ذکھ ہو یا شکرہ و خوشی ہو یا غمی، فراقی ہو یا مصلحتی، سرور ہو یا غمگینا، غمگینا ہو یا خوشگینا، وہ ہر حال میں اللہ کی رضا پر راضی رہے۔ حالات سازگار ہوں، اس کی چاہیں اس کو مل رہی ہوں، امید میں ہر آن رہی ہوں تو وہ اس کو اپنی قوت سے باز رکھتا ہے۔ سمجھے بلکہ اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی بخشش سمجھ کر ہر نعمت پر اس کا شکر ادا کرے اور جب کوئی دکھ اور مصیبت پیش آجائے تو باپوی اور سراسیمگی کا شکار نہ ہو بلکہ ایمانی صبر و شہادت کے ساتھ اس کا استقبال کرے اور دل میں اس ایمان کو تازہ کرے کہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور وہی اس مصیبت سے نجات دلانے والا ہے۔ اس کے برعکس جو شخص اللہ تعالیٰ کی رضا پر راضی نہیں ہوتا اور ملول، افسل میں مبتلا رہتا ہے اس کو بھی اطمینان قلب نصیب نہیں ہوتا۔ ملول، افسل یہ ہے کہ لمبی امید میں باغی جانیں اور جو کچھ اللہ تعالیٰ نے دے رکھا ہے اس پر قناعت نہ کی جائے بلکہ زیادہ سے زیادہ کی تمنا کی جائے۔ ایسا شخص حقیقی معنوں میں ناشکرا ہوتا ہے وہ نہ تو ان نعمتوں کا شکر ادا کرتا ہے جو اس کو پہلے سے حاصل ہیں اور نہ اس کو کوئی نئی نعمت ملنے پر خوشی ہوتی ہے کیونکہ ہوائے نفس یا حرص و طمع اس خوشی کو زائل کر دیتی ہے۔ گویا جہاں ہم فحائے نفس یا قناعت اور صبر و شکر کو ساری بھلائیوں کا سرچشمہ کہہ سکتے ہیں وہیں ملول، افسل یا حرص و دنیا کو ساری برائیوں کی جز اور اطمینان قلب کی کاٹھ

میں کے۔

قرآن حکیم کی سورۃ الفہم میں ارشاد ہوا ہے:

وَلَا تَقْسُرُوا فِعْلُ اللَّهِ بِهِ تَقْصُرْكُمْ عَلَىٰ نَفْسِكُمْ ۖ (آیہ ۳۲)

ترجمہ: یعنی اور جو کچھ اللہ نے تم میں سے کسی کو دوسروں کے مقابلہ

میں زیادہ دیا ہے اس کی تمنا نہ کرو۔

اس آیت میں ہمیں جو ہدایت دی گئی ہے اسے اگر غلط رکھا جائے تو ہمارے معاشرے میں ہر ایک کو امن، دشمن اور اطمینان قلب کی لازوال دولت نصیب ہو جائے۔ اس حقیقت سے تو کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ خالق کائنات نے تمام انسانوں کو ایک جیسا نہیں بنایا بلکہ ان کے درمیان انواع و اقسام کے فرق رکھے ہیں کوئی سالم اور کچھ اعضا کے ساتھ پیدا ہوا ہے اور کوئی پیدا انہی طور پر ناقص الاعضاء ہے۔ کوئی خوبصورت ہے اور کوئی بد صورت، کوئی قوی ہے اور کوئی کمزور، کوئی خوش الحان ہے اور کوئی بد آواز، کوئی تاجر ہے اور کوئی مزدور، کسی کو اللہ نے بہتر حالات میں پیدا کیا ہے اور کسی کو بدتر حالات میں، کسی کو زیادہ ذرائع آمدنی دیے ہیں اور کسی کو کم، اسی فرق و امتیاز کی بنا پر انسانی تمدن کی خدمات قائم ہے۔ اس فرق کو مٹانے یا اسے نظر انداز کرنے کی کوشش کرنا فطرت سے جنگ کرنے کے مترادف ہے۔ اسی نام زمین پر فساد برپا کرنے کی کوشش کا نام بھی دے سکتے ہیں۔ آدمی کی یہ ذہنیت کہ جسے کسی حیثیت سے اپنے مقابلہ میں بڑھا ہوا دیکھے، بے نیکی ہو جائے، یہی انتہائی زندقہ میں گھراں نعمت محمد، زکات، عداوت، اور باہمی تشکیک کی جڑ ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب اس کی لمبی امیدیں پوری نہیں ہوتیں اور جو فضل اسے جائز طریقوں سے حاصل نہیں ہوتا اسے وہ ناجائز طریقوں سے حاصل کرنے پر اتر آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اسی زنجیر سے بچنے کی ہدایت فرمائی ہے۔ اس ارشاد کاغذ خا یہ ہے کہ جو فضل اس نے تم سے زیادہ دوسروں کو دیا ہے اس کی تمنا نہ کرو اور نہ اپنے دل میں لمبی امیدیں پالو، اہل اللہ سے فضل کی دعا کرو، وہ جس فضل

یا نعت کو اپنے علم و جلالت سے تمہارے لیے مناسب سمجھے گا مطلقاً فرما دے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ اپنے دل میں ایسی امیدیں پالنے والے کو عطاۓ نعت پر کبھی حقیقی غوثی نصیب نہیں ہوتی بلکہ اس کے دل میں حرص کی آگ اور بھڑک اٹھتی ہے یہ آگ ہر وقت بھڑکتی رہتی ہے یہاں تک کہ فرشتہ داخل اس کو اپنے پنجوں میں دبوچ لیتا ہے سورہٴ طہ میں انسان کی اسی کیفیت کو بیان کیا گیا ہے کہ سال کی کثرت اور دنیا کے ساز و سامان کی حرص آدمی کو اللہ اور آخرت سے غافل کر دیتی ہے۔ دن رات اس پر دنیا کمانے کی ذمہ داریاں رہتی ہیں یہاں تک کہ موت اس کے دروازے پر آدھک دیتی ہے۔ مرنے کے بعد اس کو معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی حرص نے اس کو ختم حقیقی کی طرف سے غافل رکھا اور اس نے اس کے اوامر و نواہی پر عمل نہ کیا جس کے نتیجے میں آتش جہنم اس کا مقدر بنی۔ طویل نسل یا حرص و ہوس کے روگ کا علاج صرف قناعت ہے جس کو قناعت یا جہنمائے نفس کی دولت مل گئی اسے سب چھوٹ گیا۔ شیخ سعدی نے کیا خوب کہا ہے:

گفت چشم تک دنیا دوست را      یا قناعت پُر کف یا خاک گور

یعنی دنیا کی حرص میں جلا آدمی کی تک آنکھ کو یا تو قناعت بھرتی ہے یا بھر قبر کی مٹی۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمیں ایسی امیدوں میں جلا ہونے سے بچائے اور قناعت کی دولت نصیب فرمائے۔

## فرض صدقہ کے ماسوا صدقات چھپا کر دو

اسلام دینِ فطرت ہے، وہ انسانوں کے مختلف طبقوں میں رزق کی کی بیشی  
پانگی اور فراخی کو تسلیم کرتا ہے لیکن ساتھ ہی زیادہ رزق والوں پر فرض عائد کرتا ہے کہ وہ  
کم رزق والوں یعنی غیروں، مسکینوں، محتاجتہوں، اور جملائے مصیبت لوگوں کی دل  
کھول کر مدد کریں۔ اس سلسلے میں ذکرِ آہر صاحب نصاب مسلمان پر شرعاً فرض قرار  
دی گئی ہے۔ مختلف قسم کے اسوا اور عیادہ پر اس کی ایک معنیٰ شرح ہے اور یہ اس  
شرح کے مطابق سال میں ایک ہی دفعہ دی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ صدقہ دینا بھی ہر  
ذی استطاعت مسلمان کے لئے لازم قرار دیا گیا ہے اس کی نہ کوئی مقدار مقرر ہے  
اور نہ کوئی وقت۔ اسلام کی اصطلاح میں صدقہ یا انصاف اس صلفے کو کہتے ہیں جو غلوں  
نیص کے ساتھ حلال کی کمائی سے محض رخصائے اٹھی کی خاطر دیا جائے۔ اس میں نمود  
نمائش اور تفاخر کا شائبہ تک نہ ہو، کسی لینے والے پر احسان نہ جنمایا جائے، دینے والا  
صرف اس لئے دے کہ وہ اپنے رب کو راضی کرنے کا سچا جذبہ رکھتا ہے اور اس کا  
مقصد صرف اور صرف اتفاق فی سبیل اللہ ہے۔ ایسے صدقے کو اللہ تعالیٰ نے اپنے  
ذمے فرض قرار دیا ہے۔ سورۃ الاحد ید میں ارشاد ہوا ہے:

إِنَّ الْمَصْلَبِينَ وَالْمَضِلَّةَ وَالْمُرْسُوْنَ اللَّهُ لَرَحِيْمٌ

بُخْلُفَ لَهُمْ وَلَهُمْ أَجْرٌ كَثِيْرٌ (آیہ ۱۸)

یعنی مردوں اور عورتوں میں جو لوگ صدقات دینے والے ہیں اور جنہوں  
نے اللہ کو فرض تسلیم دیا ہے ان کو یقیناً کئی کئی بار عطا کر دیا جائے گا اور ان کے لئے  
بہترین اجر ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ صدقات کیسے دیے جائیں۔ تو اس کے بارے میں سورۃ  
انعام میں ارشاد ہوا ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِيُخْلَصَ لَكُمْ مَالُكُمْ فَاِنْ لَمْ يَكُنْ مَالُكُمْ فَفِيْ ذٰلِكَ عِلْمٌ  
فَاِنْ لَمْ يَكُنْ مَالُكُمْ فَفِيْ ذٰلِكَ عِلْمٌ  
وَاللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ وَيَخْتَارُ (آیہ ۱۰۵)

ایمانی! اپنے صدقات، طاعات، دینیہ بھی اچھا ہے۔ لیکن اگر چھپا کر حاجت  
مندوں کو دے تو یہ تمہارے حق میں زیادہ بہتر ہے۔ تمہاری بہت سی برائیاں اس طرز عمل  
سے مٹ جاتی ہیں اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ کو بہر حال اس کی خبر ہے۔

مفسرین نے اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے  
اگرچہ طاعات، صدقہ دینے کو جائز قرار دیا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ اس میں دیا کھاری مطلق  
نہ ہو یعنی یہ لوگوں کے دکھاوے کے لئے ہرگز نہ ہو کیونکہ دیا کھاری بدترین گناہ ہے اور  
دکھاوے کے لئے دیا گیا صدقہ اجر کے بجائے عذاب کا موجب بن جاتا ہے۔ اس  
طرح صدقہ دینے والے اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہیں جیسا کہ سورۃ تباہ میں ارشاد ہوا ہے۔

وَالَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ رِيًّا لِّلنَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ  
وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ (آیہ ۳۸)

(یعنی) اور وہ لوگ بھی اللہ کو ناپسند ہیں جو اپنے مال محض لوگوں کو دکھانے کے  
لئے خرچ کرتے ہیں اور حقیقت وہ نہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں نہ روزِ آخر پر۔

لکھائے اسلام نے ہر قسم کے اعمال کے لئے یہ اصول مقرر کیا ہے کہ فرائض  
کا طاعت یا انجام دینا غصیلت رکھتا ہے۔ اور فرائض کو چھپا کر ادا کرنا قافی ہے۔ اس اصول  
کی روشنی میں جو صدقہ فرض ہو (مثلاً زکوٰۃ) اس کو طاعت دینا افضل ہے اور جو صدقہ  
فرض کے ماسوا ہو اس کا انعام زیادہ بہتر ہے۔ حق تعالیٰ نے بھی چھپا کر صدقہ دینے کو  
صدقہ دینے والے کے حق میں زیادہ بہتر قرار دیا ہے۔ اس لئے کہ چھپا کر دیکھیاں  
کرنے سے انسان کے غم و الحاق کی غراہیاں دور ہوتی رہتی ہیں اس کے



اوصافِ مہذبہ خوب نشوونما پاتے ہیں، اس کی بہت سی برائیاں رفتہ رفتہ محو ہو جاتی ہیں اور نیکی بات اس کو بارگاہِ الہی میں اتنا مقبول بنا دیتی ہے کہ جو تھوڑے بہت گناہ اس کے ہمراہ اعمال میں ہوتے ہیں انہیں اس کے حسنِ نیت کے ساتھ اٹھا دین میں دے دیتے ہوئے صدقات کی بنا پر اللہ تعالیٰ معاف کر دیتا ہے۔

قرآن پاک میں مالی صدقات کے مستحقین میں والدین اور شیعہ داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کا خصوصیت کا ساتھ نام لیا گیا ہے۔ ان کے علاوہ ان ٹھک دست لوگوں کو بھی خاص طور پر صدقہ کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔ جو اللہ کے کاموں میں ایسے مشغول ہو گئے ہیں کہ اپنی ذاتی کسبِ معاش کے لئے ٹھک و دو نہیں کر سکتے مگر اپنی خود داری کی وجہ سے کسی کے سامنے سببِ سوال دراز نہیں کرتے، مان کی اعانت تو لازماً ازاداری کے ساتھ کرنی چاہیے تا کہ ان کی عزت سے ٹھس بھرج نہ ہو۔ اللہ کے کاموں سے مراد کسی نہ کسی انداز سے ہمہ وقت دین کی خدمت یا ہمہ وقت دین کی تعلیم حاصل کرنا ہے۔

یہاں یہ وضاحت کرنا ہے کہ بے محل نہ ہوگا کہ صدقہ صرف مال ہی کا نہیں ہوتا بلکہ اس کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں رسول اللہ ﷺ کے یہ ارشادات نقل ہوئے ہیں کہ صدقہ و خیرات کچھ مال ہی پر موقوف نہیں بلکہ وہ شخصوں کے درمیان بدل کرنا بھی صدقہ ہے، اچھی بات بھی صدقہ ہے، مان دینے والی چیز راستے سے ہٹا دینا بھی صدقہ ہے، ہر قدم جو مسجد کو چاتے وقت اٹھایا جائے وہ بھی صدقہ ہے، لوگوں کو نیکی کا علم دینا اور برائی سے روکنا بھی صدقہ ہے۔

مسند احمد میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ہر نیکی صدقہ ہے اور ایک نیکی یہ ہے کہ مسلمان بھائی سے خندہ پیشانی سے ملاقات کریں اور ایک نیکی یہ ہے کہ پانی کا ڈول بھر کر کسی مسلمان بھائی کے برتن میں ڈال دیں۔ مطلب یہ کہ معمولی سی نیکی کو بھی حقیر نہیں جانتا چاہیے۔ سنن ابی داؤد اور مسنن نسائی کی ایک حدیث کے مطابق جس جگہ پانی نہ ملتا ہو یا اس کے حصول میں دشواری ہو وہاں کنواں گھوٹا

صدقہ جاریہ ہے۔

مکتبہ شریف میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ صدقہ پروردگار کی آغوشِ غضب کو غصا کرنا اور بُری موت سے محفوظ رکھتا ہے۔ صدقہ دینے میں جلدی کرو بلاشبہ بھلا یعنی مصیبت صدقہ دینے سے بڑھنے نہیں پاتی۔ "جلدی کرو" سے حضورؐ کی مراد یہ ہے کہ موت یا بیماری سے پہلے صدقہ دے دو مگر یہ کہ رحمتِ عالم ﷺ کا نکتہ پر احسان ہے کہ آپؐ نے زکوٰۃ خیرات کے علاوہ دوسری ہر قسم کی نیکیوں کو بھی صدقہ قرار دیا۔ بلاشبہ ان میں ایسی نیکیاں بھی شامل ہیں جن کو کھلے عام ہی کیا جاسکتا ہے اور ان کو اخفا میں رکھنا ممکن ہی نہیں مثلاً سیلاب میں گھرے ہوئے لوگوں کی مدد کرنا، دشمن کے حملے سے متاثر لوگوں کی مدد کرنا، کسی علاقے میں دبا پھوٹ پڑے تو اس کا شکار ہونے والوں کی مدد کرنا، سبیل لگا کر چاسوں کو پانی پلانا، کھانا پکوا کر غریبوں کو کھلانا، لوگوں کو کثرت سے سلام کرنا وغیرہ وغیرہ ان نیکیوں میں ذاتی تشہیر یا سیاسی فائدہ اٹھانے کی خواہش ہرگز نہیں ہونی چاہیے ورنہ نیکی برباد اور گناہ لازم والا معاملہ ہو جائے گا۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کو رضائے الہی کی خاطر مالی صدقات اور دوسری نیکیاں زیادہ سے زیادہ کرنے کی توفیق دے۔

اپنے یا کسی دوسرے کے

ماں باپ کو گالی دینا گناہ کبیرہ ہے

صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ

سے روایت ہے:

لَمَّا رَسُوْنُ اللّٰهُ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: مِنْ الْكُفَّارِ شَتَمَ الرَّجُلُ  
وَالْبَنِيَّةَ، لَمَّا كُوْنَا بِمَا رَسُوْنُ اللّٰهُ رَجُلٌ يَشْتُمُ الرَّجُلَ وَالْبَنِيَّةَ؟ قَالَ نَعَمْ نَسَبُ  
أَبَا الرَّجُلِ فَنَسَبُ أُمِّهِ وَنَسَبُ أُمِّهِ فَنَسَبُ أُمِّهِ

یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اپنے ماں باپ کو گالی دینا بھی کبیرہ گناہوں میں سے ہے۔ لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! کیا کوئی اپنے ماں باپ کو بھی گالی دے سکتا ہے؟ آپ نے فرمایا: ہاں اس کی صورت یہ ہے کہ کوئی آدمی کسی دوسرے کے ماں باپ کو گالی دے۔ پھر وہ جواب میں اس کے ماں باپ کو گالی دے۔

اس حدیث پاک سے معلوم ہوا کہ کسی آدمی کا کسی دوسرے کو ماں باپ کی گالی دینا یا ایسی بات کہنا یا ایسی حرکت کرنا جس کے جواب میں دوسرا آدمی اس کے ماں باپ کو گالی دینے لگے، اتنی ہی بڑی بات ہے جتنی کہ خود اپنے ماں باپ کو گالی دینا اور یہ بہت بڑا گناہ ہے۔

دائے کوئین دشمن دو عالم ﷺ کے اس ارشاد مبارک پر قرآن حکیم کے بعض واضح احکام اور آپ کی چند دوسری احادیث مبارکہ کی روشنی میں غور کیا جائے تو اس کی حکمت و وجہ علت کے کئی پہلو سامنے آتے ہیں اور ہمیں لانا کھانا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ کسی کے ماں باپ کو گالی دینا اپنے ماں باپ کو کالی دینے کے مترادف ہے اور یہی الواقع گناہ کبیرہ ہے۔

یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ اسلام میں گالی دینا خواہ وہ کسی بھی قسم کی

ہو اور کوئی بھی اس کا مطلب ہو، فی غضب نہایت بڑی اور گناہ کی بات ہے۔ چہ جائیکہ کسی کے ماں باپ کو گالی دی جائے۔ سرور کائنات ﷺ کا ارشاد ہے کہ مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں یعنی اس کی زبان اور ہاتھ سے نہ کسی دوسرے مسلمان کو ایذا پہنچے اور اس کی دلائل زہری ہو۔ گالی دینے کا مطلب ہے دوسرے کو زبان سے تکلیف پہنچانا اور اس کا دل دکھانا گویا گالی دینے کی صحیح حرکت اسلام کا دعویٰ کرنے والے کسی بھی شخص کی شان کے خلاف ہے۔

اب رہا دوسرے کے ماں باپ کو گالی دینا تو یہ ہر لحاظ سے سخت عذنب و گنہگار کی حرکت ہے۔ ایک تو یہ کہ اس میں خبیثت کا پہلو ہے جسے قرآن حکیم میں مردہ بھائی کا گوشت کھانے کے ٹکڑاؤں ٹھہرایا گیا ہے جیسا کہ سورۃ الحجرات میں ارشاد ہوا ہے۔  
وَلَا يَغْتَبِ بَئِضُكُم مِّنْ بَئِضٍ ۚ اَبْهَبُ اَخَذْتُمْ لِيَ يَأْكُلَ لَحْمُ اَبْنَيْهِمْ ذٰلِكَ يَتَّبِعُ  
یعنی تم میں سے کوئی کسی کو بیٹہ پیچھے نہ اندھے۔ کیا تم میں سے کوئی اس بات کو پسند کرے گا کہ اپنے سرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے؟ (آۃ ۱۲۰:۴)

جب دوسرے کے ماں باپ سامنے نہیں ہیں تو ان کو گالی دینا بیٹہ پیچھے ان کی بھائی کرنا ہے جو بڑا شدید خبیثت ہے اور پھر یہ کہ اس طرح گالی دینے کا مطلب یہ بھی ہے کہ دوسرے مسلمان کو جواب میں اسی طرح کی حرکت کرنے کی ترغیب دی جائے یعنی وہ بھی اپنی زبان کو گندہ کرنے اور خبیثت کرنے کے گناہ کا مرتکب کرے حالانکہ مسلمان کی تعریف یہ ہے کہ وہ دوسروں کو نیکی کی تلقین کرتا ہے اور بھائی سے روکتا ہے۔ اس حدیث پاک میں سب سے اہم نکتہ جس پر زور دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ دوسرے کے والدین کو گالی دینا اپنے والدین کو گالی دینے کے برابر ہے اور اپنے والدین کو گالی دینا ان کو ایذا پہنچانے کے ٹکڑاؤں کے برابر ہے۔

صحیح بخاری کی ایک اور روایت میں سرور عالم ﷺ نے والدین کی ایذا رسانی کو اکبر الکبائر یعنی بدترین اور طبیعت ترین گناہوں میں شمار فرمایا ہے اور اسے شرک کے بعد دوسرے درجہ پر رکھا ہے۔ اس کے برعکس آپ نے ماں باپ کی خدمت

اور ان کے ساتھ حسن سلوک کو اللہ تعالیٰ کی رضا مندی کا ضامن قرار دیا ہے۔ کیونکہ قرآن حکیم میں جا بجا اس کی سخت تاکید کی گئی ہے۔ سورہ بقرہ اور سورہ بقیہ اسرائیل میں عظیم دیا گیا ہے: **وَسَالُوا الَّذِينَ ابْخَسْنَا لَهُ** یعنی وہیدین کے ساتھ اچھے سے اچھا برتاؤ اور ان کی خدمت کرو۔

سورہ لقمان میں فرمایا گیا ہے **وَوَضَعْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ** یعنی ہم نے انسان کو اس کے ماں باپ کے حق میں تاکید کی۔ سورہ بقیہ اسرائیل میں عظیم دیا گیا۔

**فَلَا تَقُلْ لَهُمَا آيَاتٌ وَلَا تُنْهَرُ لَهُمَا وَقُلْ لَهُمَا قَوْلًا مَعْرُوفًا ۝ وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ إِنَّكَ أَنتَ عَنِ الْبَصَرِ ۝**  
**لَهُمَا جَنَاحٌ الذِّئْبِ مِنَ الْأُخْتِ ۖ وَقُلْ رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيْتَنِي**  
**صَبِيْرًا ۝ (آیہ ۲۳، ۲۴)**

یعنی ان کو بالکل نہ ہمز کو بلکہ بطور ہمزک کے آف بھی نہ کہو اور ان کے ساتھ بلا ب عزت کے ساتھ بات چیت کرو۔ اور بھڑو غبار سے ان کے آگے جھکے رہو اور ان کے حق میں دعا کرتے رہو کہ اے میرے پروردگار تو ان دونوں پر رحم کر جس طرح انہوں نے مجھے بچپن میں پالا پوسا تھا۔

قرآن پاک میں اور بھی متعدد مقامات پر والدین کی خدمت اور اطاعت کی تاکید کی گئی ہے، شیخ ابن ماجہ میں حضرت ابو امامہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا یا رسول اللہ ﷺ اولاد پر ماں باپ کا کتنا حق ہے۔ آپؐ نے فرمایا وہ تمہاری رشت اور دوزخ ہیں۔ صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، وہ آدمی ذلیل ہو، وہ خوار ہو، وہ زسوا ہو، عرض کیا گیا، کون یا رسول اللہ ﷺ؟ فرمایا وہ بد نصیب جو ماں باپ کو یا دونوں میں سے کسی ایک ہی کو بڑھاپے میں پائے پھر (ان کی خدمت اور ان کا دل خوش کر کے) بہت حاصل نہ کرے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ

اپنے ماں باپ کی خدمت اور اطاعت کرو اس طرح تمہاری اولاد بھی تمہاری فرمانبرداری اور خدمت گزار ہوگی۔

مُحسّر نے ماں باپ کی زندگی ہی میں ان کی خدمت اور اطاعت کا حکم نہیں دیا بلکہ تاکید فرمائی کہ ان کے مرنے بعد بھی ان کے حق میں دعا کرتے رہو اور باپ کے انتقال کے بعد اس کے دوستوں سے اکرام و احترام کا تعلق رکھو۔  
 دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے اور دوسروں کے والدین کی عزت و احترام کی توفیق نصیب فرمائے۔ آمین ختم آمین۔



## غیبت نہایت گھناؤنا گناہ ہے

”غیبت“ کا مطلب ہے ایک دوسرے کو چھپے نہ اٹکانا یا کسی شخص کی غیر حاضری میں اس کے بارے میں ایسی بات کہنا جو اگر اسے معلوم ہو تو اس کو نفی لگے۔ صحیح مسلم، جامع ترمذی اور بعض دوسری عظیم حدیث میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے (پوچھے جانے پر) فرمایا کہ:

”غیبت یہ ہے کہ تو اپنے بھائی کا (اس کے پاس پشت) ذکر اس طرح کرے جو اسے ناگوار ہو (جس سے وہ ناخوش ہو)۔ عرض کیا گیا ”اگر میرے بھائی میں فی الواقع وہ بات پائی جاتی ہو جو میں کہہ رہا ہوں تو اس صورت میں آپ کیا فرماتے ہیں؟“ آپؐ نے فرمایا ”اگر اس میں وہ بات پائی جاتی ہو تو تو نے اس کی غیبت کی اور اگر اس میں وہ نہ پائی جاتی ہو تو تو نے اس پر بہتان لگایا۔“

قرآن حکیم میں غیبت کو نہایت گھناؤنا فعل قرار دیا گیا ہے۔ سورۃ الحجرات

میں ارشاد ہوا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اخْفِئُوا كَثِيرًا مِّنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ  
الظَّنِّ إِثْمٌ وَلَا تَجَسَّسُوا وَلَا يَغْتَبِ بَعْضُكُم بَعْضًا  
أَتُحِبُّ أَخَذَ كُمْ أَن يَأْكُلَ لَحْمُ أَخِيهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوهُ  
وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ تَوَّابٌ رَّحِيمٌ (آیہ ۱۲)

ترجمہ: اے لوگو جو ایمان لائے ہو بہت گمان کرنے سے پرہیز کرو کہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں تجسس نہ کرو اور تم میں سے کوئی کسی کی غیبت نہ کرے، بھلا تمہارے اندر کوئی ایسا ہے جو اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھانا پسند کرے گا؟

دیکھو تم خود اس سے کچھ نہ کھاتے ہو۔ اللہ سے ڈرو، اللہ بڑا قویہ قبول کرنے والا اور رحیم ہے۔

اس ارشاد اور پانی سے بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ غیبت کس درجہ کا گناہ ہے۔ یہ مکروہ عادت جہاں اللہ تعالیٰ کی ناراضی کا سبب ہے وہاں یہ اکثر یا بھی لغزت، عداوت اور فساد کا باعث بھی بن جاتی ہے۔ ہمارے معاشرے میں یوں تو اور بھی متعدد اخلاقی کمزوریاں موجود ہیں لیکن غیبت جیسی مکروہ بد اخلاقی سب سے زیادہ پائی جاتی ہے بالخصوص خواتین میں تو یہ مکروہ عادت بہت عام ہے۔ جہاں چند عورتیں مل بیٹھیں وہیں بعض دوسری خواتین کی عدم موجودگی میں ان کی خامیاں اور برائیاں موضوع گفتگو بن گئیں۔ مرد حضرات میں بھی اکثر غیبت کو چنداں معیوب نہیں سمجھتے اور دوسروں کی عدم موجودگی میں بڑی بے تکلفی سے ان کی کمزوریاں اور برائیاں گونا گونے لگتے ہیں۔ ہادی اکرم رحمۃ اللہ علیہ مسلمانوں کو اس گناہ نے فعل سے بچنے کی بار بار تاکید فرماتے رہے تھے اس سلسلے میں آپ کے بہت سے ارشادات کثب حدیث میں ملتے ہیں ان میں سے چند یہ ہیں۔

۱۔ حضرت عمار رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جو شخص دنیا میں غیبت کرتا رہتا ہے، قیامت کے دن اس کی زبان آگ کی ہوگی۔

(مشکوٰۃ شریف)

۲۔ حضرت ابوسعید خدری اور حضرت جابر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ غیبت زنا سے سخت تر گناہ ہے۔ صحابہؓ نے عرض کیا، یا رسول اللہ! غیبت زنا سے سخت گناہ کیوں ہے؟

آپؐ نے فرمایا، آدمی زنا کرتا ہے پھر توبہ کرتا ہے تو اللہ اس کی توبہ قبول فرمالیتا ہے لیکن غیبت کرنے والے کو معاف نہیں کرے گا جب تک وہ شخص اس کو معاف نہ کرے جس کی اس نے غیبت کی ہے۔ (مشکوٰۃ شریف)

۳۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم



کو اشرے سے بتایا کہ فلاں عورت چھٹی اور کوٹاوند ہے۔ آپؐ نے فرمایا، مانگنا  
تو نے ایسی بات کہی ہے کہ اسے اگر سمندر میں بھی ڈال دیا جائے تو اس کے اثر سے  
سمندر کا پانی متغیر ہو جائے (مشکوٰۃ شریف)

۴۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ وہ شخصوں نے غزوہ  
عصر کی نماز پڑھی۔ دونوں کا روزہ بھی تھا۔ پھر جب رسول اللہ ﷺ نے نماز ختم کی تو  
ان سے فرمایا تم دونوں دو پارہ وضو کر کے نماز پڑھو البتہ روزہ پورا کر لو مگر اس روزہ سے  
کے بدلے کسی دن ایک اور روزہ رکھنا ہوگا۔ انہوں نے عرض کیا، کس وجہ سے  
یا رسول اللہ؟ آپؐ نے فرمایا تم دونوں نے فلاں شخص کی غیبت کی ہے۔ (مشکوٰۃ شریف)

۵۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ  
نے فرمایا کہ جب مجھے معراج کرائی گئی تو میں ایک ایسی قوم کے پاس سے گزرا جن  
کے باطن جنگل کے تھے اور وہ اپنے چہرے اور سینے کھرچ رہے تھے میں نے جبریلؑ  
سے پوچھا، یہ کون لوگ ہیں؟ جبریلؑ نے بتایا، یہ وہ لوگ ہیں جو لوگوں کی غیبت کیا کر  
تے تھے۔ (مشکوٰۃ شریف)

غیبت کی ایک قسم دو آدمیوں کو لڑانے کے لیے چغلی کھانا ہے دوسری غیبت  
کی طرح شریعت میں یہ بھی حرام ہے۔ دو حدیثیں ملاحظہ ہوں:  
حضرت محمد بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے  
ہوئے سنا ہے کہ چغلی خور خد میں داخل نہیں ہوگا۔ (بخاری و مسلم)

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ  
دو قبروں کے پاس سے گزرے تو آپؐ نے فرمایا ان دونوں پر عذاب ہو رہا ہے اور یہ  
عذاب کسی ایسی بات پر نہیں ہو رہا جسے وہ چھوڑ نہیں سکتے تھے (اگر چاہتے تو اس سے بچا  
سکتے تھے) (ماشبہ ان کا جرم بڑا ہے ان میں سے ایک چغلی کھا تا تھا اور دوسرا اپنے  
چوڑاب کے پھینکنا سے نہیں بچتا تھا۔ (بخاری و مسلم)

غیبت خواہ کسی شخص کی زندگی میں کی جائے یا اس کے مرنے کے بعد دونوں

صورہوں میں حرام ہے۔ اچھا اور کی روایت ہے کہ حضرت عائشہؓ بن مالک اسلمی کو جب زنا کے جرم میں سنگسار کر دیا گیا تو نبی ﷺ نے راہ چلتے ایک صاحب کو اپنے دوسرے ساتھی سے یہ کہتے ہوئے سنا کہ ”اُس شخص (عائشہؓ) کو دیکھو اللہ نے اس کا پردہ اُٹھا کر دیا تھا مگر اس کے گھس نے اس کا بیچھان چھوڑا جب تک یہ کتے کی موت نہ مار دیا گیا۔“ کچھ دور آگے جا کر راستے میں ایک گدھے کی لاش سڑتی ہوئی نظر آئی۔ حضور ﷺ رک گئے اور ان دونوں اصحاب کو بلا کر فرمایا ”اترے اور اس گدھے کی لاش تناول کیجیے“ ان دونوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! اسے کون کھائے گا؟ آپؐ نے فرمایا ”ابھی ابھی آپ لوگ اپنے بھائی کی عزت پر جو حرف زنی کر رہے تھے وہ اس گدھے کی لاش کھانے سے بہت زیادہ بھری تھی۔“ (تفسیر القرآن جلد پنجم ص ۹۱)

اگر نفیبت کرنے والا اپنی غلطی پر پشیمان ہو کر توبہ کرے اور اپنی لغزش کا کفارہ ادا کرنا چاہے تو اُس کو اس حدیث کے مطابق عمل کرنا ہوگا۔ ”حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، ”نفیبت کا ایک کفارہ یہ ہے کہ تو اس شخص کے لیے مغفرت کی دعا کرے جس کی نفیبت کی ہے، دعا میں یوں کہے کہ کہ اے اللہ تو میری اور اس کی مغفرت فرما۔ اگر وہ شخص موجود ہے اور اس سے اپنا جرم معاف کر لیا جاسکتا ہے تو معاف کرانے اور اگر معافی اس کی وفات کی وجہ سے یا اس کے دور دراز علاقوں میں جانیے کی وجہ سے ممکن نہ ہو تو پھر اس کے لیے دعائے مغفرت کے سوا کوئی راہ نہیں۔“ (مشکوٰۃ شریف)

نفیبت عام حالات میں بلاشبہ نہایت گھٹا ذرا فعل ہے۔ یہ خواہ واضح الفاظ میں کی جائے یا اشارۃً کنایۃً ہر صورت میں حرام ہے لیکن بعض حالات میں کسی شخص یا گروہ کی عدم موجودگی میں اسکی برائیاں اور غلطیاں بیان کرنا ناگزیر ہوتا ہے اس کے بغیر مظلوم کی رادری ہو سکتی ہے نہ انصاف مل سکتا ہے نہ ظالم کا ہاتھ پکڑا جاسکتا ہے نہ کسی غلطی سے صحیح فہمی حاصل کیا جاسکتا ہے نہ فسق و فجور دوسرے خلاف شرع کاموں کے خلاف کوئی قدم اٹھایا جاسکتا ہے چنانچہ فقہاء اور محدثین نے حسب ذیل

مسرحوں میں کسی شخص یا گروہ کی عدم موجودگی میں اس کے خلاف کچھ کہنے سننے کو ہمارے  
قرارداد یا ہے بشرطیکہ یہ سراسر حقیقت پر مبنی ہو اور اس میں مبالغے اور جھوٹ کی آمیزش نہ

ہو۔

۱۔ استغلا کی غرض سے کسی ملٹی کے سامنے کسی شخص یا گروہ کے خلاف کام کا

ذکر کرنا،

۲۔ کسی شخص یا گروہ کی بد معاشی، بدکاری اور خلاف شریعت کاموں کا

ذکر ایسے لوگوں کے سامنے کرنا جو ان برائیوں کو رد کرنے کے لیے کچھ کر سکتے ہوں۔

۳۔ مظلوم کی ظالم کے خلاف ان لوگوں (بشمول حاکمان وقت) کے سامنے

جو ظالم کو عظیم کرنے سے روک سکتے ہوں یا ظلم کے نتیجے میں جو نقصان ہوا ہو اس کی صفائی

کر سکتے ہوں۔

۴۔ معاشرے میں فسق و فجور، بدعات اور دوسری برائیاں پھیلانے والے

لوگوں کے خلاف آواز بلند کرنا۔

۵۔ جو شخص اپنے کسی فعل یا بدی وجہ سے کسی نہ سے نام یا لقب سے مشہور ہو گیا

ہو اس کے تعارف کے لیے وہ لقب استعمال کرنا مثلاً ابو جہل، سلطان

ڈاکو، گاموں جو ارباب وغیرہ

۶۔ شادی بیاہ کا رشتہ کرنے، کاروبار میں شرکت کرنے، پڑوسی میں مکان

کرایہ پر لینے یا خریدنے، کسی کے پاس امانت رکھنے کے لیے دوسرے فریق کے

بارے میں آپ سے کوئی مشورہ لے تو اس کے عیب و صواب دونوں پہلو بیان

کرنا تاکہ مشورہ لینے والا دھوکا نہ کھائے۔

۷۔ احادیث کی جرح و تعدیل کرتے ہوئے یا کسی تاریخی یا دوسرے واقعہ کا

تجزیہ کرتے ہوئے دلوچوں، گواہوں اور مصنفین کی کمزوریاں بیان کرنا۔

ذمہ ہے کہ ان مستثنیات کے سوا اللہ تعالیٰ ہر مسلمان مرد اور عورت کو طبیعت

جیسے کھانا نے فعل سے محفوظ رکھے۔

## حسد کا منہ کالا

حسد کا مطلب یہ ہے کہ کسی شخص کو اللہ تعالیٰ نے جو خوبی، فضیلت، ایساں، جائیداد وغیرہ کی صورت میں جو نعمتیں عطا فرمائی ہوئی ہوں اس پر کسی دوسرے شخص کا بھگ کر یہ چاہنا کہ وہ خوبی، فضیلت یا نعمتیں اس شخص سے جو جن کر خود اس (حاسد) کو مل جائیں یا کم از کم اس سے ضرر و جھن جائیں۔ قرآن حکیم میں کسی شخص یا گروہ کے کسی دوسرے شخص یا گروہ (جماعت) سے حسد کرنے کا سبب اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

أَمْ يَحْسَدُونَ النَّاسَ عَلَىٰ مَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ (ہود: ۸۷)

(پھر کیا یہ دوسروں سے اس لیے حسد کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے

انہیں اپنے فضل سے نواز دیا یا کیا وہ لوگوں سے حسد کرتے ہیں

لو کہ اس چیز کے جو اللہ نے ان کو اپنے فضل سے عطا کی)

حسد فی الحقیقت ایک بدترین اخلاقی اور روحانی بیماری ہے جس کا تعلق

انسان کے قلب سے ہے اور یہ خواہش نفس، خود پسندی، کینہ توزی، حرص، باہمی

عداوت، احساس کستری، غرور، تکبر، خود اعتمادی کے نقہاں اور بد بختی کی علامت ہے۔

یہ ایسی شر انگیز برائی ہے کہ قرآن حکیم میں اس کا ارتکاب کرنے والے کے شر سے

اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگنے کی تلقین کی گئی ہے۔ سُوْرَةُ الْفُلُقِیْ میں جہاں تمام مخلوقات،

راست کی چار کی اور گرہوں میں پھونکنے والوں (یا دایلوں) کے شر سے اللہ تعالیٰ کی

پناہ مانگنے کی ہدایت کی گئی ہے وہاں حاسد کے شر سے بھی جب کہ وہ خبیث کرے، یہ فرما

کر بطور خاص اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگنے کے لیے فرمایا گیا ہے۔

قُلْ أَعُوْذُ بِرَبِّ الْفُلُقِیْ، مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ... وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ إِذَا حَسَدَ

اگر غور کریں تو حسد کرنے کو نہ صرف حاسد کی رذائیت اور خواہش طبع بلکہ

اللہ تعالیٰ کے نظام ربوبیت پر اعتراض کرنے کے مترادف بھی کہا جاسکتا ہے بالفاظ

دیگر اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں میں جو نعمتیں تقسیم کی ہیں حلیہ اس تقسیم کو کبھی برائے نام نہیں سمجھتا۔ اللہ جلّ شانہ جو عادل اور قادر مطلق ہے اس کے بارے میں اس قسم کا خیال تک بھی دل میں لانا گناہ کبیرہ ہے۔ اسی لیے ہادی اکرم ﷺ نے مسلمانوں کو خند سے بچنے کی سخت تاکید فرمائی ہے اس سلسلے میں آپ کے چند ارشادات ملاحظہ ہوں۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ خند سے بچو کیونکہ خند نیکیوں کو اس طرح کھا لیتا ہے جس طرح آگ لکڑیوں کو کھا لیتی ہے۔ (ابوداؤد)

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کسی بندہ کے دل میں ایمان اور خند دونوں جمع نہیں ہو سکتے۔ (بخاری)

حضرت ضمروہ بن ثعلبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ لوگوں پر ہمیشہ بھلائی اور خیر سا یہ ظن رہے گی جب تک وہ آپس میں حسد نہ کریں۔ (طبرانی)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ آدمیوں میں سب سے بہتر وہ ہے جو خنوم القلب (یعنی ایسا دل رکھنے والا جس میں کھوٹ اور خند نہ ہو) اور صدوق اللسان (زبان کا سچ) ہو۔ (مشکوٰۃ)

حضرت ذہیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم میں پہلی انھوں کا مرض سراپت کرتا جاتا ہے ایک خند اور دوسرا (باہمی) دشمنی اور ان میں سے ہر چیز (موٹہ نے) والی ہے، میں یہ نہیں کہتا کہ بالوں کو موٹتی ہے بلکہ دین کو موٹ دیتی ہے۔ (ترمذی)

یہاں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ خند اور نزہت میں بہت فرق ہے حاسد کی خواہش تو یہ ہوتی ہے کہ دوسرے کو جو نعمت اللہ نے عطا کی ہے وہ اس سے سلب ہو کر حاسد کو مل جائے یا اس سے ضرور بچھن جائے لیکن نزہت کرنے والے کی

آرزو یہ ہوتی ہے کہ جلوت دوسرے کو ملی ہے وہ نعمت اللہ تعالیٰ اسے بھی عطا کرے۔  
 وہ دوسرے کی نعمت سے جتنا نہیں بھرتا وہ نہ یہ خیال کرتا ہے کہ اسے یہ نعمت کیوں ملی ہے۔  
 بس وہ اللہ تعالیٰ کے فضل کا اسید وار ہوتا ہے اور اس کے لیے بارگاہ الہی میں دعا کر کے  
 اپنے آپ کو اس کی رضا کے سپرد کر دیتا ہے۔ اگر اس کو وہ نعمت نہیں ملتی تو صبر اور شکر  
 سے کام لیتا ہے اور جو کچھ اس کے پاس ہے اپنی پر قناعت کرتا ہے۔ اس کے برعکس  
 حاسد کے دل میں آگ لگی ہوتی ہے۔ اس آگ میں وہ ہر وقت جھتا رہتا ہے اور  
 اطمینان قلب کی دولت سے محروم رہتا ہے۔ بعض دفعہ حاسد مسود کو سازشوں کے  
 ذریعے مثلاً نقصان پہنچانے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر اس میں کامیاب نہیں ہوتا تو اس  
 کے دل کی جلن میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ بعض مسودین مسود کو  
 جاہلوں کے ذریعے نقصان پہنچانے کا طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ اس طرح وہ کفر کا  
 ارتکاب کرتے ہیں اور اپنی دنیا و عاقبت بر پا کر لیتے ہیں۔ مختصر یہ کہ خُند کے جس پہلو  
 پر بھی نظر ڈالیں وہ دنیا و دین دونوں کو جہاں کرنے والی "بدی" ہی نظر آتا ہے۔ قرآن  
 پاک، احادیث مبارکہ اور بزرگان دین کے اقوال میں خُند کی جس جذبت سے  
 تذمت کی گئی ہے اس کے قسطنظر حاسد کو چاہیے کہ وہ اس قابلِ غرر و خصلت سے  
 نجات حاصل کرنے کے لیے کوئی یقینہ فروگزاشت نہ کرے۔ اگر اس کے دل میں کسی  
 کی طرف سے برائی پیدا ہو اور اس کو محسوس ہو کہ قلب کی یہ کیفیت کینہ اور خُند کی  
 صورت اختیار کر رہی ہے تو وہ بارگاہ الہی میں نہایت بکروا و الحاج کے ساتھ التجا کرے کہ  
 اور رحم و کرم اس کے دل میں مسود کے لیے کینہ و حسد کو کھانڈاں اور صحت کے جذبات  
 پیدا کر دے ساتھ ہی وہ مسود کی برائی بیان کرنے کے بجائے اس کی مدح و توصیف  
 کرے (یعنی اس کی زندگی کے اچھے پہلوؤں پر نظر رکھے اور ان کی بنیاد پر مسود کا اچھے  
 ہونے میں ذکر کرے)۔ اس کو اس عقیدے پر بھی کامل ایمان رکھنا چاہیے کہ خُند کا  
 جذبہ بھری دنیا اور آخرت دونوں کے لیے مضر ہے اور مسود کو اللہ نے جلوت بخشی ہے  
 وہ نعمتِ خدا کرنے سے ذرا کٹ نہیں ہوتی بلکہ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس میں اضافہ کر

دے۔ جہاں تک محسود کا تعلق ہے، اس کو طاعنے دینا ہی نے حسد کے فز سے بچنے کے لیے ذیل کی تدابیر اختیار کرنے کی تلقین کی ہے:

۱۔ حاسد کے فز سے اللہ کی پناہ مانگنا ہے (نورۃ العین کی کثرت سے بجا دے کر دے)۔

۲۔ اس بات پر ہند یقین رکھے کہ جب تک اللہ تعالیٰ نہ چاہے کوئی اس کا ہال بھی بچ نہیں کر سکتا۔

۳۔ حاسد کی باتوں پر صبر کرے اور اس کے جواب میں کوئی ایسی بات یا حرکت نہ کرے جس سے وہ اخلاقی طور پر حاسد کی سطح پر آ جائے۔

۴۔ اپنے دل سے حاسد اور اس کے حسد کو نیکر گھر دے گویا حاسد کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔

۵۔ حاسد اللہ کے خوف اور اپنی عاقبت سے بے نیاز ہو کر خواہ کبھی ہی بیہودہ حرکتیں کرے، محسود ٹھکری پر قائم رہے اور حاسد کی بدی کا جواب بدی سے دینے کا خیال تک دل میں نہ لائے۔

۶۔ حاسد کے لیے دعا کرتا رہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو ہدایت دے اور اس کی عاقبت بخیر ہو

۷۔ اگر کوئی موقع حاسد کے ساتھ نیکی اور بھلائی کرنے کا آئے تو محسود کو اس کے ساتھ احسان اور بھلائی کرنے سے گریز نہیں کرنا چاہیے اور اس بات کی برداشت کرنی چاہیے کہ حاسد اس کے احسان اور بھلائی سے مستلزم ہوتا ہے یا نہیں۔ اپنے نیک عمل کے نتیجے کو وہ اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دے۔

۸۔ محسود کو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور لوحِ تقدیر پر کمال اور ہند ایمان رکھنا چاہیے۔ ایسی صورت میں اللہ تعالیٰ کے خوف کے سوا کسی اور کا خوف اس کے دل میں ہرگز نہ آنے پائے گا۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو خدہ کی لعنت سے محفوظ رکھے۔

## بُخل اور اسراف سے پرہیز

اسلام دینِ فطرت ہے اور وہ زندگی کے تمام امور میں مہیا شدہ وی یا اعتدال کو بہترین روش قرار دیتا ہے۔ کوئی انفرادی معاملہ ہو یا اجتماعی، اس میں احتیاط پسندی اور افراط و تفریط سے کام لینا نہایت برے نتائج پیدا کر سکتا ہے۔ رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے: **خَيْرُ الْأَمْوَارِ أَوْسَطُهَا** یعنی تمام کاموں میں مہیا شدہ وی بہتر ہے۔ اسلام چونکہ زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے اس لئے قرآن حکیم اور احادیث نبوی میں بھلائی اور برائی کے تمام کاموں کی واضح طور پر نشاندہی کر دی گئی ہے۔ بُخل اور اسراف دو ایسی خصلتیں ہیں جو اگرچہ ایک دوسرے کی ضد ہیں مگر دونوں کو سخت مذموم قرار دیا گیا ہے اور ہر مسلمان کو ان سے بچنے کی تلقین کی گئی ہے۔ بُخل کا مطلب ہے تنگ دلی اور کجوسی، حاجت مندوں پر خرچ نہ کرنا اور دوسروں کے کام نہ آنا بھی اسی میں شامل ہے۔ بُخل آدمی حرص، لالچی، بے رحم اور سخت دل ہوتا ہے۔ اللہ کی محبت کی بجائے اس کے دل میں مال اور دولت کی محبت بھری ہوتی ہے۔ ایسے لوگوں کے بارے میں قرآن حکیم میں ارشاد ہوا ہے:

وَلَا يَخْشَى الْيَقِينَ يَتَخَلَّوْنَ بَيْنَ اللَّهِ مِنْ فَضْلِهِ هُوَ  
خَيْرٌ لَّهُمْ مِنْ نَبِيٍّ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ سَيُطَوَّقُونَ مَا يَخْلُقُونَ بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ

(الحق: ۱۸۰)

یعنی ”جن لوگوں کو اللہ اپنے فضل سے نوازتا ہے اور پھر وہ بخل سے کام لیتے ہیں، وہ اس دنیا میں نہ رہیں گے یہ بخیلی ان کیلئے اچھی ہے، نہیں، یہ ان کے حق میں نہایت بری ہے۔ جو کچھ وہ اپنی کجی سے جمع کر رہے ہیں وہی قیامت کے دن ان کے گلے کا طوق بن جائے گا۔“



جامع ترمذی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تخی بندہ اللہ سے قریب ہے، اللہ کے بندوں سے قریب ہے، جنت سے قریب ہے اور دوزخ سے دور ہے اور بخیل آدمی اللہ سے دور ہے، اللہ کے بندوں سے بھی دور ہے اور جنت سے دور اور دوزخ سے قریب اور بلاشبہ ایک بے ظلم تخی اللہ تعالیٰ کو عبادت گزار رکھوں سے زیادہ پیارا ہے۔ ”سُئِلَ نَسَائِي“ کی ایک حدیث میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: حرص و بخل اور ایمان بھی ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے۔۔۔۔۔ مطلب یہ ہے کہ ایمان کی حقیقت اور بخل کی عادت میں ایسی مخالفت ہے کہ جس دل کو حقیقی ایمان نصیب ہوگا اس میں بخل نہیں آسکتا اور جس کے دل میں بخل ہے اس میں ایمان کا نور نہیں ہے رسول اکرم ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ اپنے آپ کو بخل سے بچاؤ کہ اس نے پہلی آٹھوں کو ہلاک کر دیا پس کسی مسلمان کے شایان شان نہیں کہ بخل کرے اور جہنم میں جائے۔

اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ بخیل آدمی کی صرف آخرت ہی پر ہمارے نہیں ہوتی بلکہ دنیا میں بھی وہ ذلیل و رسوا ہو جاتا ہے۔ لوگ اس کو حقارت اور نفرت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور اس کے نزدیک نہیں سمجھتے۔ ایسے شخص کو مال کی حرص کی وجہ سے بھی اطمینان نصیب نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس اللہ کی راہ میں خوشہ دل سے خرچ کرنے والے کو جو روحانی آسودگی حاصل ہوتی ہے، دنیا کی کوئی بڑی سے بڑی نعمت بھی اس کا بدل نہیں ہو سکتی۔ اسلام نے جس جذبات سے بخل کی مذمت کی ہے اسی جذبات سے اسراف کو برا بھی کہا ہے اسراف کا مطلب ہے فضول خرچی یا غیر مناسب طور پر خرچ کرنا۔ اسلامی نقطہ نگاہ سے اسراف تین چیزوں کا نام ہے ایک ناجائز کاموں میں دولت خرچ کرنا خواہ ایک پیسہ ہی کیوں نہ ہو دوسرے جائز کاموں میں خرچ کرتے ہوئے حد سے تجاوز کرنا خواہ اس لحاظ سے کہ آدمی اپنی استطاعت سے بڑھ کر خرچ کرے یا اس لحاظ سے کہ اس کو جو دولت اپنی ضرورت سے زیادہ مل گئی

اسے وہ اپنے پیش اور ہاتھ ہاتھ میں خُزَف کرنا چاہا جائے۔ اسراف کی تیسری قسم عیبِ قومیت کی ہے وہ یہ کہ آدمی تنگی کے کاسوں پر دلی کھول کر روپیہ خرچ کرے مگر اس کا مقصد اللہ کو راضی کرنا نہ ہو بلکہ دینا اور نمائش ہو یعنی لوگ اس کو بڑا آدمی سمجھیں اور اس کی سخاوت اور دیادہلی کی تعریفیں کریں۔ اسراف کی یہ بھی صورتیں قابلِ مذمت ہیں اور ان سے بچنے کی سخت تاکید فرمائی گئی ہے۔

سورۃ الاعراف میں ارشاد ہوا ہے۔

تَخْلَوْا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا ۚ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ ۝

(آیہ - ۳۱)

”یعنی کھاؤ پیو اور اسراف نہ کرو۔ بے شک اللہ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔“

اسی طرح سورۃ بنی اسرائیل میں اسراف سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے اور اسراف کرنے والوں کے لیے قہاریت تحت الفاظِ استعجال کیے گئے ہیں۔ ارشاد ہوا ہے:

وَلَا تَسْبِرُوا قَوْلَكُمْ ۚ إِنَّ الْمُنِيرِينَ تَحْلَفُوا ۚ إِنْ هُمْ إِلَّا شُرَٰطُ السَّيْطَانِ ۚ

(آیہ ۲۶-۲۷)

”یعنی فضول فرمائی نہ کرو۔ بے شک فضول فرمائی کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں۔“

تخل اور اسراف دونوں کا علاج سخاوت، ایثار اور خدمتِ خلق ہے۔ یہ سب کلمہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی خاطر ہو اور اس میں نام و ثناء کی خواہش کی منطلق آمیزش نہ ہو۔ اس راستے پر چلنے والا شخص نہ صرف آخرت میں نوازہ ہوگا بلکہ دنیا میں بھی اس کے ہاں دولت میں برکت ہوگی لوگ اس کو عزت و احترام کی نظر سے دیکھیں گے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ عوامیجہ قلب کی خدمت سے بہرہ ور ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تمام احکام میں کوئی نہ کوئی حکمت پوشیدہ ہوتی ہے

اور ان پر عمل کرنے میں انسان کی اپنی ہی بھلائی ہے۔ ٹھکل اور اسراف سے احتساب کرنے میں انسان کا سراسر فائدہ ہی فائدہ ہے۔ اس سے اس کے رزق میں برکت و قلب میں راحت پیدا ہوگی اور اس کے گھر پر چھتوں اور برکتوں کا نزول ہوگا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ٹھکل اور اسراف سے گریز کرنے کی توفیق دے۔

☆.....☆

۱۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ اسے ہر سال میں تین سو چار سو گنا ہوں۔

(صحیح بخاری)

۲۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس شخص نے لوگوں کو کھانے کے لیے نواز دیا وہی اس نے شریک کیا اور جس شخص نے لوگوں کو کھانے کے لیے روک دیا وہی اس نے شریک کیا اور جس شخص نے لوگوں کو کھانے کے لیے منع کیا وہی اس نے شریک کیا۔

(مشتمل)

## دوسوں کو زبان پر بھی نہ لائیں

صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:-

”اللہ تعالیٰ نے میری امت کے دل میں آنے والے دوسوں کو معاف کر دیا ہے۔ ان پر کوئی مواخذہ نہ ہو گا جب تک ان پر عمل نہ ہو اور ان کو زبان سے نہ کہا جائے۔“

اس حدیث پاک میں ان منکرانہ اور غلط اندہ سوالات اور نہ بے خیالات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو کبھی کبھی انسان کے دل میں پیدا ہوتے ہیں اور یہ بتایا گیا کہ ایسے دوسوں پر جب تک عمل نہ کیا جائے یا ان کو زبان سے نہ نکالا جائے، ان کی کوئی باز پرس نہ ہوگی، حق تعالیٰ نے ان کو معاف فرما دیا ہے۔

دوسرے کے لغوی معنی ہیں پے در پے ایسے طریقے یا طریقوں سے کسی کے دل میں کوئی بُری بات ڈالنا کہ جس کے دل میں وہ ڈالی جا رہی ہو اسے محسوس نہ ہو سکے کہ دوسرا خدا اس کے دل میں بُری بات ڈال رہا ہے۔

دوسرے انسان کے دل میں شیاطینی دھن دھن بھی ڈالتے ہیں اور خود انسان کا اپنا نفس بھی اندر سے اُٹھیں پیدا کرتا ہے۔ یہ دوسرے کسی قومیت کے ہوتے ہیں، صحیحین کی ایک اور حدیث میں اس کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے:

”حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم میں سے کسی کسی کے پاس شیطان آتا ہے اور کہتا ہے کہ فلاں چیز کو کس نے پیدا کیا، فلاں چیز کو کس نے پیدا کیا یہاں تک کہ وہ یہ کہتا ہے کہ اللہ کو کس نے پیدا کیا، جب دوسرے کا سلسلہ یہاں تک پہنچے تو چاہیے کہ بخدا اللہ سے پناہ مانگے اور ڈک جائے۔ مطلب یہ ہے کہ اس قسم کے جاہلانہ اور اعتقادِ سواہلِ بعث شیطان کسی کے دل میں ڈالے تو اس کو چاہیے کہ شیطان کے قرض سے اللہ کی پناہ مانگے، خیال کو اس طرف

ہے پھر لے، اور ایسے دوسرے کوزہاں سے بھی نہ لکے۔ اللہ جب اس ہستی کا نام ہے جس کا جو اس کی ذاتی جبلت ہے اور جو تمام موجودات کو جو دیکھتے دلا ہے تو اس کے بارے میں ایسا دوسرے پیدا کرنا محض شیطانی فعل ہے۔ یہ تو دوسروں کی نوعیت کی محض ایک مثال ہے۔ دوسروں کی بے شمار اقسام ہیں مثلاً اللہ تعالیٰ کے وجود یا اس کی وحدانیت پر شک کرنا، اس کے پیغمبر کی حقانیت میں شک کرنا، اللہ والوں کی مخالفت کرنا، بدعت کی راہیں محفوظ نہ، مصنیع کی تاویلیں کرنا وغیرہ وغیرہ۔ انسان کا نفس اس کے اندر جو دوسرے پیدا کرتا ہے اس کی بنیاد اس کے غلط نظریات ہوتے ہیں جو اس کی عقل کو گمراہ کرتے ہیں، اس کی اپنی ناجائز اغراض و خواہشات اس کی توجہ تیز، توجہ ارادی اور توجہ فیصلہ کو بدراہ کرتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ انسان کا خالق و مالک ہے، وہ اس کے دل کا حال خوب جانتا ہے اور اس کے نفسانی دوسروں سے بھی آگاہ ہے جیسا کہ اس نے سورۃ قی میں ارشاد فرمایا ہے

وَنَعْلَمُ مَا قُلُوْنَ مِنْۢ بَدۡ نَفْسٍۭ

”یعنی ہم اس کے نفس سے ابھرنے والے دوسروں کو جانتے ہیں“

اسی بنا پر رسول اکرم ﷺ نے اپنے مشہور خطبہ مسنونہ میں یہ دعا مانگی ہے  
لَعُوْبًا اَللّٰهُمَّ مِنْ شَرِّ ذَوِّ اَنْفُسِنَا ”یعنی ہم اللہ کی پناہ مانگتے ہیں اپنے نفس کی شرارتوں سے۔“

یہ اللہ تعالیٰ کی شانِ ربوبی ہے کہ آنحضرت ﷺ کے ارشاد کے مطابق وہ ایسے دوسروں کا سوا لفظ نہیں لہرمانے کا بشرطیکہ زبان پر عمل کیا جائے اور نہ انہیں زبان پر لایا جائے۔ صرف یہی نہیں بلکہ ایسے دوسروں کو زبان پر نہ لانے کو منظور نے خالص ایمان قرار دیا ہے۔ صحیح مسلم کی ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے اصحاب میں سے ہر لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دریافت کیا کہ ہمارا حال یہ ہے کہ بعض اوقات ہم اپنے دلوں میں ایسے بُرے خیالات اور دوسرے پاتے ہیں کہ ان کو زبان سے کہنا بھی بہت بُرا اور بیماری معلوم ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کیا واقعی تمہاری یہ حالت ہے؟ انہوں نے عرض کیا، جی ہاں یہی حال ہے۔ آپ

نے ارشاد فرمایا، یہ تو خالص ایمان ہے۔ گویا دوسو سو کوئڑا جانا اور ان کو زبان پر لانے سے اجتناب کرنا خالص ایمان کی نشانی ہے۔

شفیٰ ابنی داؤد میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور عرض کیا کہ کبھی کبھی میرے دل میں ایسے بُرے خیالات آتے ہیں کہ جل کر کوئلہ ہو جانا مجھے اس سے زیادہ محبوب ہے کہ میں ان کو زبان سے نکالوں، آپؐ نے ارشاد فرمایا، اللہ کی حمد اور شکر ہے جس نے اس معاملہ کو دوسرے کی طرف لوٹا دیا ہے۔ گویا حضورؐ نے اس شخص کو بتا دیا کہ فکر مند ہونے کے بجائے اللہ کا شکر ادا کرو کہ ان بُرے خیالات کو تم دسو سے دیکھتے ہو اور ان کو زبان پر لانا جنہیں کسی صورت کوہرا نہیں۔

رحمۃ عالم ﷺ نے ایسے دوسو سو کا حتمی علاج بھی اس آیت کو بتا دیا ہے صحیحین کی ایک اور حدیث میں آپؐ کا یہ ارشاد نقل ہوا ہے کہ لوگوں میں ہمیشہ فضول سوالات اور چون و چرا کا سلسلہ جاری رہے گا یہاں تک کہ یہ احتقانہ سوال بھی کیا جائے گا کہ اللہ نے سب مخلوق کو پیدا کیا تو پھر اللہ کو کس نے پیدا کیا ہے؟ پس جس کو اس سے سابقہ پڑے وہ یہ کہہ کر بات ختم کر دے کہ اللہ پر اور اس کے رسولؐ پر میرا ایمان ہے۔

مطلب یہ کہ مومن کا طرز عمل ایسے دوسو سو کے بارے میں یہ ہونا چاہیے کہ وہ سوال کرنے والے یا دوسرے لٹنے والے یا اپنے نفس سے صاف کہہ دے کہ اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان کی روشنی مجھے نصیب ہو چکی ہے اس لیے میرے نزدیک یہ سوال ایسا ہی لایعنی ہے جس طرح کسی آنکھ والے سے یہ سوال کرنا حماقت ہے کہ سورج میں روشنی ہے یا نہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں دوسو سو کے شر سے بچائے اور کسی حالت میں بھی ان کو ہماری زبانوں پر نہ آنے دے۔

## آزادی نسواں یا شہرِ پنج جاہلیہ

یہ ایک ناچاہلی انکار حقیقت ہے کہ مغرب سے اٹھنے والی "تحریک نسوانیت یا تحریک آزادی نسواں" (Feminist Movement) نے گزشتہ ایک صدی کے اندر نہ صرف سارے یورپ اور امریکہ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے بلکہ اس نے اکثر ایشیائی اور افریقی ممالک میں بھی اپنے پنجے گاڑ لیے ہیں۔ ان میں نہ صرف اشتر کی بلکہ بہت سے مسلمان ممالک بھی شامل ہیں۔ یہ تحریک جوابِ تہذیبِ مغرب کا نچوڑ والہ ٹھکانہ بن چکی ہے اس کے عالمِ آفکار افراسیاب و مقاصد یہ ہیں کہ عورت کو معاشرتی، اقتصادی، سیاسی غرض زندگی کے ہر شعبے میں وہی حقوق حاصل ہوں جو مردوں کو حاصل ہیں۔ ان کی شخصی آزادی پر کسی قسم کی قدغن نہ ہو۔ دختر وں اور کارخانوں کی ملازمت ہو یا آزاد تہذیبی اور صنعتی پیشے، مختلف قسم کے کھیل ہوں یا دوسرے تقریبی مسائل عورت ان سب میں مردوں کے برابر حصہ لینے یا ان کے شانہ و بشانہ چلنے کا حق رکھتی ہے۔ ازدواجی زندگی کی دوسرا دہریاں انہوں کی پرورش اور تربیت خاندان کی خدمت، بزرگوں اور شوہر کا احترام وغیرہ سب وقایاں ہی باتیں ہیں۔

اقوامِ مغرب کا دعویٰ ہے کہ (ماذی اعتبار سے) ان کی تعمیرِ غیر ترقی اسی تحریک آزادی نسواں کی سرہونِ جنت ہے کیونکہ انہوں نے ہر شعبہ زندگی میں اپنی خواہشیں کو مردوں سے مسابقت کا موقع دیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اعلیٰ مغرب نے گزشتہ ایک صدی میں ماذی اعتبار سے حیرت انگیز ترقی کی ہے لیکن یہ کہنا صحیح نہیں کہ ان کی ترقی محض آزادی نسواں کی بدولت ہے۔ فی الحقیقت اس ترقی کے اور بہت سے اسباب بھی ہیں جن میں بے پناہ قدرتی وسائل اور سائنسی علوم کے حصول کا بے پناہ جذبہ سرگرمیت ہیں۔ جہاں تک اس تحریک کا تعلق ہے تو اس کے نتیجے میں ان کے ہاں عورتوں کی آزادی اور بے باکی اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ ان میں نسوانیت کی





شرمناک مانع کانوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ انھیں دیکھ کر یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہم نے اخلاقی اور معاشرتی شعبوں میں ترقی سکھوں کی ہے اور رجب عالم کی بعثت سے پہلے والا "تہذیب جاہلیہ" کا دور واپس آ گیا ہے۔ وہی تہذیب جاہلیہ جس پر اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں قرین کی ہے اور اللہ کے رسول ﷺ نے بھی جسے (متحدہ حدیث صحیحہ میں) سخت ناپسندیدہ بلکہ فعلی حرام قرار دیا ہے۔

"تہذیب" کا لفظ اصل میں تہذیب سے ماخوذ ہے۔ "تہذیب" اور "تہذیب" دونوں بلند و بالا محلوں، قلعوں کی چوٹیوں اور نمایاں ترین کنگروں کو کہتے ہیں۔ ایک تہذیب یعنی بے حجاب اور خود نہائی کی دلدل اور عورت ہر نوع کے تصنع اور تکلف کو کام میں لا کر اپنے حسن و جمال کے ایک ایک ذرا بے کو غیر محرم مردوں کے سامنے پیش کرتی ہے، ہر گھور نے والے کو اپنی جانب لطف اندوزی کے لیے اسی طرح راغب کرنا چاہتی ہے جس طرح ایک بروج اپنی راجہ شان کا اعلان کرتا ہوا ہر دیکھنے والے کی نگاہ کو اپنی جانب ملتفت کر لیتا ہے۔ قرآن و حدیث کی روشنی میں تہذیب جاہلیہ کے معنی ہیں عورت کا اپنی زینت، حسن و جمال، اور بناؤ سنگھار کا بے محابا اظہار کرنا، اپنے چہرے، ٹہرے کے نکھار اور خدا و خال کی خوبیوں کا اشتہار دینا اپنے جسم کے فتنہ خیز اہوار اور اپنے لباس، زیور اور زیب و زینت کی جگہوں کو غیر محرم مردوں کے سامنے ظاہر کرنا اور ہر اس شے کو چھپانے کی کوشش کرنا جو مردوں کی آنکھوں کو ناگوار معلوم ہوتی ہے۔ تہذیب جاہلیہ عورت کی بے حیائی اور بے غیرتی کی سب سے بڑی نشانی ہے۔ یہ عصمت و عفت کی طرف سے اس کی بے پردائی کی ناقابل تردید شہادت ہے۔ یہ تہذیب اور بے حیائی اللہ تعالیٰ کے دین حق اور شریعت اسلامیہ کی کھلی توہین اور ٹھٹھیک ہے۔

قرآن میں تو مسلمان خواتین کے لیے واضح حکم ہے۔

وَقَرْنَ لِيْنَ بَيُوْطِكُنَّ وَلَا تَبَرُّجْنَ تَبَرُّجُ الْجَاهِلِيَّةِ الْاُولٰٓئِ

(سورۃ الاحزاب: ۳۳)

”اور اپنے کمروں میں جگہ کر رہو اور قدیم جاہلیت کے زمانے کی سی جج و جج نہ کھاتی  
پھر۔“

یہی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے تو خواتین کو غیر مرد سے بات کرتے ہوئے بھی  
لوچدار آواز میں گفتگو کرنے سے منع فرمایا ہے۔

فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِي هُوَ لِقَابُكَ مِنْ أَهْلِ الْبَيْتِ (الاحزاب: ۳۲)  
”ذہلی زبان یعنی لوچدار آواز سے بات نہ کیا کرو کہ دل کی خرابی میں جتا کوئی شخص لالچ  
میں پڑ جائے۔“

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے تفہیم القرآن میں سورۃ الاحزاب کی تفسیر  
پہاں کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

”یہ ڈراما سچنے کی بات ہے کہ دین عورت کو غیر مرد سے بات  
کرتے ہوئے بھی لوچدار انداز گفتگو اختیار کرنے کی اجازت  
نہیں دیتا اور اسے مردوں کے سامنے بلا ضرورت آواز نکالنے  
سے بھی روکتا ہے، کیا وہ کبھی اس کو پسند کر سکتا ہے کہ عورت اسٹیج  
پر آ کر گائے، ناچے، تھرکے، بھاق بٹائے اور ناز غرے دکھائے؟  
کیا وہ اس کی اجازت دے سکتا ہے کہ ریڈیو پر عورت عاشقانہ  
گیت گائے اور سریلے غنوں کے ساتھ نقش مضامین مناسنا کر  
لوگوں کے جذبات میں آگ لگائے؟ کیا وہ اسے جائز رکھ  
سکتا ہے کہ عورتیں ڈراموں میں کبھی کسی کی بیوی اور کبھی کسی کی  
معشوقہ کا پارٹ ادا کریں؟ یا ہوائی میزبان (Air  
Hostess) بنائی جائیں اور انہیں خاص طور پر مسافروں کا  
دل بھانے کی تربیت دی جائے؟ یا کلبوں اور اجتماعی تقریبات  
اور مخلوط مجالس میں بن ٹھن کر آئیں اور مردوں سے خوب کھل مل  
کر بات چیت اور ہنسی مذاق کریں؟ یہ کچھ آخر کس قرآن سے

برآمد کی گئی ہے؟ خدا کا قرآن تو سب کے سامنے ہے۔ اس میں کہیں اس پتھر کی گنجائش نظر آتی ہو تو اس مقام کی نشان دہی کر دی جائے۔"

مولانا کی یہ تحریر پاکستان میں ٹیلی ویژن آنے سے پہلے کی ہے۔ جب تک وطن عزیز میں ٹیلی ویژن نہیں آیا تھا۔ عورتوں کی بے حجابی اور مغرب زدگی کے طوفان بدقیزری کی رفتار قدرے سست تھی لیکن ٹیلی ویژن آنے کے بعد اس نے جس طرح معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے اسے دیکھ کر حساس اور غیرت مند مسلمانوں کو جس قدر افسوس ہوتی ہے اس کا اظہار انہیں ہوسکتا صرف خون کے آنسو ہی اس کو ظاہر کر سکتے ہیں۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان کا ٹیلی ویژن جسے تبلیغ اسلام، اشاعت تعلیم، تعلیم اخلاق اور تعمیر سیرت و کردار کا سب سے بڑا ذریعہ ہونا چاہیے تھا۔ وہ (اپنے چند دینی اور معلوماتی پروگراموں کو چھوڑ کر) مرد و زن کے آزادانہ اختلاط، بے حجابی اور تہذیب مغرب کی آشوب سامانیاں اور برائیاں پھیلانے کا سب سے بڑا آلہ کار بن گیا ہے۔

آزادی نسواں کی طبعی وادار مغرب زدہ عورتیں اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے احکام کی کھلی بغاوت پر اتر آئی ہیں۔ انہوں نے اپنی ماور پدہ آزادی کو اپنی ذات تک محدود نہیں رکھا بلکہ قرآن حکیم اور احادیث مقدسہ میں خواتین کے بارے میں جو احکام وارد ہوئے ہیں وہ ان سے کھلم کھلا بغاوتی کا اظہار کر رہی ہیں۔ حیرت تو اس بات پر ہے کہ اس طوفان بدقیزری کے آگے بند باندھنے کے بجائے ملک کے ارباب عمل و عقد نے ہمیشہ اس کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ اس کے نتیجے میں وطن عزیز میں آفات و ذکور کا ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا ہے جس کی فطرت مغربی تہذیب اور مادی فلسفوں نے تسخیر کر دی ہے اور وہ ان ساری حدود و قیود سے آزاد ہو چکا ہے جو اسلامی معاشرے کا لٹیرہ امتیاز ہوتی ہیں۔

علامہ اقبالؒ نے عورتوں کی ہوس غلوت کو انکار کی پر گاندگی اور انہری کا

موجب ٹھہرایا ہے۔ مرنے ہیں۔

نوسا کیا اس دور کو جلوت کی ہوس سے  
روشن ہے نگہ آئینہ دل ہے مکدر  
بڑھ جاتا ہے جب ذوقِ نظر اپنی صدوں سے  
ہو جاتے ہیں افکار پرانہ و اتر  
آغوشِ صدف جس کے نصیبوں میں نہیں ہے  
وہ قطرۂ نیساں کبھی بنتا نہیں کوہر

پھر دخترِ انِ ملت کو یہ سہتی دیتے ہیں۔

اگر چدے ز رویشے پزیری  
ہزار آشت مجید تو نصیری  
بتولے باش و پنہاں شو ازیں عصر  
کہ در آغوشِ خمیرے بگیری

اس میں کوئی شک نہیں کہ سرورِ دین کے آزادانہ اختلاط، بے جہانی، عربیائی و  
فاشی کے فتنہ عظیم کے بارے میں تمام دینی مکاتب فکر اور دینی جماعتیں دورائیں  
نہیں رکھتیں، سب کو اس کی مضرت اور اس کے ہولناک نتائج کا احساس ہے مگر یہ دیکھ  
کر ڈکھ ہوتا ہے کہ ابھی تک سوائے گنتی کے چند علمائے کرام اور اصحاب فکر و نظر کے،  
دینی جماعتوں نے منظم طریقے سے پوری قوت کے ساتھ اس فتنہ عظیم کی مزاحمت نہیں  
کی جبکہ اربابِ اقتدار، مغرب زدہ طبقے اور متحدہ بے ضمیر اہمیت پسند صحافیوں کی  
سرپرستی اور بھرپور تعاون کی بدولت یہ فتنہ عظیم اللہ تعالیٰ کے غضب کو دعوت دینے کی  
حد تک پہنچ گیا ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ تمام دینی جماعتیں یک دل و یک جان ہو کر  
اس فتنہ کے خلاف پرامن عملی جدوجہد کریں۔ اہل پاکستان کی اکثریت میں ابھی تک  
اللہ کے فضل و کرم سے احساسِ غیرت اور دینی حیثیت باقی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ

اکثریت اس ہولناک فتنے کے خلاف کسی بھی مستحکم تحریک کا بھرپور ساتھ دے گی۔ اس تحریک کا پہلا قدم یہ ہونا چاہیے کہ وہ ایسے صارف لٹریچر کی زیادہ سے زیادہ اشاعت کا اہتمام کرے جس میں خواتین کو موثر انداز میں بتایا گیا ہو کہ اسلام میں ان کا کیا مقام و مرتبہ ہے، ان کے فرائض و حقوق کیا ہیں اور یہ کہ ٹیڑھے جہانویہ میں جہلاور میں اسلام کی خواتین مطلوب نہیں ہیں بلکہ اسلام کی مطلوب وہ خواتین ہیں جن کو قرآن مجید میں مسلمات، مؤمنات، قانتات، صالحات، خالصات، واکرات، واصلات، صلوات، حصہ قات، مصانمات اور حافظات کہہ کر پکارا گیا ہے۔ اس کے برعکس مسترئید خواتین کی قرآن و حدیث میں جو تعریف کی گئی ہے اس کی تحقیق وہ خود ہی کر لیں یا کسی عالم دین سے پوچھ لیں۔

ہمارے دکھ کی شدت اور بڑھ جاتی ہے جب ہماری مسجد و زوہد اراکین بہنیں اور بیٹیاں اپنی غلط روش کے جواز میں اس قسم کے سوال کرتی ہیں۔ ”قرآن میں کہاں لکھا ہے کہ عورتوں کو گھروں میں بند رکھو۔“ واقعی قرآن میں یہ کہیں نہیں ہے کہ عورتوں کو گھروں میں بند رکھو مگر مسلمان خواتین کو یہ حکم ضرور دیا گیا ہے کہ اپنے گھروں میں قرار پکڑو یا تنگ کر رہو اور لوگوں کو اپنی حج و حج دکھانے کے لیے باہر نہ نکلو۔ جائز ضروریات کے لیے یا جہاد فی سبیل اللہ کے کسی شعبے میں یا تعلیم اور خدمت خلق وغیرہ کے شعبوں میں حصہ لینے سے تو اسلام منع نہیں کرتا اور پھر قرآن میں یہ کہاں لکھا ہے کہ بن ظن کرٹی وی پر آؤ، ملے جو گاؤں راموں میں غیر مردوں سے مشتق لڑاؤ یا ان کی بیوی اور محبوبہ، عورت کا قہار ہوتے ہوئے بھی زچہ اور بچوں کی ماں بنو، ہاکی آکر کٹ اور جتنا سنگ کے کھیلوں میں حصہ لو، اشتہاروں میں ماڈل گرل بن کر ناز فرے دکھاؤ۔ راگ و تگ کے مخلوط اجتماعات میں شریک ہو کر کشش گانوں پر تالیاں بجاؤ۔

کاش ہماری یہ بہنیں اور بیٹیاں تہذیب مغرب کو اپنانے سے پہلے یہ معلوم کر لیتیں کہ اسلام نے انہیں ماں، بہن، بیٹی اور بیوی ہر حیثیت سے کتنا بلند مقام اور مرتبہ دیا ہے اور ساتھ ہی ان کو اتنے شاعرانہ حقوق دیے ہیں کہ کسی دوسرے معاشرے

میں ان کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اس وقت ضرورت ہے کہ مادی قوت کے ساتھ ہم اپنے اندر ایمانی قوت بھی پیدا کریں کہ فی الوقت یہی قوت دین اور دنیا میں ہماری کامیابی کی ضامن ہے اور یہ قوت ہمیں اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے احکام پر عمل کرنے ہی سے حاصل ہو سکتی ہے۔

فضائے بندر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو  
اثر دیتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی  
(عقلمندی خان)



## ملاوٹ

### ایک بدترین گناہ

”ملاوٹ“ کا مفہوم تو بڑا وسیع ہے لیکن عام طور پر کسی گھر کی قیمت کی چیز میں کسی سستی چیز کے ملائے کو ملاوٹ کہتے ہیں مثلاً خالص دودھ میں پانی ملانا، خالص (دہی) دہی میں چربی یا بنا ہستی مٹی ملانا۔ اسی ہوتی سرچوں میں اٹکوں یا لکڑی کا براہ ملانا۔ پتنے کے چھلکوں کو ایک خاص طریقے سے چائے کی پتی میں ملانا وغیرہ وغیرہ۔

ملاوٹ کی ایک اور قسم یہ ہے کہ کسی جنس کی اچھی قسم میں اسی جنس کی ناقص، گھٹیا یا عیب دار قسم ملانا۔ ملاوٹ کی کوئی بھی قسم ہو اس کا مقصد ناجائز منافع کمانا ہوتا ہے۔ اس ناجائز منافع کی مقدار اکثر اوقات اتنی بڑھ جاتی ہے کہ ملاوٹ کرنے والا لالچ میں اندھا ہو جاتا ہے اور دولت کمانے کی انتہائی بڑھی ہوئی ہوس اسے مجبور کرتی ہے کہ ہر خطرے کو سولے لے کر یا انتقامیہ کے بددیانت کارندوں کو رشوت دے کر ملاوٹ کا کاروبار جاری رکھے۔ ملاوٹ خواہ کھانے پینے کی چیزوں میں کی جائے یا دوسری اشیا میں، ہر صورت میں بدترین گناہ ہے لیکن افسوس صد افسوس کہ آج کل وطن عزیز میں ملاوٹ ایک ”منافع بخش“ کاروبار یا تجارت کی صورت اختیار کر گئی ہے اور ملاوٹ شدہ یا جعلی اشیا تجارتی منڈیوں (مارکیٹوں) میں کھلم کھلا فروخت ہو رہی ہیں۔ یہ دیکھ کر اور بھی دکھ ہوتا ہے کہ ملاوٹ کا کاروبار کرنے والوں میں ایسے لوگ بھی شامل ہیں جن کا دعویٰ ہے کہ وہ اللہ اور رسولؐ سے محبت رکھتے ہیں اور دین کا اسلام کی سختی سے پابندی کرتے ہیں (نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ) لیکن یہ گناہ کا کاروبار کرتے ہوئے ان کے ضمیر میں ذرا سی جھین بھی محسوس نہیں ہوتی حالانکہ ملاوٹ کا کاروبار کئی برائیاں کا مجموعہ ہے مثلاً:

۱۔ دوسروں کو فریب دینا یا دھوکے بازی

- ۲۔ ہدیائی
- ۳۔ مہوٹ
- ۴۔ حرام خوردی
- ۵۔ دوسروں کی صحت پر باد کرنا (کھانے پینے کی ملامت شدہ ناقص چیزیں کھلا پلا کر)

اسلام میں امن میں سے کسی بھی برائی کا ارتکاب سخت گناہ ہے۔ ملامت کرنے والا ان سب برائیوں کا مرتکب ہوتا ہے۔ اس سے اس کے گناہ کی سنگینی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ کسی چیز میں ملامت کرنے سے وہ چیز عیب دار ہو جاتی ہے اور کوئی عیب دار چیز فروخت کرنا جائز نہیں جب تک خریدنے والے کو اس کا عیب قلمبند نہ دیا جائے۔ جو ایسا نہیں کرے گا وہ اللہ کے غضب کو دعوت دے گا۔ اس سلسلے میں ہادی اکرم رحمۃ اللہ علیہ کے ارشادات ملاحظہ ہوں:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے خود سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے سنے کہ جس شخص نے کوئی عیب دار چیز کسی کے ہاتھ فروخت کی اور خریدار کو وہ عیب بتلا نہیں دیا تو اس پر ہمیشہ اللہ کا غضب رہے گا آپؐ نے یہ فرمایا کہ اللہ کے فرشتے ہمیشہ اس پر لعنت کرتے رہیں گے۔  
(سنن ابنا ماجہ)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک اصغر کے پاس سے گزرے جو ایک دکاندار کا تھا۔ آپؐ نے اپنا ہاتھ اس اصغر کے اندر داخل کیا تو آپؐ کی انگلیوں نے گیلہا پن محسوس کیا آپؐ نے اس



غلط فروش دکاندار سے فرمایا، تمہارے دامیر کے اندر پہنری کبھی ہے؟

اس نے عرض کیا، غلط پر بارش کی بوندیں پڑ گئی تھیں (تو میں نے اوپر کا بیگ ہانے والا غلط چبچے کر دیا اور خشک غلط اس کے اوپر) آپ نے فرمایا، تم نے اس بھیکے ہوئے غلط کو اوپر کیوں نہ رہنے دیا تاکہ خریدنے والے لوگ اس کو دیکھ سکتے۔ (میں لو) جراثیمی دھوکے بازی کرے (دوسروں کو دھوکا دے) وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ (صحیح مسلم)

طبرانی نے معجم کبیر اور معجم صغیر میں یہی روایت حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اس کے آخر میں ابن القاطا کا اضافہ ہے:

”اس طرح کی دغا بازی اور فریب کا انجام جہنم ہے“ (سند ابی داؤد)

اس میں کوئی شک نہیں کہ ملاوٹ کے ذریعے مال کماتا ناجائز ہے اور ناجائز ذریعے سے کمایا ہوا مال مطلق حرام ہے۔ حرام مال کی نوبت ہر بد انتہائی کو رسول اکرم ﷺ نے اس طرح بیان فرمایا ہے:

”حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ایسا نہیں ہوتا کہ کوئی بندہ (کسی ناجائز طریقے سے) حرام مال کمائے اور اس میں سے بڑا صدقہ کرے تو اس کا صدقہ قبول ہو اور اس میں سے خرچہ کرے تو اس میں (اللہ تعالیٰ کی طرف سے) برکت ہو اور جو شخص حرام مال (مرنے کے بعد) پیچھے چھوڑ کر جائے گا تو وہ اس کے لیے جہنم کا توڑ ہی ہوگا۔ یقیناً اللہ تعالیٰ ہدی کو ہدی سے نہیں

مہاتا بلکہ ہدی کو نکلی سے مہاتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ گندمی گندمی کو نہیں دوسرے سے۔  
(معارف الحدیث جلد ۷ بحوالہ مدنیہ ص ۱۸۵)

ملاوٹ کی طرح ماپ تول میں کمی بھی بدترین گناہ ہے۔ اس طریقے سے کمایا ہوا مال بھی مطلق حرام ہو گا۔ قرآن حکیم اور احادیث نبویؐ میں اس کے لیے سخت وعیدیں آئی ہیں۔ ملاوٹ کے مرتکب کی طرح اس کے مرتکب کی عاقبت بھی برباد ہو جائے گی۔

نا جانکوز رائج سے حرام مال کمانے والوں کے برعکس چائز ذرائع سے حلال رزق کمانے والوں کو آخرت میں بہت بلند درجہ حاصل ہو گا۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ پوری سچائی اور ایمان داری کے ساتھ کاروبار کرنے والا نافرمانیوں اور جہیزیتوں اور قصیدوں کے ساتھ ہو گا۔ (جامع ترمذی، سنن دارمی)

آج کل بازار میں ایسی نقلی اور جعلی اشیاء بھی فروخت ہو رہی ہیں کہ اگر ان کو اصلی چیزوں کے ساتھ رکھ دیا جائے تو اصلی اور نقلی میں تمیز کرنا محال ہے مثلاً مصنوعی زعفران، ساگودانہ، خشک، غیر، شکر سے بنا ہوا شہد، پھلوں کے ایسے شربت جن میں مہند پھلوں کے رس کا ایک قطرہ بھی شامل نہ کیا گیا ہو، مصنوعی روغن بادام، دار چینی وغیرہ وغیرہ۔

ان چیزوں کا کاروبار کرنے والے اسی طرح کے مجرم ہیں جیسے ملاوٹ کا کاروبار کرنے والے۔ ملاوٹ، ماپ تول میں کمی اور جعلی (نقلی) اشیاء کو اصلی ظاہر کر کے بیچنے جیسی برائیاں ہمارے معاشرے کا ناسور بن چکی ہیں۔ اگرچہ ان کا ارتکاب مکئی قوانین میں بھی مجرم ہے لیکن ان کا مرتکب کوئی مجرم شاید ہی سمجھی قانون کی گرفت میں آیا ہو۔ اس کا سبب یہ ہے کہ حکومت کی طرف سے جو لوگ ایسے جرائم کی روک تھام کے لیے مقرر کیے جاتے ہیں وہ اپنے فرائض دیانت داری کے ساتھ انجام نہیں

دیتے اور بددیانت تاجروں کے ساتھ مل جاتے ہیں۔ ایسے جرائم کا انسداد صرف اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ ملک میں اسلامی نظام قائم ہو اور متعلقہ قوانین کا پوری قوت سے نفاذ کیا جائے۔ جب تک یہ نظام قائم نہیں ہوتا، علماء کرام اور اصلاح معاشرہ کا کام کرنے والے اصحاب (بشمول خواتین) کو چاہیے کہ ان برائیوں کے انسداد کے لیے اپنی پوری توانائیاں صرف کریں۔ حکومت کا بھی فرض ہے کہ وہ ایسے بھیانک جرائم کا قلع قمع کرنے کے لیے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرے۔



## جھیز کی بیماری

ہمارے معاشرے میں جن رسموں نے غریب اور متوسط طبقے کے لوگوں کی زندگی اچرن کر رکھی ہے ان میں سے ایک رسم جھیز کی ہے۔ جھیز اس سامان کو کہتے ہیں جو کسی لڑکی کی شادی کے موقع پر اس کے والدین یا سرپرست اس کو دیتے ہیں۔ اس میں زیورات، کپڑے، فرنیچر وغیرہ بھی کچھ شامل ہے۔ بچی بات تو یہ ہے کہ لڑکی کے والدین یا سرپرست قانونی یا اخلاقی یا مذہبی طور پر قطعاً اس بات کے پابند نہیں کہ وہ لڑکی کو جھیز کے نام سے کوئی چیز دیں۔ ہاں اگر وہ اپنی حیثیت کے مطابق کچھ سامان اپنی غوثی سے خاموشی کے ساتھ لڑکی کو دے دیں تو اس پر کوئی اعتراض کی گنجائش نہیں لیکن بد قسمتی سے یہاں یہ ہوتا ہے کہ لڑکے والے باقاعدہ ایسے جھیز کا مطالبہ کرتے ہیں جس میں باقاعدہ بڑی بڑی چیزیں شامل ہوتی ہیں مثلاً ٹیلی ویژن سیٹ، ریفریجریٹر، فریج، زیورات، سکوتر وغیرہ۔ ایسا کرتے وقت لڑکی والوں کی حیثیت کا بالکل خیال نہیں کرتے اور ان کی بھجوری کا قاعدہ اٹھاتے ہیں۔ دوسری طرف امیر اور خوشحال لوگ اپنی بیٹیوں کی شادی میں ہزاروں لاکھوں کی اشیاء جھیز میں دیتے ہیں اور ان کی خوب نمائش کرتے ہیں۔ جھیز کی یہ نمود و نمائش ایک غریب اور متوسط طبقے کے آدمی کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے کہ اگر وہ اپنی بچی کی شادی پر زیادہ سے زیادہ جھیز نہ دے گا تو معاشرے اور برادری میں اس کی جگہ کت جائے گی۔ سوچنے کا یہ انداز لوگوں کو رکی اور نمائش کے کاموں پر ابھارتا ہے جس کے نتیجے میں لوگ حیثیت نہ ہونے کے باوجود جھیز کا دافر سامان فراہم کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ شادی کی تقریب میں کیا امیر اور کیا غریب، جھیز کی باقاعدہ نمائش کر کے لوگوں کو دکھاتے ہیں تاکہ ان کو خوب داد ملے۔ جس لڑکی کا باپ جھیز دینے کی استطاعت نہیں رکھتا وہ سخت ذہنی پریشانی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ایک سلیقہ شعار، سمجھنے اور

تو دل بھرت لڑکی کے لیے بھی چیز کے بغیر رشتہ ملنا مشکل ہوتا ہے۔ باپ بھورا قرمز  
لے کر اپنی بیٹی کے لیے چیز کا سامان فراہم کرتا ہے۔ اس کے نتیجے میں اس کی معاشی  
حالت خراب ہو جاتی ہے اور بعض مرتبہ خلت تا خوشگوار واقعات پیش آتے ہیں۔

لڑکے والوں کے لیے لڑکی والوں سے چیز کا مطالبہ کرنا خلت گھٹیا حرکت  
ہے۔ بعض اوقات وہ لڑکی والوں سے ایسی ایسی چیزیں کا مطالبہ کرتے ہیں جن کا سہیا  
کرنا ان کی استطاعت سے باہر ہو جاتا ہے لیکن حالات انہیں یہ مطالبہ پورا کرنے پر  
مجبور کر دیتے ہیں خواہ اس کے لیے انہیں کتنی ہی بیماری قیامت ادا کرنی پڑے۔ یہ سزا تو  
یہ چاہیے کہ ایسے مطالبے کرنے والوں کو منہ ہی نہ لگایا جائے کیونکہ لالچی کی کوئی حد  
نہیں ہوتی۔ جو لوگ لڑکی جیسی دولت لے کر خوش نہیں ہوئے انہیں سب کچھ دے دیا  
کر بھی اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ لڑکی ایسے لاپٹی سسرال میں خوش رہے گی۔ اگر  
دارا معاشرہ ہاشمور ہو تو ایسے لاپٹی لوگوں کو کسی نہ بھولنے والا سبق دیا جاسکتا ہے۔ اس  
قسم کی ایک عمدہ مثال حال ہی میں سننے میں آئی ہے۔

ہجاب کے ایک گاؤں میں ایک نوجوان نے اپنے ہونے والے سسر سے  
چیز میں سکڑ کا مطالبہ کیا۔ لڑکی اور اس کے والدین نے اس پر ناگواری کا اظہار  
کیا اور یمن تقریب نکاح کے وقت شادی سے انکار کر دیا۔ گاؤں کے لوگوں نے بھی  
ان کا ساتھ دیا۔ مجبوراً وہ لعل اور برات کو ذلیل ہو کر شادی کے بغیر واپس جانا پڑا۔

ایک عجیب صورت یہ بھی دیکھنے میں آئی ہے کہ بعض والدین چیز کا سامان نہ  
ہونے پر اپنی لڑکی کے لیے خلت پریشان رہتے ہیں لیکن جب ان کے اپنے بیٹے کی  
شادی کا مسئلہ سامنے آتا ہے تو ایسی لڑکی ڈھونڈتے ہیں جو زیادہ سے زیادہ بھرت لے  
کر اپنے ساتھ آئے۔ گویا وہ جس چیز کو اپنے پر بار بگھتے ہیں دوسروں سے اسی کا مطالبہ  
کرتے گھتے ہیں۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو ان کا رویہ اخلاقی لحاظ سے خلت  
ناپسندیدہ ہے۔ جو چیز ہم اپنے لیے پسند نہیں کرتے دوسروں کے لیے اس کو پسند کرنا  
کہاں کا انصاف ہے؟

حقیقت میں چیز ایک بیماری ہے جو انسان کے جذبات اور اس کے اخلاق پر بری طرح اثر انداز ہوتی ہے۔ اچھے جذبات کی پرورش اور اخلاق کی تعمیر کے لیے ضروری ہے کہ دکھاوے کے کاموں سے پرہیز کیا جائے اور چیز کو موردِ نمائش کا درجہ نہ دیا جائے۔ دکھاوا اللہ کو بھی پسند نہیں۔ وہ تو صرف ان کاموں کو پسند کرتا ہے جو حقیقتاً بھلائی کے کام ہوں اور غلوں کے ساتھ انجام دیے گئے ہوں۔ باپ اگر صاحبِ حیثیت ہے تو وہ اپنی بیٹی کو بہت کچھ دے سکتا ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ سب کچھ شادی کے موقع پر ہی دے اور اس کی نمائش کر کے فریب والدین کے لیے مشکلات پیدا کی جائیں۔ باپ اپنی زندگی میں کسی وقت بھی اپنی بیٹی کو جو چاہے دے سکتا ہے اور مرے بعد تو بیٹی ویسے ہی باپ کی اور ملت میں شریک ہوتی ہے اس لیے یہ خیال کرنا بالکل غلط ہے کہ شادی کے موقع پر باپ نے جی کو کچھ کم دیا تو بعد میں دینے کا موقع نہ ہو گا یا چیز دینے کے بعد لڑکی باپ سے دور نہیں پائے گی۔ اسلام کی رو سے وہ ہر حال میں ورثہ پانے کی حقدار ہے خواہ باپ نے اسے چیز دیا ہو یا نہ دیا ہو۔

اس معاملے کے ایک اور پہلو پر غور کیجیے کہ مرد جب چیز کا مطالبہ کرتا ہے اور فرمائشوں کی فہرست ہونے والے سسرال کے سامنے رکھ دیتا ہے تو حقیقت میں وہ اپنے آپ کو اپنے اصل مقام سے گرا دیتا ہے کیونکہ شوہر کا مقام یہ ہے کہ وہ بیوی پر خرچ کرے۔ اس کا مرادوا کرے اور اس کا تان غفلت بھی پیدا کرے لیکن چیز کا مطالبہ اس کے بالکل برعکس ہے اور مرد کے لیے بڑی بے غیرتی کی بات ہے کہ ایسا مطالبہ کر کے دینے کے مقام سے اتار کر لینے یا بالکلے کے مقام پر آ جائے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ گزشتہ سالوں میں چیز کی خریدیوں کو حکومت کی سطح پر شدت سے محسوس کیا گیا اور ان پر قابو پانے کے لیے قانون کا سہارا لینے کی کوشش بھی کی گئی لیکن اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ دراصل اس بیماری کا علاج قانون کے ذریعے ہونا مشکل ہے۔ اس کے لیے عوام کے شعور کو بیدار کرنے، چیز کی برائیوں کی تشہیر کرنے اور اس کے خلاف منظم تحریک چلانے کی ضرورت ہے۔ صرف عوامی دباؤ

ہی کے ذریعے اس بیماری کی روک تھام کی جاسکتی ہے۔ اگر مہام جہیز کا مطالبہ کرنے والے اور جہیز کی نمائش کرتے والے دونوں قسم کے لوگوں سے نفرت کا اظہار کریں تو آہستہ آہستہ یہ بیماری خود بخود ختم ہو جائے گی۔

مجموعی طور پر پاکستانی معاشرہ ایک مسلمان معاشرہ ہے۔ اس لیے ہم میں سے ہر ایک کو رسول اکرمؐ کا یہ ارشاد ہمیشہ اپنے دل میں نظر رکھنا چاہیے کہ ”جس نکاح میں جتنا کم خرچ کیا گیا ہوتا ہے وہ نکاح خیر اور کثرت کا باعث ہوگا۔“ (مسکوٰۃ)

بعض لوگ جہیز کے جواز میں یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی بیٹی حضرت فاطمہ الزہراءؑ کو جہیز دیا تھا۔ یہ دلیل صحیح نہیں ہے کیونکہ حضور ﷺ نے حضرت فاطمہؑ کو ضرورت کی چند چیزیں منگلیں، چکیاں، بھجور کے چوں سے بھرا ہوا گدا و فیروہ دی تھیں جنکی موجودہ زمانے کے رکن جہیز سے کوئی نسبت ہی نہیں۔ چونکہ حضرت علیؑ کے پاس گریباں نہیں تھا اس لیے ضرور نا آپؑ نے یہ چیزیں عنایت فرمائیں۔ حضرت عائشہؓ کا نکاح اس سادگی کا حقیقی تصور تھا جو اسلام پیدا کرنا چاہتا ہے۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے ان کو کوئی جہیز نہیں دیا۔ دراصل صحابہ کرامؓ کے زمانے میں جہیز کا تصور نیک نہ تھا۔

غرض جہیز کی جو رسم رائج ہو گئی ہے اور جس بنا پر لڑکے والے لڑکی والوں سے طرح طرح کی چیزوں کا مطالبہ کرتے ہیں اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ جہیز کی دم بچینا ایک بیماری ہے اور اس سے نجات پانے کے لیے ہم سب کو کوشش کرنی چاہیے۔ لڑکے والوں کو کسی قسم کا مطالبہ نہیں کرنا چاہیے۔ اسی طرح لڑکی والوں کو چاہیے کہ جو لوگ جہیز کا مطالبہ کریں ان کو لڑکی نہ دیں۔ لڑکی والے اگر اپنی خوشی سے کچھ سامان لڑکی کے ساتھ کر دیں تو اس کی ضرورت نمائش ہرگز نہ کریں۔ دوسری طرف لڑکے والے لڑکی کو جہیز کم لانے کا طعنہ بھی نہ دیں بلکہ لڑکی ہی کو سب سے بڑی دولت سمجھیں اور اس کو اپنی بیٹی کا درجہ دیں۔ اسی طرح معاشرہ کی صحت مند بنیادوں پر تعمیر ہو سکتی ہے۔

## مردوں کو بُرا مت کہو

صحیح بخاری میں ائمہ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَا تَقْسُوا الْأَمْوَاتَ فَإِنَّهُمْ كَلَّا الْعُضَا إِلَى مَا قُلْتُمُوهُ۔

”یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم مردوں کو بُرا مت کہا کرو کہ بے شک انہوں نے جیسا بھی فعل کیا اس کو بخلی گئے۔“

اس حدیث پاک میں سرورِ عالم ﷺ نے بطورِ غیا میں مردوں کو بُرا کہنے سے اس لیے منع فرمایا ہے کہ مرنے کے ساتھ ہی ان کا دنیا سے تعلق ٹوٹ چکا اب ان کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے اگر انہوں نے دنیا میں اچھا فعل کیا ہے تو اس کا انہیں اچھا بدلہ دیا جائے گا اور اگر بُرا فعل کیا ہے تو اس کا بُرا بدلہ دیا جائے گا جیسا کہ قرآن حکیم میں ارشاد ہوا ہے۔

فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ ۖ

وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ ۖ

”یعنی جس نے ذرہ بھر نیکی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا۔“

”اور جس نے ذرہ بھر برائی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا۔“

فی الحقیقت اسلام کی اخلاقی تعلیمات میں بد گوئی، بد گمانی، سب بھنی، طعن دہنی، تجسّس اور تحقّق کو نہایت بُرے خصائل قرار دیا گیا ہے۔ کسی زندہ و سلامت آدمی پر سب و ختم کرنا تو کچھ اسلام نے سکھار کے سامنے ان کے جس کو بھی بُرا کہنے سے منع کیا ہے کہ مہارحمہ اس کے جواب میں ہمارے سچے خدا کو بُرا کہیں اور بپ کوئی آدمی مر جائے تو اس کا اپنے کلمہ و اقرباء سے کوئی تعلق باقی رہتا ہے نہ دوستوں سے



نہ دشمنوں سے اور نہ دنیا کے کسی اور معاملے سے باپ نہ وہ اپنی مخالفت کر سکتا ہے نہ اپنے خلاف کسی بات کا جواب دے سکتا ہے اس لیے اس کو نہ اکابر حضرت محض ہے۔ بلکہ کسی مرنے والے کو برائی سے یاد کرنے میں کئی خطرات نظر میں ہیں۔ ہو سکتا ہے اللہ تعالیٰ نے اسے کسی فتنی پر بخش دیا ہو۔ اب اس کو نہ اسے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ غفور مہربان پر اعتراض کر رہے ہیں اس نے تو اپنے بندے کی مغفرت کر کے اسے اچھوں میں شامل کر لیا ہے لیکن ہم اس کو غشائے الہی کے خلاف فردوں میں شامل کر رہے ہیں ظاہر ہے کہ یہ بڑے گناہ کی بات ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ ہم جس ظاہری سبب کی بناء پر کسی مرنے والے کو برا بھلا کہہ رہے ہوں وہ اس میں معذور ہو اور اس کے عذر یا مجبوری کا ہمیں علم ہی نہ ہو۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ مرنے والا نماز ادا کرنے کے لیے مسجد میں نہ آتا تھا اور اس کا سبب اس کی کوئی ایسی جسمانی بیماری تھی جس کو وہ ظاہر نہیں کر سکتا تھا جیسے پیٹے میں بد بوی، سر پکڑنا، مانگوں میں درد یا کمرہری وغیرہ اب ہم اگر یہ کہہ کر اس کی برائی کریں کہ فلاں شخص بے نماز تھا، وہ مسجد میں نہ آتا تھا، کاسق تھا وغیرہ وغیرہ تو یہ بڑی زیادتی ہوگی۔ ہو سکتا ہے کہ وہ شخص اپنی سہولت کے مطابق کھڑے نماز پڑھ لیتا ہو اور پتہ کریم سے مغفرت طلب کرتا رہتا ہو۔ اب اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے تو ہم اس کو برائی سے یاد کر کے طبیعت اور بدگمانی کے مرکب کیوں ہوں؟ اسی لئے منظور رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا ہے کہ کسی شخص کے ظاہری اعمال کی بناء پر اس کو حتمی طور پر حتمی یا حتمی قرار نہ دو، ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو کسی ایسے عمل کی بناء پر جہنماری لگا ہوں سے پوشیدہ ہو، بخش دے یا سزا دے۔

امام جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ”شرح الصغیر“ میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میت کی خوبیوں کا ذکر کرو اور برائیوں سے اپنی زبان بند رکھو۔

مطلب یہ ہے کہ ہر انسان میں خوبیاں بھی ہوتی ہیں اور خامیاں بھی۔ بہتر یہ ہے کہ اس کی خامیوں کو نظر انداز کر دیا جائے اور خوبیوں کا ذکر کیا جائے۔ مثلاً

رحمت خداوندی کو جوش آجائے اور مرنے والے کا ذکر خیر ہی اس کی مغفرت کا سبب بن جائے۔

حضور ﷺ رحمت دو جہاں اور معظم انسا بیت تھے آپؐ نے نہ صرف اپنے زندہ بھائیوں سے خشن سلوک کی تعلیم دی ہے بلکہ اس دنیا سے گزر جانے والوں کا بھی احترام کرنا سکھایا ہے یہاں تک کہ کافروں کی لاشوں کی بھی بے حرمتی کرنے کی اجازت نہیں دی۔ عرب میں رواج تھا کہ دشمن کی لاش کاٹ لیتے تھے یعنی اس کے ہونٹ، ناک اور کان و غیرہ کاٹ ڈالتے تھے اور بعض دوسرے اعضاء کو بھی بگاڑ دیتے تھے حضورؐ نے اس کو نہایت بُری حرکت قرار دیا اور سختی سے اس کی ممانعت فرمائی۔

غزوہ ہند میں کفار کے ستر آوی مارے گئے یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے آپؐ اور آپؐ کے صحابہؓ کو ستانے میں کوئی کسر اٹھانہ رکھی تھی یہاں تک کہ آپؐ کو اور آپؐ کے نام لیواؤں کو اپنا گھریار اور وطن چھوڑنا پڑا تھا آپؐ چاہتے تو ان کی لاشیں کتوں اور ندوں اور چیلوں کے لیے چھوڑ سکتے تھے لیکن آپؐ کی شان بدرجہی کو یہ گوارا نہ ہوا۔ ان سب کی لاشوں کو ایک بڑے کنوئیں میں ڈال کر اس کو مٹی سے بند کر دیا اور پھر ان کو برا بھلا کہنے کے بجائے صرف یہ ارشاد فرمایا کہ اے فلاں اے فلاں تم نے دیکھ لیا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ سچا کر دکھایا۔

ایک لڑائی میں ایک مسلمان نے کسی متکبر کافر کی لاش کاٹ لیا تھا حضورؐ چاہا۔ حضورؐ کو معلوم ہوا تو آپؐ سخت ناراض ہوئے اور فرمایا ایسا کر دے تو کیا خبر اللہ تعالیٰ آخرت میں تمہارے اعضاء بھی بگاڑ دے۔

ایک مرتبہ حضورؐ کسی جگہ تشریف فرما تھے کہ آپؐ کے سامنے سے ایک جنازہ گزرا آپؐ احتراماً کھڑے ہو گئے۔ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا "یا رسول اللہؐ یہ جنازہ تو ایک یہودی کا تھا۔" حضورؐ نے فرمایا "تو کیا ہوا وہ بھی تو ایک جان تھی۔" یہ بھی شرف انسا بیت کی معراج جس کا مونس حبیب دو عالم ﷺ نے دنیا کے سامنے پیش کیا۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں حضورؐ کے نساۓ خاندان پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور  
ہماری زبانوں کو نثر و دل کی برائیاں بیان کرنے سے آلودہ نہ ہونے دے۔  
آمین ثم آمین

☆☆☆☆☆

### حدیث نبویؐ

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا،  
لوگو! تمہیں معلوم ہے کہ نبیّت کیا ہے۔ انہوں نے عرض کیا کہ اللہ اور اس کا رسول  
بہتر جانتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا، نبیّت یہ ہے کہ تو اپنے بھائی کی وہ بات اس کے  
پس پشت بیان کرے جس سے وہ ناخوش ہو۔ کسی نے عرض کیا، اگر میرے بھائی میں  
وہ (بری) بات موجود ہو جو میں کہتا ہوں تو پھر کیا حکم ہے۔ آپؐ نے فرمایا، اگر اس میں  
واقعی وہ بات موجود ہے جو تو کہتا ہے تو تو نے اس کی نبیّت کی اور اگر وہ بات اس میں  
نہیں ہے تو تو نے اس پر بہتان بانٹ دیا۔  
(صحیح مسلم)

## اپنی زبان پر قابو رکھیے

زبان دیکھنے میں تو گوشت کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا ہے لیکن دراصل یہ غریب اور محبت، دوستی اور دشمنی، سکون اور بے چینی، امن اور فساد کی نگہی اور جڑ ہے۔ اگر اسے ایک منہ زور گھوڑا بنا کر بے لگام چھوڑ دیا جائے تو انسانی معاشرے میں، جھڑے، فساد اور دشمنی کے ہیلے بھڑکنے لگتے ہیں اور معاشرہ ایک خطرناک آتش فشاں کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور اگر اسی زبان پر قابو رکھا جائے اور اس کو گھج طرحیے سے استعمال کیا جائے تو معاشرے پر نہایت خوشگوار اثر پڑتا ہے اور یہ بھائی چارے، باہمی شفقت، ہمدردی اور محبت کے پرسکون گھزار اور باغ و بہار میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ تاریخ میں ایسی بہت سی مثالیں ملتی ہیں جب کسی ملک کے حکمران نے زبان سے کسی دوسرے ملک کے خلاف کوئی تلخ جملہ نکال دیا تو دونوں ملکوں کے درمیان جنگ کے ہیلے بھڑک اٹھے اور ہزاروں قیمتی جانیں ضائع ہو گئیں۔ دوسری جو برہادی ہوئی وہ الگ۔ اس کے برعکس کسی حکمران نے دوسرے ملک کے لیے نیک تمناؤں کا اظہار کیا، اس کے حکمران اور باشندوں کے لئے محبت آمیز الفاظ استعمال کیے تو دونوں ملکوں کے درمیان دوستی اور باہمی تعاون کا خوشگوار رشتہ قائم ہو گیا۔

زبان کا بے قابو ہونا کیا ہے؟ زیادہ ضرورت کے بغیر باتیں کرنا، لغو اور فضول باتیں کرنا، بھٹی اور بھٹی سے بات کرنا، گالی دینا یا بدزبانی کرنا، بات بات پر قسم کھانا، کسی کی پیٹھ پیچھے اس کی بُرائی کرنا، کسی کے خاندان یا نسب میں کیڑے ڈالنا، کسی کی شکل و صورت، رنگ روپ یا جسمانی عیبت پر طعن زنی کرنا، کسی کو غریبی کا طعنہ دینا اور اپنی بڑائی ظاہر کرنا، بچوں کو ہر وقت ڈانٹ ڈپٹ کرتے رہنا، بڑوں کے ساتھ گستاخی سے پیش آنا، دوڑتی یا دوغلا پن کی بات کرنا، جھوٹ بولنا، ڈانگیں مارنا، چٹلی کھانا، کسی پر بہتان باندھنا، دوسروں پر بدگمانی کا اظہار کرنا، کسی پر احسان کر کے اس

کو جتنا، خوشامد کرتا، زبان کے چسکے کی خاطر نقصان دہ چیزوں کے کھانے پینے سے پرہیز نہ کرتا وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب باتیں زبان کے بے قابو ہونے کو ظاہر کرتی ہیں۔

اس کے برعکس زبان پر قابو رکھنا یہ ہے کہ ان سب باتوں سے بچا جائے۔ دوسروں کے ساتھ بدی صفتی اور نرم زبان میں گفتگو کی جائے۔ سخت لگائی اور چنچڑاپن کام بگاڑتا ہے اور شیریں زبانی کام سنوارتی ہے اور دوسروں کا دل جیتی ہے۔ بڑوں کو ادب اور احترام سے مخاطب کیا جائے۔ اگر آج آپ ان کے ساتھ گستاخی سے پیش آتے ہیں تو کل آپ کے بچے بھی آپ کے ساتھ اسی طرح پیش آئیں گے۔ مثل مشہور ہے، "جو بوزے کے سو کا نوکے"۔ اگر کوئی شخص سوچ کر پیامید رکھے کہ گندم بکانے کا تو اس سے بڑا کوئی مامق نہیں۔

بہت سی طرح بڑوں کا ادب و احترام کیا جائے اسی طرح چھوٹوں پر بھار اور محبت کے پھول برسائے جائیں۔ چھوٹوں پر بے جا سختی کرنا اور ان کے ساتھڑکھائی اور لٹی سے بات کرنا بھی اچھے نتائج پیدا نہیں کرتا۔ ہمیشہ سچ بولنے کی کوشش کی جائے کیونکہ جھوٹ سب برائیوں کی جڑ ہے۔

دوسروں کو سلام کرنے میں تاہل کی جائے۔ جو آدمی کسی مصیبت میں مبتلا ہو، اس کے ساتھ ہمدردی کی جائے۔ بیمار کے پاس جا کر اس کو تسلی دی جائے اور اس کو خوش کرنے دلی باتیں کی جائیں۔ ایسی نہیں جن سے وہ اندر پریشان ہو جائے۔ زیادہ اور بے ضرورت باتیں کرنے سے بچا جائے کہ اس سے بہت سی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ صرف وہی چیزیں کہائی یا پئی جائیں جو صحت کے لیے مفید ہوں۔ محفل زبان کے چسکے کے لیے کھٹی میٹھی اور چٹ پٹی چیزوں کا وقت بے وقت زیادہ استعمال نہ کیا جائے بلکہ وقت پر جو کھانا کھایا جائے اس سے بھی قدرے بھوک رکھ کر ہاتھ کھینچ لیا جائے۔

اسلام میں زبان کی حفاظت اور اس کے صحیح استعمال پر زور دیا گیا ہے۔ قرآن حکیم میں حکم ہے کہ لوگوں سے اچھے اور عمدہ طریقے سے بات کرو۔ جب جاہل

لوگ تم سے خطاب ہوں اور جہالت کی باتیں کریں تو ان سے انجسود اور انجسبہ بلکہ کہ  
 میں ہم تو تمہارے لیے سلامتی کی دعا کرتے ہیں۔ ولید بن کاخا ادب کرو کہ انہیں اُنک  
 تک نہ کہو۔ بڑے عجبے میں انسان چڑچڑا ہوا جاتا ہے۔ جب وہ چڑچڑے پہن کا اظہار  
 کریں تو تم خاموش رہو یا نرمی اور محبت سے جواب دو۔ جب غصہ آئے تو اس پر قابو  
 پانے کی کوشش کرو اور اول قول نہ کہو۔ دوسروں کو بڑی محبت اور شفقت کے ساتھ نیکی  
 کی نصیحت کرو اور برے کاموں سے روکو۔ ہمیشہ سچ بولو۔ چغلی، نصیحت اور جہت  
 طراری سے بچو۔ رسول اکرم ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ جس چیز سے کسی آدمی کو زیادہ  
 سے زیادہ خطرہ ہو سکتا ہے وہ زبان ہے۔ آپ کوگوں کو اس بات کی بڑی تاکید فرماتے  
 تھے کہ زبان کو قابو میں رکھا جائے اور ہر قسم کی بری باتوں سے بلکہ بے ضرورت اور  
 بے فائدہ باتیں کرنے سے بھی زبان کو روکا جائے اور جب بات کرنے کی کوئی خاص  
 ضرورت نہ ہو اور اس بات سے کسی بھڑی اور فائدہ کی امید نہ ہو تو خاموش ہی رہا  
 جائے۔

ایک مرتبہ آپؐ نے فرمایا کیا میں تم کو ایسے شخص کی خبر نہ دوں جس پر دوزخ  
 کی آگ حرام ہے، یہ ہر ایسا شخص ہے جو حلال کا حیز نہ ہو، حرام ہو، لوگوں سے قریب  
 ہونے والا ہو، حرام خور۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں مدینہ میں دس سال رسول اللہ  
 ﷺ کی خدمت میں رہا اور میں تو عمر کا تھا اس لیے میرا ہر کام رسول اللہ ﷺ کی  
 مرضی کے بالکل مطابق نہیں ہوتا تھا لیکن دس سال کی اس مدت میں بھی آپؐ نے ایک  
 کہ کے بھی مجھے نہیں ڈانکا اور نہ بھی یہ فرمایا کہ تم نے یہ کیوں کیا یا کیوں نہیں کیا۔

رسول اکرم ﷺ لوگوں کو ہمیشہ شیریں زبان اور خوش کھای کی نصیحت فرماتے  
 تھے اور بد زبان اور سخت کھای سے شدت کے ساتھ منع فرماتے تھے یہاں تک کہ مذی  
 بات کے جواب میں بھی مذی بات کہنے کو آپؐ پسند نہیں فرماتے تھے۔ ایک دفعہ چند  
 یہودی آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور شرارتا کہنا "کنا نم شیکم" (جو دراصل ایک

گالی ہے اور جس کا مطلب ہے کہ تم کو موت آئے (حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے ان کے یہ گستاخانہ الفاظ لے لیے۔ انہوں نے جواب میں کہا: تم ہی کو موت آئے اور تم پر خدا کی لعنت ہو اور اس کا غضب ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اسے عائشہ ازبان روکو، نری کا روئے اختیار کرو اور سختی اور بدزبانی سے اپنے کو بچاؤ۔

حضور بحسب طرح لوگوں کو شیریں زبان بننے کی تلقین فرماتے تھے، اسی طرح غیبت، جنہل خوری، بہتان، دوڑے پن اور جھوٹ بولنے سے بھی منع فرماتے تھے اور سچ بولنے کی ترغیب دیتے تھے۔ آپ کا ارشاد ہے: اللہ کے بندوں کی بیفہ پیچھے برائی نہ کیا کرو اور ان کے پیچھے ہوئے پیچوں کے پیچھے نہ چلو، نہ اللہ تمہیں گھر میں ذلیل کر دے گا۔ بدترین لوگ وہ ہیں جو چغلیاں کھاتے ہیں اور دوستوں میں جھڑائی ڈالتے ہیں۔ کسی پر بہتان باندھنا غیبت سے بھی بُرا گناہ ہے اور بہتان یہ ہے کہ تم کسی شخص سے ایسی برائی اور عیب منسوب کرو جو اس میں موجود نہیں۔ قیامت کے دن سب سے بُرا حال اس آدمی کا ہوگا جو دُرُخا ہے۔ یعنی کچھ لوگوں کے پاس جاتا ہے تو اس کا کس کا اور ہوتا ہے اور دوسروں کے پاس جاتا ہے تو اور۔

زبان کو جھوٹ سے آلودہ نہ کرنے کے بارے میں آپؐ نے فرمایا ہے کہ جھوٹ سے ہمیشہ بچتے رہو کیونکہ جھوٹ بولنے کی عادت آدمی کو بدکاری کے راستے پر ڈال دیتی ہے اور بدکاری اس کو دُرُخ تک پہنچا دیتی ہے۔ تم سہائی کو لازم پکڑو اور ہمیشہ سچ ہی بولو کیونکہ سچ بولنا نیکی کے راستے پر ڈال دیتا ہے اور نیکی جنت تک پہنچا دیتی ہے۔

اللہ اور رسولؐ کے احکام کی روشنی میں ہمارا فرض ہے کہ اپنی زبان کو کلامِ حسن رکھیں اس میں نہ صرف ہماری بلکہ معاشرے کی بہتری بھی ہے۔ زبان کی نری اور مناس اور راست بازی سے ہم میں محبت، یکا گت اور بھائی چارے کا جذبہ پیدا ہوگا جو کسی بھی قوم کی صلاح اور ترقی کا ضامن ہے۔

## چند عجیب عادتیں

ہم میں سے بعض لوگ کچھ عجیب قسم کی عادتوں میں مبتلا ہیں۔ ان کو دیکھ کر ہنسی بھی آتی ہے اور غصہ بھی۔ کچھ تو یہ عادتیں عجیب نہیں بلکہ بُری ہیں، بہت سی بُری، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ان عادتوں میں مبتلا لوگوں کو ان کے بُرا ہونے کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ وہ دیکھتے ہیں کہ ان کی حرکتوں کو کوئی دوسرا نہ دیکھ رہا ہے اور نہ کسی پر ان کا اثر ہوتا ہے۔ حالانکہ دوسروں کو ان سے تکلیف بھی ہوتی ہے اور ان کا دل بھی بُرا ہوتا ہے۔ چونکہ لوگ ان عادتوں میں لاشعوری طور پر مبتلا ہوتے ہیں اس لیے ہم انہیں عجیب ہی نہیں کہے۔ آئیے ذرا ان میں سے چند عجیب عادتوں پر ایک نظر ڈالیں اور پھر سوچیں کہ ان سے کیسے چھٹکارا حاصل کیا جاسکتا ہے۔

دوست ادھاب یا کچھ اور لوگ بیٹھے ہیں ایک صاحب ان کے سامنے بے تکلفی سے اپنی ناک صاف کر رہا شروع کر دیتے ہیں یا زور زور سے کھانسی کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ ان کی اس حرکت سے دوسرے لوگ گھبراہٹ سے کچھ نہ کہیں لیکن سخت کراہت محسوس کرتے ہیں۔ کیا ان کی نظروں سے زور ہو کر ناک صاف نہیں کی جاسکتی یا غلظت نہیں تھوکی جاسکتی؟

آپ دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر چائے پی رہے ہیں اور چائے کے ہر گھونٹ کے ساتھ ضرر کیاں لیتے ہیں۔ کیا آپ نہیں جانتے کہ یہ بد تمیزی ہے اور اس طرح آپ دوسروں کو اپنے اور بیٹھنے کی دعوت دیتے ہیں۔

مزید ذیل اور دوستوں سے ملاقات کے لیے ضرور جانا چاہیے لیکن یہ ضروری نہیں کہ آپ ہمیشہ بغیر اطلاع کے جائیں یا ایسے وقت جائیں جو ان کے آرام کا وقت ہو یا وہ کسی ضروری کام میں مشغول ہوں۔ آخر آپ کا بے وقت جانا ان کے لیے غرضی کا



باعث کیسے ہو سکتا ہے؟ یا لگ بات ہے کہ دوسرے کے بارے میں کچھ نہ کہیں۔

آپ کو کسی دعوت میں بلا دیا جاتا ہے۔ صرف آپ اکیلے کو۔ لیکن دعوت میں آپ اپنے ایک یا دو بھائی یا کسی اور دوست کو بھی ساتھ لے جاتے ہیں۔ میزبان بے چارہ تو منہ سے کچھ نہ کہہ سکے گا لیکن آپ ذرا سوچئے کیا آپ کی یہ حرکت میزبان کے انتظامات کو درہم برہم نہیں کر سکتی؟

آپ دوستوں، عزیزوں اور کچھ دوسرے لوگوں کے درمیان بیٹھے ہیں۔ خوش گیمیاں ہو رہی ہیں۔ اس دوران میں آپ بار بار ٹاک میں اٹھ کر ڈال کر گندا سوار نکالتے ہیں اسے زمین پر ڈال دیتے ہیں یا انگلیوں میں مسٹے لگتے ہیں اور پھر جس صوفے، کرسی یا چار پائی وغیرہ پر بیٹھتے ہیں، اس کے ساتھ چپکا دیتے ہیں۔ کیا دوسرے لوگ آپ کی اس حرکت سے کراہت محسوس نہیں کریں گے؟ اسی طرح اگر آپ کان سے ٹیل ٹال ٹال کر اپنی انگلیوں میں تسلیں کے یا اپنی نشست گاہ سے چپکا لیں گے تو کیا دیکھنے والوں کا دل ٹیلا نہ ہوگا؟

دوست اجنباب کی محفل بھی ہے، ہنسی مذاق ہو رہا ہے۔ آپ بار بار قہقہے لگاتے ہیں اور پاس بیٹھے ہوئے کسی دوست کی طرف اپنا ہاتھ بڑھا دیتے ہیں کہ وہ اپنا ہاتھ اس پر مار کر آپ کی تائید کرے۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ آپ کی یہ حرکت دوسروں کے لیے سخت کوفت کا باعث ہوتی ہے؟

آپ کو سوار کھانے کی عادت ہے۔ اگر آپ اسے ترک نہیں کر سکتے تو آپ کی مرضی مگر کیا یہ ضروری ہے کہ آپ بھری محفل میں سوار کھائیں اور بار بار تھوک کر دوسروں کا دل خراب کریں۔

آپ مریخ تم کھاتے ہیں یا پرہیزی کھانا کھاتے ہیں۔ چلیے یہ آپ کی مجبوری ہے۔ اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں لیکن جب آپ کو کسی دعوت میں بلا دیا جاتا ہے اور کھانا آپ کے سامنے رکھا جاتا ہے، تو آپ ”خزے“ شروع کر دیتے ہیں کہ میں تو مریخ نہیں کھاتا، گوشت نہیں کھاتا، چاول نہیں کھاتا۔ یہ نہیں کھاتا، وہ نہیں کھاتا۔

اس طرح مہمان کی دل چھنی کرنے کی بجائے کیا یہ بھڑ نہیں ہے کہ دعوت میں جانے سے پہلے آپ میزبان کو آگاہ کر دیں کہ آپ ملاں قسم کا کھانا کھائیں گے۔

آپ کا کوئی دوست یا جاننے والا میزبان سے کہیں جا رہا ہے۔ آپ اس کو روک کر باتیں شروع کر دیتے ہیں۔ وہ اخلافا کھڑا ہو جاتا ہے لیکن ہو سکتا ہے کہ وہ جس کام کے لیے جا رہا ہے وہ نہ ہو سکے یا وہ مقررہ وقت کے بعد پہنچے۔ کیا اس طرح کسی کو خواہگو اور کتنا ضروری ہے؟

آپ بازار میں یا سڑک پر جا رہے ہیں۔ راستے میں کوئی دوست مل جاتا ہے۔ آپ اس سے اسی جگہ کھڑے ہو کر طویل گفتگو شروع کر دیتے ہیں۔ یقیناً جانے یہ شریلوں کا طریقہ نہیں ہے۔ اگر گفتگو کرنا ضروری ہے تو سڑک اور بازار سے ہٹ کر بھی کی جاسکتی ہے۔

آپ دوست احباب یا عزیزوں کے ساتھ مل کر کھانا کھا رہے ہیں۔ کھانا کھاتے ہوئے آپ ایسی چیزوں کے نام لیتے ہیں جن سے سننے والوں کو الجھن پیدا ہوتی ہے۔ کیا آپ ایسی حرکت سے احتساب نہیں کر سکتے؟

بچے سب کو پیارے لگتے ہیں جن سے پیار کیجیے لیکن ان کو انہی فنی میں آپ اچھالنے لگتے ہیں یا کھڑکی سے باہر لٹکاتے ہیں۔ کیا اس طرح خطرہ مول لینا ضروری ہے؟

آپ کسی دوست کے ہاں جاتے ہیں جن کے سامنے کچھ کاغذات رکھے ہیں۔ آپ ان کو اٹھا کر دیکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کا دوست کسی کاغذ کو آپ سے پوشیدہ رکھنا چاہتا ہو۔ کیا آپ کی اس حرکت سے اس کو تکلیف نہ ہو گی؟

آپ کسی کے ہاں مہمان جاتے ہیں۔ وہاں میزبان کے ملازم کو ٹھکانا لے لے میں کہتے ہیں پانی لاؤ، یہ کرو، وہ کرو۔ یقیناً جانے آپ کا یہ لب و لہجہ ملازم کو تھکا کر دے گا۔ کیا آپ اس کے ساتھ نرمی اور اخلاق کے ساتھ گفتگو نہیں کر سکتے؟

آپ کے جوان بچے ہیں ، اپنا برا بھلا سمجھتے ہیں ، ان کی کوئی حرکت آپ کو پسند نہیں آتی ، آپ جھلا اٹھتے ہیں ۔ ان کو ڈانٹ ڈپٹ کرتے ہیں اور چیخ چیخ کر گھر پر اٹھا لیتے ہیں ۔ ابھی طرح سمجھ لیجئے کہ اس طرح بچوں میں ضد پیدا ہوتی ہے اور ساتھ ہی آپ کے خلاف نفرت کا جذبہ ۔ کیا آپ ان کو دوستانہ طریقے سے نہیں سمجھا سکتے ؟ کسی مریض کی عیادت یا بیمار پڑی کے لیے جانا بہت اچھی بات ہے ۔ لیکن کیا ضروری ہے کہ اس کے پاس بہت دیر تک بیٹھا جائے ، بلند آواز سے اوٹ پٹانگ باتیں کی جائیں ، بیمار کو تسلی دینے کی بجائے اس کو بیماری کے برے نتائج سے ڈرایا جائے ۔ یہ تو بیمار پڑی نہیں ، مریض کو تکلیف پہنچانا ہے اور پھر جب عیادت کے لیے جاتے وقت چھوٹے بچوں کو بھی ساتھ لے جائیں تو ان کے شور و غل سے مریض کو جو تکلیف ہوگی کیا آپ کو اس کا کچھ اندازہ ہے ۔ کیا یہ بہتر نہیں کہ مریض کے پاس تھوڑی دیر بیٹھیں ۔ اس کو تسلی دیں اور واپس آجائیں !



فریہ کر لاء تو اس میں سے چڑی کے پاس بھی ہدیہ بھیجا اور اگر یہ سنا کر سکوت اس کو نہ ہوا  
کر لاء اور تہوار کوئی چیز وہ بخل لے کر گھر سے باہر نہ لے گا کہ چڑی کے بچے کے  
دل میں اسے دیکھ کر غلٹ پیدا نہ ہو۔

دائے کوئین ﷺ کی ان ہدایات پر خود کرنے سے معلوم ہوگا کہ ان پر  
عمل کرنے سے جہاں مساجدوں سے خوشگوار تعلقات قائم ہوں گے وہاں اللہ اور  
رسولؐ کی طرف سے بھی حاصل ہوگی۔ مساجدوں کو ایذا پہنچانے یا ان کے ساتھ کوئی  
شرارت کرنے کو اٹھوڑ ﷺ نے جس قدر گناہ و باطل قرار دیا ہے اس کا اندازہ  
سمجھنے کی اس حدیث سے کیا جاسکتا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے  
روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک دن ارشاد فرمایا، خدا کی قسم وہ شخص سوچ  
نہیں ہو سکتا، خدا کی قسم اس میں ایمان نہیں، خدا کی قسم وہ صاحب ایمان نہیں، صاحب  
نے عرض کیا یا رسول اللہ! کون شخص؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا، وہ آدمی جس کے  
چڑی اس کی شرارتوں اور مفید و ہمدانوں سے بے خوف اور بے خوف نہ ہوں۔

اس حدیث کی زد سے ہر صاحب ایمان پر لازم ہے کہ مساجدوں سے اس کا  
برتاؤ اور رویہ ایسا شریفانہ ہو کہ وہ اس کی طرف سے بالکل مطمئن اور بے خوف  
رہیں۔ صحیح مسلم میں حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ  
ﷺ نے فرمایا ہے کہ وہ آدمی جنت میں داخل نہ ہو سکے گا جس کی شرارتوں اور  
ایذا رساندوں سے اس کے سامنے مامون نہ ہوں۔ ان دو حدیثوں سے سمجھا جاسکتا ہے  
کہ رسول اکرم ﷺ کی تعلیم و ہدایت میں مساجدوں کے ساتھ خفیہ خلوک کا کیا رویہ  
اور مقام ہے۔ سامان رسالت سے کسی فعل کی سخت تاکید اور دین میں اس کی اچھائی  
اعتد جتانے کی آخری تعبیر یہی ہوتی ہے کہ اس میں کوئی ایسی کرنے والا مومن نہیں پایا  
کہ وہ جنت میں داخل نہ ہو سکے گا۔ گویا مساجدوں کے ساتھ حسن معاملہ کی فکر نہ  
کرنا شقاوت اور بد بختی کی نشانی ہے۔ مساجدوں کے ساتھ حسن معاملہ کا ایک اور پہلو  
یہی ہے جس کا ذکر مسند بخاری میں حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی اس

حدیث میں کیا گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ وہ آدمی مجھ پر ایمان نہیں لایا جو ایسی حالت میں اپنا پیٹ بھر کر رات کو سو جائے کہ اس کے برابر ہونے والی پڑوسی بھوکا ہو اور اس آدمی کو اس کے بھوکے رہنے کی فکر ہو۔ گویا ایک پڑوسی کا دوسرے پڑوسی پر یہ حق بھی ہے کہ اس کے بھوکے پیاس کے سطحوں اور اسی قسم کی دوسری ضرورتوں سے بھی اپنے فکر اور بے نیاز نہ ہو۔

ایک اور حدیث میں پڑوسیوں کے ساتھ خشن معاملہ کرنا اور رسول کی محبت کا معیار قرار دیا گیا ہے۔ اس حدیث میں حضرت عہدِ مہاجر خن بن ابی قریظہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ نے حاضر فرمایا تو صحابہؓ آپ کے دُشوکا پانی لے لے کر اپنے اپنے خیم پر بیٹھ گئے۔ آپ نے ان سے فرمایا کہ تمہارے لیے اس کا کیا باجوست اور نخرگ ہے؟ انہوں نے عرض کیا جس اللہ اور رسول کی محبت۔ آپ نے ارشاد فرمایا، جس کی یہ خوشی اور خواہش ہو کہ اس کو اللہ اور رسول سے نجات کرنا نصیب ہو تو اسے چاہیے کہ وہ ان تین باتوں کا اہتمام کرے، بات کرے تو بچی بولے جب کوئی امانت اس کے سپرد کی جائے تو امانت داری کے ساتھ اس کی حفاظت اور اچھی کا فریضہ ادا کرے اور اپنے مسامیوں کے ساتھ اچھا رویہ رکھے۔

صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہؓ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے یہاں تک فرمایا ہے کہ جو شخص اللہ اور عوامِ آخرت پر ایمان رکھتا ہو، اس کے لئے لازم ہے کہ اپنے پڑوسی کے ساتھ اکرام کا معاملہ کرے۔

صحیحین ہی کی ایک اور حدیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جگر نکل پڑوسی کے حق میں مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے برابر وصیت اور تاکید کرتے رہے یہاں تک کہ میں خیال کرنے لگا کہ وہ اس کو (ایک پڑوسی کو دوسرے پڑوسی کا)

دارت قرار دے دی گئے۔

مساجد کے ساتھ حسن معاملہ میں یہ بات ہی شامل نہیں ہے کہ ان کی مادی ضرورتوں کا خیال رکھا جائے اور ان کے ساتھ غلوگوار تعلقات رکھے جائیں بلکہ یہ بھی ہے کہ ان کی تعلیم و تربیت کا خیال بھی رکھا جائے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی ”کتاب الوعدان“ میں حضرت انہزی لخواہی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک دن ارشاد فرمایا کہ کیا ہو گیا ہے اُن لوگوں کو کہ وہ اپنے پڑوسیوں کو دین سکھانے اور ان میں دین کی بھلا بھ پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ شان کو دھت و صحت کرتے ہیں تا اس پر انصاف و نجی عنی المنتظر کی ذمہ داری ادا کرتے ہیں اور کیا ہو گیا ہے اُن بے علم اور پسماندہ لوگوں کو کہ وہ اپنے پڑوسیوں سے دین سیکھنے اور دین کی بھلا بھ پیدا کرنے کی فکر نہیں کرتے اور شان سے صحت لیتے ہیں۔

رحمۃ عالم ﷺ نے ہرگز مسلم پڑوسی کے ساتھ حسن معاملہ کی تاکید نہیں فرمائی بلکہ غیر مسلم ہمسائے کے ساتھ بھی حسن سلوک کی ہدایت فرمائی ہے۔ منسبہ نذاری میں حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا، پڑوسی تین قسم کے اور تین درجے کے ہوتے ہیں ایک وہ پڑوسی جس کا صرف ایک حق ہو، کم درجہ کا پڑوسی ہے۔ دوسرا وہ جس کے دو حق ہوں اور تیسرا وہ جس کے تین حق ہوں، تو ایک حق والا وہ مشترک پڑوسی ہے جس سے کوئی رشتہ داری بھی نہ ہو، دو حق والا وہ پڑوسی ہے جو مسلم بھی ہو اس کا ایک حق مسلمان ہونے کی وجہ سے ہے اور دوسرا پڑوسی ہونے کی وجہ سے اور تین حق والا وہ پڑوسی ہے جو مسلم بھی ہو اور رشتہ داری بھی ہو اس کا ایک حق مسلمان ہونے کا ہوگا دوسرا حق پڑوسی ہونے کا اور تیسرا حق رشتہ داری کا ہوگا۔

دعا ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کو مساجد کے ساتھ حسن معاملہ کی توفیق دے۔

## گھریلو ملازموں سے برتاؤ!

ہمارے ملک کے کھاتے پیتے گھرانوں میں ملازم رکھنے کا عام رویہ ہے۔ یہ ملازم مرد بھی ہوتے ہیں اور عورتیں بھی۔ دیکھا گیا ہے کہ بعض گھرانوں میں یہ ملازم ساری ساری عمر گزار دیتے ہیں لیکن بہت سے گھرانے ایسے ہیں جن میں ملازم بیک کر نہیں رہتے یا گھروالوں کو آئے دن ملازم بدلنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس کا بڑا سبب گھروالوں کا ملازموں کے ساتھ برتاؤ ہے۔ یہ کہنا تو صحیح نہ ہوگا کہ ہمیشہ گھروالوں ہی کا قصور ہوتا ہے۔ بعض دفعہ ملازموں کا رویہ بھی ٹھیک نہیں ہوتا لیکن عام طور پر ملازموں کا کسی گھرانے کی ملازمت چھوڑنا گھروالوں کے نامناسب سلوک کی وجہ سے ہوتا ہے۔

سب سے پہلے آپ کو یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ کوئی شخص گھریلو ملازمت کی زندگی خوشی سے اختیار نہیں کرتا۔ اس کی وجہ اس کی غریبی ضرورتیں اور دوسری مجبوری ہوتی ہیں۔ آپ اس کو مقررہ تنخواہ یا اجرت ضرور دیتے ہیں لیکن یہ معاوضہ اس کی عزت اور خودداری کا نہیں۔ اس لیے کسی ملازم کو زبردستی غلام سمجھ کر اس پر سختی کرنا یا اس کی عزت اور خودداری کو ٹھیس پہنچانا کسی صورت میں جائز نہیں۔ کیا آپ نے کبھی غور کیا ہے کہ آپ جب کسی ملازم یا ملازمہ کو کسی کام کا حکم دیتے ہیں تو آپ کا لہجہ اس قسم کا ہوتا ہے کہ آپ اسے بہت حقیر سمجھتے ہیں۔ اس قسم کا لہجہ اور برتاؤ ملازم میں احساس کمتری پیدا کرتا ہے اور یہی بات سب خرابیوں کی جڑ ہے۔ اس سے ملازم خود کو غیر سمجھتا ہے اور اس کو صرف اپنی تنخواہ سے غرض ہوتی ہے۔ آپ کے ذکر و یاد یا فائدے نقصان کی کوئی پروا نہیں ہوتی۔ اس کے بجائے اگر آپ کا رویہ ملازموں کے ساتھ محبت اور شفقت کا ہو تو آپ ان کے دلوں میں گھر کر سکتے ہیں۔



ہب وہ یہ سمجھتے ہیں کہ گرے پڑے کام کرنے کے باوجود وہ آپ کی نظروں میں حقیر اور ذلیل نہیں ہیں تو ان میں احساسِ ذمہ داری پیدا ہوتا ہے اور انہیں آپ کے محکمہ و دربارِ نفع و نقصان کا ہیضہ خیال رہنے لگتا ہے۔ بعض گھرانوں میں ملازموں کے ساتھ اچھوتوں جیسا سلوک کیا جاتا ہے۔ ان کے کھانے پینے کے برتن الگ رکھے جاتے ہیں اور ان کو بچا کھچا کھانا دیا جاتا ہے۔ اسی طرح ان کے پگڑیوں کی طرف بھی دھیان نہیں دیا جاتا اور یہ نہیں دیکھا جاتا کہ وہ پھٹے پرانے اور میلے کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔ اس سے ملازموں کے دلوں میں گھردلوں کے خلاف نفرت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ وہ گھردلوں کو بہت مظلوم جانتے ہیں اور خود کو ان کا ہمدرد اور خیر خواہ نہیں بلکہ صرف نوکری سمجھتے ہیں جن کا مقصد آپ کے گھر میں کام کرنے سے صرف اپنی روزی کمانا ہوتا ہے۔ یہ غلط نظر خطرناک ہے۔ اگر آپ چاہیں تو تھوڑی سی توجہ سے اس میں خوش گواری پیدا کی جاسکتی ہے۔ جن برتنوں میں آپ خود کھاتے ہیں ویسے ہی برتنوں میں ملازموں کو کھانا دیں اور جو کھانا آپ خود کھاتے ہیں ان میں سے گھر کے تمام افراد کی طرح ان کا حصہ بھی نکالیں۔ اسی طرح ان کے لباس کا بھی اس حد تک خیال رکھیں کہ یہ گھردلوں کے لباس کی طرح عمدہ اور قیمتی نہ کسی صاف ستھرا اور مناسب ضرور ہو۔ آپ کے ایسا کرنے سے کوئی وجہ نہیں کہ ملازم اپنے آپ کو گھر کا فرد نہ سمجھنے لگیں اور ان کے دلوں میں آپ کی خیر خواہی کا جذبہ پیدا نہ ہو۔

بعض اوقات کوئی ملازم آپ کی بہتری کی خاطر گھریلو کام میں آپ کو کوئی مشورہ دیتا ہے لیکن آپ اسے محض اس بنا پر ٹھکرک دیتے ہیں کہ وہ نوکر ہو کر گھر کے کاموں میں دخل دیتا ہے حالانکہ اس کا مشورہ مان لینے میں آپ کا سراسر فائدہ ہوتا۔ ملازموں کو اس طرح ٹھکرک کر ان کی حوصلہ شکنی نہ کیجیے۔ اگر آپ ملازم کے مشورے کو درست نہیں سمجھتے تو تیار اور بے تکلفی سے بتائیے کہ اس میں یہ نقصان ہے اور اگر اس کا مشورہ صحیح ہے تو کھلے دل سے مان لیجیے اور اس کو شاباش دیجیے۔ پھر آپ دیکھیں گے کہ ملازم آپ پر کس طرح جان چڑھتے ہیں۔ غلطیاں کس سے نہیں

ہو جن کے ملازم بھی انسان ہیں، ان سے بھی غلطیاں ہو سکتی ہیں۔ ان کے منہ سے کوئی نامناسب بات نکل سکتی ہے۔ آپ کے گھر بچپنے میں ان کو دیر ہو سکتی ہے۔ آپ انہیں سودا لانے کے لیے کچھ رقم دیتے ہیں، یہ رقم ان سے گر جاتی ہے۔ ایسی غلطیوں پر آپ کو آپ سے باہر نہیں ہو جانا چاہیے۔ ان کی وضاحت کو ٹھنڈے دل سے سنیں اور جہاں تک ہو سکے ان کو معاف کر دیں۔ لیکن اگر آپ نے ان کو ڈانٹ ڈپٹ اور لعنت ملامت کی یا ان سے نقصان کی رقم وصول کر لی نقد یا ٹکھوا سے کاٹ کر تو اس سے ان کے دلوں میں آپ کے خلاف سخت نفرت پیدا ہو جائے گی۔ ایسے معاملوں میں صرف نرمی اور گزرا اور ختم پوٹی ہی سے آپ ان کے دل جیت سکتے ہیں۔ ایک بڑا مسئلہ جو ہر گھر میں پیدا ہوتا ہے۔ وہ ملازموں پر اعتبار اور اعتماد کا ہے۔ ملازموں کو کبھی یہ احساس نہ ہونے دیجیے کہ آپ ان کی دیانت پر شک کرتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ آپ ہر ملازم پر ہر حالت میں پورا اعتبار کریں لیکن جب تک اس کی بددیانتی کا کوئی پورا ثبوت آپ کے ہاتھ میں نہ آئے اس کی طرف سے بدگمانی کرنا درست نہیں۔ ملازموں کو سودا سلف لانے کے لیے بازار سمجھیں تو ان سے کریڈ کرید کر ایک ایک پیسے کا حساب نہ لیں۔ ہاں اگر آپ یہ محسوس کریں کہ وہ ہر بار سودے کی قیمت زیادہ دیتا ہے تو رازداری سے ان چیزوں کے نرخ بازار سے دریافت کریں۔ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ وہ سودا سلف کی رقم میں سے کچھ رقم اڑانے کا عادی ہو چکا ہے تو پھر آپ اس کو نکال بھی سکتے ہیں اور مناسب احتیاطی تدابیر بھی اختیار کر سکتے ہیں۔

ملازموں کو بددیانتی سے بچانے کے لیے ان کے گھریلو حالات اور ضرورتوں سے بھی کسی حد تک باخبر رہنا ضروری ہے۔ اگر وہ تنگ دست ہیں اور مصیبت میں مبتلا ہیں تو ان سے زبانی ہمدردی بھی کرنی چاہیے اور ان کو مالی امداد بھی دینی چاہیے۔ اگر وہ بیمار ہو جائیں تو بڑی ہمدردی اور توجہ سے ان کا علاج کرایا چاہیے۔ کسی طرح جیسے گھر کے کسی بیمار فرد کا کرایا جاتا ہے۔

ملازموں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ وہ خود کو

آپ کے برابر سمجھنے لگیں گے۔ یہ بالکل غلط خیال ہے۔ ملازم اپنی حیثیت کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ وہ کبھی گھر والوں کی برابری کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ ہاں اپنے اچھے برے اور سے آپ ان کو اپنا سچا خیر خواہ اور وفادار بنا سکتے ہیں۔ اس طرح وہ آپ کے دکھ کو اچھا دکھ سمجھیں گے اور آپ کی خوشی یا فائدہ سے کو اپنی خوشی یا فائدہ سمجھیں گے۔

اکثر ملازم یہ تو ان پڑھ ہوتے ہیں یا ان کی تعلیم بہت کم ہوتی ہے۔ اس لیے شروع شروع میں ان کی عادات و اطوار میں کنٹرول پن پلایا جاتا ہے۔ اگر آپ ان کی تعلیم و تربیت پر مناسب توجہ دیں تو تھوڑے ہی عرصے میں وہ بہت شائستہ اور تمیز دار بن جائیں گے۔ ملازموں کی تعلیم و تربیت پر توجہ دینا اس لیے بھی ضروری ہے کہ گھر کے بچوں کو اکثر ان سے واسطہ پڑتا ہے۔ اگر ملازم تمیز والے ہوں گے اور ان کی عادات اچھی ہوں گی تو بچوں پر بھی ان کو بہت اچھا اثر پڑے گا۔

اسلام میں ملازموں سے اچھا برتاؤ کرنے پر بڑا زور دیا گیا ہے اور یہاں تک حکم دیا گیا ہے کہ جو تم خود کھاتے ہو وہی ان کو کھلاؤ اور جو تم خود پہنتے ہو وہی ان کو پہناؤ اور اگر وہ کوئی غلطی کریں تو ان کو معاف کر دیا کرو۔ ملازموں پر ہاتھ اٹھانا اور ان کو مارنا بیٹانا نہ صرف سخت گناہ ہے بلکہ اس سے وہ آپ کے دشمن بن سکتے ہیں اور کسی وقت نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ ”سب سے برا وہ شخص ہے جس کو اللہ نے افسری اور حکومت دی ہو لیکن اس کے ماتحت اس سے بڑا رہوں اور اس کو برا سمجھیں۔“

مختصر یہ کہ ملازموں سے اچھا برتاؤ کرنے سے اللہ بھی راضی ہوتا ہے اور ہمارا بھلا بھی ہوتا ہے اس لیے ان کو کٹھ پتلیاں نہیں بلکہ باعزت انسان اور اپنے گھر کے افراد سمجھنا چاہیے۔

## یہ عادتیں اپنائیے

ہوں تو انسان کی زندگی کسی نہ کسی وجہ سے گزر رہی جاتی ہے لیکن زندگی کو سنوارنے یا بگاڑنے میں انسان کی بعض عادتیں بڑا اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ کچھ عادتیں ایسی ہوتی ہیں جن کو اپنا کر انسان ہمیشہ فائدے میں رہتا ہے۔ یہاں ہم ایسی ہی چند عادتوں کا ذکر کریں گے۔ بظاہر یہ باتیں معمولی معلوم ہوں گی لیکن غور سے دیکھا جائے تو ان میں سراسر بھلائی ہی بھلائی ہے اور ان کو اپنا کر بے شمار فائدے حاصل کیے جاسکتے ہیں۔

چھپکنے وقت منہ پر کپڑا رکھ لیا کریں

کوئی انسان ایسا نہیں جس کو کبھی چھپک نہ آئے۔ چونکہ چھپکنے وقت چہرے کی حالت بدل جاتی ہے جس سے دوسروں کی ہنسی اور کراہت کا سامان پیدا ہو سکتا ہے اس لیے چھپکنے وقت ہمیشہ منہ پر ہاتھ یا کپڑا رکھ لینا چاہیے۔ اس طرح کھلے منہ میں کبھی یا بھگڑا دوسرے جو اہم بھی داخل نہ ہو سکیں گے۔ رسولی مشہور **چھپکنے** جب چھپکنے تھے تو ہمیشہ اپنا منہ ہاتھ یا کپڑے سے ڈھانک لیا کرتے تھے اور آواز کو نہایت آہستہ کر لیا کرتے تھے۔ آواز کو آہستہ کرنے کا سبب یہ ہے کہ چھپکنے وقت اکثر زبان سے صحیح الفاظ نہیں نکلتے اور کچھ پتے نہیں پڑتا۔ البتہ اگر نہایت آہستگی سے بات کی جائے تو سمجھ میں آ جاتی ہے اور دوسروں کے مذاق کا نشانہ نہیں بنتا پڑتا۔ حضورؐ نے زور سے چھپک مارنے سے بھی منع فرمایا ہے کیونکہ یہ جہتہاں ہی کی ملامت ہے۔ آپؐ نے بھائی لینے وقت بھی منہ پر ہاتھ رکھنے کی ہدایت فرمائی ہے۔

سلام کرنے میں پہل کریں

میکل ماسپ کا سب سے بہتر طریقہ سلام کرنا ہے۔ بعض لوگ دوسروں سے سلام کی توقع رکھتے ہیں اور خود سلام نہیں کرتے۔ اس میں غرور پایا جاتا ہے جو اللہ کو سخت ناپسند ہے۔ سلام میں پہل کرنے سے اللہ بھی راضی ہو جاتا ہے اور دوسرے کے دل میں بھی سلام کرنے والے کے لیے محبت اور شفقت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ وہ شخص اللہ کو بہت پیارا ہے جو سلام کرنے میں پہل کرے۔

سونے سے پہلے ہاتھ صاف کر لیا کریں

سونے سے پہلے اگر کوئی چیز کھائی یا پی جائے تو اس کا کچھ نہ کچھ اثر ہاتھوں پر ضرور رہ جاتا ہے۔ اگر آدمی ہاتھ صاف کیے بغیر سو جائے تو ہو سکتا ہے سوتے میں ہاتھ جسم کے کسی نازک حصے (آنکھ، ناک وغیرہ) کو لگ جائیں اور اس کو تکلیف پہنچے یا ہاتھ کو کوئی چوہا چھو سکے اور وغیرہ کاٹ لے۔ رسول مقبول ﷺ نے فرمایا ہے کہ جو شخص ہاتھ صاف کیے بغیر رات کو سو جائے اور اس کو کوئی تکلیف پہنچے تو اسے اپنے آپ کو ملامت کرنی چاہیے۔

سونے سے پہلے بستر کو جھاڑ لیا کریں

کئی دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ بستر پر کوئی کیل، کانٹا یا کوئی دوسری ٹوک درجہ چڑی ہوتی ہے اگر آدمی بے خبری کے عالم میں بستر پر لیٹ جائے تو اس کو تکلیف پہنچ سکتی ہے۔ اس کے علاوہ اس بات کا بھی احتمال ہے کہ کوئی زہریلا کیڑا بستر میں چھپا بیٹھا ہو۔ بستر کو جھاڑے بغیر اگر آدمی لیٹ جائے تو یہ کیڑا اس کو ضرر پہنچا سکتا ہے۔ اسی لیے رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جب کوئی شخص اپنے بستر پر لیٹنے کا ارادہ کرے تو پہلے اس کو کپڑے سے جھاڑ لے۔ کپڑے سے جھاڑنے میں یہ حکمت ہے کہ کوئی چیز ہاتھ

میں چھوڑ جائے یا کوئی کیڑا نہ کاٹ کھائے۔ انسان کو ایسے ہی ضرر سے بچانے کے لیے حضورؐ نے یہ ہدایت فرمائی ہے کہ جتنا بھی پینے سے پہلے جھانک لینا چاہیے۔

غیند سے جاگ کر پہلے ہاتھ دھوئیں

آری سو کر اٹھے تو اس کو معلوم نہیں ہوتا کہ رات کو غیند میں اس کے ہاتھ بدن کے کسی کس حصے پر بھرتے رہے ہیں۔ اس لیے صفائی اور پاکیزگی کا نگہ رخصا ہے کہ وہ بیدار ہونے پر کسی چیز کو ہاتھ لگانے سے پہلے ہاتھ دھولے۔ رسولِ مقبول ﷺ کا ارشاد ہے کہ جب تم میں سے کوئی شخص سو کر اٹھے تو کسی برتن میں اپنا ہاتھ نہ ڈالے جب تک نہیں مروجہ ہاتھ نہ دھولے کیونکہ اس کو معلوم نہیں کہ رات کو اس کا ہاتھ کہاں کہاں رہا۔

کھانے سے پہلے اور بعد ہاتھ ضرور دھوئیں

کھانے سے پہلے ہاتھ دھونا اس لیے ضروری ہے کہ وہ گرد، میل و غیرہ سے صاف ہو جائیں اور کھانے کے بعد ہاتھ دھونا اس لیے ضروری ہے کہ اگر ان کو پختائی یا سالن و غیرہ لگ گیا ہو تو وہ دور ہو جائے۔ اس طرح کیڑے بھی دروغ ہے سے بچے رہیں گے اور آگے لگنا کہ جیسے بازک، امعاء کو بھی انگلیوں کے مس سے کوئی ضرر نہیں پہنچے گا۔ رسولِ اکرم ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ کھانے سے پہلے ہاتھ دھو کر انہیں تو لیے سے ہرگز صاف نہ کریں بلکہ کھانے کے بعد ہاتھ دھو کر تو لیا استعمال کریں۔

کھانے کے بعد منہ ضرور صاف کیا کریں

دن رات میں کوئی چیز بھی کھائی جائے، اس کے بعد اچھی طرح کلیاں کر کے منہ ضرور صاف کر لیا کریں۔ اس سے کھائی جانے والی چیز کے ذرے دانتوں اور حلق سے نکل جاتے ہیں اور منہ میں بدبو پیدا نہیں ہوتی۔ شربت اور دوا دھ پینے کے بعد بھی لٹھی ضرور کریں۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو شربت کی مٹھاس دانتوں کو طراپ کر سکتی

ہے اور دودھ کی پکنا ہٹ سے منہ میں دلو پیدا ہو سکتی ہے اور چہرے پر نکلیاں جینہ سکتی ہیں۔ منہ صاف نہ کرنے سے دانت بھی بہت جلد خراب ہو جاتے ہیں اور دوسری کئی بیماریاں بھی آسانی کو آگھبرتی ہیں۔

### ہنریاں زیادہ کھایا کریں

یہ ایک اچھی اور سائنسی حقیقت ہے کہ ہنریاں حیاتیات (دماغ) سے بھرپور ہوتی ہیں اور انسانی صحت کے لیے بے حد مفید ہیں۔ ان سے معدہ، جگر، دل، دماغ، احترویوں اور ہڈیوں کو طاقت ملتی ہے اور انسان چاق چوند رہتا ہے۔ جس شخص کو جو ہنری سواقی آجائے اسے اس ہنری کا خوب استعمال کرنا چاہیے۔ پورین، سلاو، نمائز وغیرہ کو پکانے کی بھی ضرورت نہیں۔ یہ کچے بھی کھائے جاسکتے ہیں۔ رسول اکرم ﷺ نے ہنریوں کی افادیت ہی کے پیش نظر ہدایت فرمائی ہے کہ اپنے دسترخوان کو ہنرچروں سے نہ صحت دیا کرو۔

### راستے سے تکلیف دو چیز دور کر دیا کریں

راستے میں اگر کیلوں اور غریبوں کے چھٹکے، کانٹے والی ٹہنی، کانچ کے ٹکڑے اور اذیت پتھر وغیرہ پڑے ہوں تو ان سے راستہ چلنے والوں کو جو تکلیف پہنچ سکتی ہے دور کیا ہے۔ اگر کوئی شخص ایسی کسی تکلیف دو چیز کو راستے سے ہٹا دے تو ہر ایک کو فائدہ پہنچے گا اور اس کا یہ کام خدا سبحان علیٰ میں شمار ہوگا جو اللہ کو بہت پسند ہے۔ اسی لیے رسول اکرم ﷺ نے ہدایت فرمائی ہے کہ راستے سے تکلیف دو چیزوں کو دور کر دیا کرو۔

### کسی کا دروازہ کھٹکھٹاتے وقت اپنا نام بتائیں

کسی کے دروازے پر دستک دیتے وقت (یا کھٹکی بجاتے وقت) اگر اصرار

سے پوچھ لیا جائے کون ہے؟ تو اپنا نام بتانا چاہیے۔ ”نہیں ہوں، نہیں ہوں“ نہیں کہتا چاہیے۔ نام بتانے سے گھروالے اس کو پہچان جائیں گے اور کسی الجھن میں نہیں پڑیں گے۔ رسول اکرم ﷺ کو یہ بات سخت ناپسند تھی کہ دھجک دینے والا اپنا نام بتانے کے بجائے ”نہیں ہوں“ کہے۔

☆ ☆ ☆

۱۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: سنت کا کھانا مت چھوڑو، اس سے بڑھا پاہلدا آجاتا ہے۔

(کتاب شعب الایمان)

۲۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا سب سے زیادہ مخلص میرا بھائی ہے جو مجھے دیکھ کر دعا پڑھتا ہے۔

(صحیح بخاری)

۳۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے فرمایا: اے نبیؐ بہت نہ ڈنکا کرو کیونکہ یاد و فضل رسول کو مرد و عورت ہے۔

(مسلم)



## اعتدال کا راستہ اپنائیے

اعتدال کا مطلب ہے جد سے زیادہ اور نہ جد سے کم۔ اسی کو میانہ دانی بھی کہا جاتا ہے۔ دائروں کا قول ہے کہ ہر کام میں بے اعتدالی کرنے سے نقصان کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ محسنی انسانیت رسول اکرم ﷺ نے بھی اعتدال پر بے حد زور دیا ہے اور فرمایا ہے:

”اے لوگو! اعتدال اختیار کرو۔ اللہ کسی کو تکلیف میں نہیں ڈالتا جب تک تم خود مشقت میں نہ پڑو۔ (یاد رکھو) تمام کاموں میں اعتدال سب سے بہتر ہے۔“

درحقیقت اعتدال قدرت کا سچا اور پکا اصول ہے۔ دنیا کا تمام کارخانہ اسی پر قائم ہے کوئی کام خواہ دینی ہو یا دنیاوی ایسا نہیں جس میں اعتدال کی ضرورت نہ ہو۔ انسان کو اطمینان کی زندگی اسی وقت نصیب ہوتی ہے جب وہ اعتدال پر کار بند ہو اور کبھی اعتدال کو ہاتھ سے نہ جانے دے۔ آج ہمارے معاشرے میں چچی خرابیاں دکھائی دیتی ہیں ان میں سے بیشتر کا سبب یہ ہے کہ لوگ اپنے کاموں میں بے اعتدالی سے کام لیتے ہیں حالانکہ ہمارا دعویٰ ہے کہ ہم ایک اسلامی معاشرے کے افراد ہیں۔ کچھ پوچھیے تو یہ شخص زبانی دعویٰ ہے۔ عملی زندگی میں ہم اس بات کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں کہ اسلامی طرز معاشرت میں اعتدال بنیادی اصول کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ عبادت میں بھی اعتدال کی تلقین کی گئی ہے۔ متواتر روزے رکھنا یا ساری ساری رات عبادت میں مصروف رہنا اور نہ صرف اپنے گھر والوں سے بلکہ دنیا کے دوسرے کاموں سے بھی غافل ہو جانا اعتدال کا طریقہ نہیں ہے۔ اسی لیے اس کو ناپسندیدہ قرار دیا گیا ہے اسلام کا حکم تو یہ ہے کہ دین کو مشکل مت بناؤ۔ عبادت اسی حد تک درست ہے جب تک تمہارا دل اس میں لگا رہے۔ اتنی زیادہ عبادت نہ کرو کہ طبیعت آکٹا جائے اور توجہ دہانی سکون ملنے کی بجائے وحشت ہونے لگے۔ ڈھیری

طرف دنیا کے دھندوں میں اس قدر مشغول نہ ہو جاؤ کہ اللہ کی یاد سے غافل ہو جاؤ۔ سوچنے کی بات ہے کہ جب اللہ اپنی عبادت میں بے اعتدالی پسند نہیں کرتا تو اسے دنیاوی کاموں پر کیسے پسند آسکتی ہے، لیکن آج ہم میں سے کتنے لوگ ہیں جو شادی، بیاہ، بچوں کی پیدائش اور دوسرے رسوم و رواج پر اعتدال کے دائرے کے اندر رہتے ہیں۔ ہم تو ایسے موقعوں پر زیادہ سے زیادہ خرچ کر کے لوگوں کی دلدادہ حاصل کر چاہتے ہیں۔ اگر حکومت ہمارے پھلے کی خاطر مہمانوں کی تعداد اور کھانوں پر پابندی لگاتی ہے تو ہم بے اعتدالی کرنے کے لیے چوری چھپے ایسے طریقے اختیار کرتے ہیں کہ اس پابندی کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔ ایسی بے اعتدالیوں نے کئی گھرانوں کا شکوہ خیم و خیمین لیا ہے اور وہ قرض اور افلاس کے چکر میں ایسے پھنسے ہیں کہ اس سے بچنے کا راپا نامشکل ہے۔ اگر اپنی چار دیکھ کر پاؤں پھیلائے جائیں تو اس میں اپنا بھی فائدہ ہے اور تو مہارملک کا بھی۔

مثلاً ورزش انسانی صحت کے لیے بہت مفید ہے لیکن جب حد سے بڑھ کر ورزش کی جائے یہاں تک کہ آدمی تھک کر پڑے ہو جائے تو یہی ورزش صحت نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔

اچھی اور متوازن غذا صحت بخش ہوتی ہے، لیکن خواہ کیسی عمدہ غذا کھیں، اگر اس کے استعمال میں اعتدال سے کام نہ لیں اور بار بار تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد منہ چلاتے رہیں تو وہ فائدہ دینے کی بجائے زہر بن جاتی ہے۔ معدہ خراب ہو جاتا ہے اور آدمی طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

مطالعہ بہت اچھی عادت ہے لیکن اس میں بھی بے اعتدالی صحت نقصان کا باعث ہوتی ہے۔ وقت بے وقت مطالعہ میں مصروف رہنے سے نہ صرف آنکھوں پر بوجھ پڑتا ہے بلکہ عام جسمانی صحت بھی خراب ہو جاتی ہے۔

بچوں سے زیادہ محبت بہت ضروری لیکن اس میں بھی آپ حد سے بڑھ گئے تو بچے بگڑ جائیں گے۔

گفتگو اور بھل چال سے کسی انسان کی خوبیاں اور خامیاں ظاہر ہوتی ہیں۔

مذہ سے بات نکالنے میں احتیاط اور اعتدال سے کام نہ لیا جائے تو انسان دوسروں کی نظر سے گر جاتا ہے۔ اگر ایک شخص میں چھپھور پن ہے، وہ ڈنگلیں مارتا ہے، دوسروں کی قیمت کرتا ہے، بے محل ہوتا ہے، بار بار بگڑتا ہے اور زور دھتا ہے، تو وہ لوگوں میں ذلیل ہو جائے گا۔ اسی طرح اگر کوئی شخص حد سے زیادہ خاموش رہتا ہے یا حد سے زیادہ کم گو ہے تو بھی سمجھا جائے گا کہ وہ مغرور ہے اور دوسروں کو حقیر سمجھتا ہے۔ آپس میں ہنسی مذاق کرنا برا نہیں، لیکن جب یہ حد سے بڑھ جائے اور تہذیب کے دائرے سے باہر ہو جائے تو لڑائی اور دشمنی کا سبب بن جاتا ہے۔

کچھوی اور بھلی ایک بُری عادت ہے لیکن اپنی آمدنی سے بڑھ کر خرچ کرنا اس سے بھی زیادہ بُرا ہے۔ بعض لوگ خوراک اور پوشاک پر اپنی آمدنی سے بڑھ کر خرچ کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہمیشہ تنگ دستی کا شکار رہتے ہیں۔ اگر کوشش کر کے سادہ خوراک کی عادت ڈالی جائے اور پچھلے رے بازی سے پرہیز کیا جائے تو اس سے خرچ کافی کم ہو سکتا ہے اسی طرح پوشاک زیادہ سستی ہونے کے بجائے سادہ اور صاف ستھری ہو تو اس پر خرچ بھی کم آئے گا اور عزت میں بھی کوئی کمی نہیں آئے گی۔

مختصر یہ کہ اعتدال اور میاندردی میں فائدہ ہی فائدہ ہے اور نقصان کا کوئی پہلو نہیں۔ اگر آج ہم اعتدال کو اپنی زندگی کا اصول بنا لیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہمارے معاشرے کی بہت سی خرابیاں تھوڑی سی مدت میں نیست و نابود نہ ہو جائیں۔ آئیے سچے دل سے عہد کریں کہ ہم کھانے پینے، خرچ کرنے، پڑھنے لکھنے، پہننے اوڑھنے، دوڑنے بھاگنے، ہنسنے ہونے، غرض ہر کام میں اعتدال اور میاندردی سے کام لیں گے۔ اگر آپ نے یہ عہد چھڑا کیا تو آپ دیکھیں گے کہ اس سے صرف آپ ہی کا بھلا نہیں ہوگا بلکہ قوم اور ملک کو بھی بے انتہا فائدہ پہنچے گا۔

## حُسنِ تَکَلُّم یا خوش کلامی

حُسنِ تَکَلُّم یا خوش کلامی (شیریں گفتاری) ایک ایسی اعلیٰ اخلاقی سلسلہ ہے جس کے نتائج اور اثرات نہایت خوشگوار اور دُرُوز ہوتے ہیں اسے اگر بحرِ حلال (وہ چارو جو جائز ہو) کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ خوش کلامی دوست تو دوست دشمن کا دل بھی سوسہ لیتی ہے۔ جس سے میٹھی زبان میں بات کی وہ اپنا بن گیا۔

جہاں رام ہوتا ہے میٹھی زبان سے  
خوش گنتی کچھ اس میں دولت زیادہ

خوش کلامی جلد ہے بدزبانی اور تلخ کلامی کی۔ اسلام میں جہاں بدزبانی اور تلخ کلامی کو ناپسند کیا گیا ہے وہاں خوش کلامی یا شیریں گفتاری کی بہت تاکید کی گئی ہے۔ خوش کلامی کا اطلاق صرف گفتگو یا بات چیت ہی پر نہیں ہوتا بلکہ زبان سے نکلنے والی تمام باتوں پر ہوتا ہے۔ قرآن مجسم میں حکیم دیا گیا ہے:

وَلَوْلَوْ اَنَّ النَّاسَ حَسَنًا (سورہ بقرہ: ۸۳)

(یعنی اے مومنو! لوگوں سے خوش کلامی سے بیش آدیا لوگوں سے بھلی بات کہو)  
سورہ نبی اسرائیل میں فرمایا گیا ہے:

وَقُلْ لِّعِبَادِي يَقُولُوا الَّتِي هِيَ اَحْسَنُ (۱۷۱) (پہ ۱۷۱)

یعنی (اور اے محمدؐ) میرے بندوں سے کہہ دو کہ

زبان سے وہ بات نکالا کریں جو بہترین ہو

اس آیت مبارکہ میں مسلمانوں کو یہ تلقین کی گئی ہے کہ علماء اور مشرکین ہوں یا کسی دوسرے مذہب کے پیرو اور دین اسلام کے مخالف، ان سے گفتگو یا بحث میں تلخ کلامی یا برہمی نہ لائے اور غلہ سے کام نہ لیں۔ وہ خواہ کسی ہی نا خوشگوار اور اشتعال انگیز باتیں کریں مسلمانوں کو نہ کوئی خلاف حق بات زبان سے نکالنی چاہیے اور نہ مشتعل

ہو کر یہود اور لغو باتوں کا جواب یہود اور لغو باتوں سے دینا چاہیے بلکہ غصہ سے دل سے نری اور شائستگی کے ساتھ وہی بات کہنی چاہیے جو سچی ہو چکی تھی ہو اور دولت حق کے تقاضے (یعنی وقار اور شائستگی) کے مطابق ہو۔ بعض لوگ توجیح کر پانا ضرورت بہت بلند آواز سے باتیں کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ عادت اور انداز گفتگو سخت ناپسندیدہ ہے۔ جیسا کہ سورۃ لقمان میں ارشاد ہوا ہے:

وَاعْظُضْ مِنْ صَوْتِكَ ۚ إِنَّكَ أَنْتَ الْغَوَّيُوسُ ۚ لُصُوفُ الْخَمِيرِ (آیہ 19)

یعنی اپنی آواز کو پست (نیچا) رکھو۔ بدترین آواز گدھے کی ہوتی ہے۔ ایک مومن اور ایک مومنہ کی یہ صفت بھی ہے کہ وہ نہ صرف آہستگی نری اور شائستگی سے بات کرتے ہیں بلکہ لغویات سے بھی دور رہتے ہیں جیسا کہ سورۃ النکاح میں فرمایا گیا ہے:

وَالَّذِينَ هُمْ عَنْ اللَّغْوِ مُعْرِضُونَ

(یعنی) (اور وہ مومنین) لغویات سے دور رہتے ہیں)

لغویات سے دور رہنے کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ وہ لغو باتوں سے پرہیز کرتے ہیں اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ وہ کسی بھی قسم کی لغویات کی طرف رخ نہیں کرتے۔ زبان میں کوئی دلچسپی لیتے ہیں اور زبان لوگوں کے قریب جاتے ہیں جو کسی قسم کی لغویات (گندے اور فحش گیت گانے اور سننے، دھنسنے، بازیوں، فضول مپ بازیوں، چٹنگ بازی وغیرہ) میں مشغول ہوں۔ اگر کسی ایسی جگہ سے ان کا گزر رہتا ہے جہاں لغو اور یہود ہوا باتیں ہو رہی ہوں یا لغو اور خلاف شریعت کام ہو رہے ہوں تو وہ وہاں سے شریعتانہ انداز سے گزر جاتے ہیں اور ان لغویات پر ایک نگاہ غلط انداز بھی نہیں ڈالتے جیسا کہ سورۃ الفرقان میں ارشاد ہوا ہے:

وَإِذَا مَرُّوا بِاللَّغْوِ مَرُّوا كَجُرَافٍ ۚ

(یعنی) اور اگر انہیں کسی لغو کے پاس سے (یا کسی لغوی چیز پر ان کا)

گزر رہا ہے تو شریف آدمیوں کی طرح گزر رہا ہے ہیں  
مسلمانوں کو یہ حکم بھی دیا گیا ہے کہ وہ مسجد اور دارالافتاء کے بجائے  
صاف اور سیدھی بات کریں۔ سورۃ الاحزاب میں فرمایا گیا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ قُلُوبًا قَوْلًا فَعَلًا (آیت ۳۳)

(اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور ہمیشہ صاف واضح حکم سیدھی بات کرو)

ایک مومن کی ایک صفت اور شان یہ بھی ہے کہ وہ اپنی باتوں میں سچ کو کبھی  
نہیں چھپاتا اور نہ سچ میں جھوٹ ملا تا ہے سورۃ بقرہ میں ارشاد ہوا ہے:

لَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْفُرُوا بِالْحَقِّ وَانْتُمْ تَعْلَمُونَ (آیت ۴۲)

یعنی اپنی باتوں میں سچ کو جھوٹ کے ساتھ غلط ملا مت کرو

اور نہ جانے ہو جیسے حق کو چھپانے کی کوشش کرو

اس ارشادِ ہانی کے مطابق خوش کھای یا خشن نظم میں یہ چیز بھی شامل ہے  
کہ (کسی مصلحت کے تحت یا کسی اور غرض سے) سچ میں جھوٹ ملا کر یا حق پر باطل کا  
رنگ چڑھا کر اس کو مشتبہ نہ بتایا جائے اور نہ جان بوجھ کر حق کو چھپانے کی کوشش کی  
جائے۔ اس کے برعکس زبان سے وہی بات نکالی جائے جو بہترین ہو اور اللہ کے  
غضب کو دعوت دینے کے بجائے اس کی خوشنودی کا باعث ہو۔

خاتم النبیین ﷺ کے نزدیک خوش کھای کی کیا اہمیت  
تھی، اس کا اندازہ آپ کے ان ارشادات سے کیا جاسکتا ہے:

حضرت ہدی بن حاتم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے  
فرمایا کہ (صدقہ کر کے) دودغ کی آگ سے بچو اگرچہ وہ صدقہ کجور کے ایک ٹکڑے  
کا ہو اور اگر اتنا بھی نہ ہو سکے تو اچھی بات کہہ کر دودغ سے بچو۔

(صحیح بخاری باب طبیب الکلام)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے

فرمایا کہ جو شخص اللہ پر اور یحییٰ قیامت پر ایمان رکھتا ہے اسے چاہیے کہ انہی بات کے  
(صحیح بخاری باب من کان چارہ)

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ  
کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا، یا رسول اللہ! اسلام کیا چیز ہے۔ آپ نے  
جواب میں فرمایا، خوش نکلائی۔ (طہیٰب الکلام / مسند احمد)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ  
نے فرمایا، مومن بندہ نہ زبان سے حملہ کرے نہ والا نکلاتا ہے، نہ لعنت کرنے والا اور نہ  
بدگوارت لگانی کہے والا۔ (جامع ترمذی)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے  
فرمایا کہ:۔ انہی اور انہی بات بھی ایک صدقہ ہے (یعنی نیکی کی ایک قسم ہے جو اللہ  
تعالیٰ کو بہت پسند ہے)۔ (صحیح بخاری)

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ قش کام  
کرنے والے اور قش باتیں کرنے والے سے محبت نہیں رکھتا اور خاص سے محبت رکھتا  
ہے جو باز آروں میں چلا تا پھرے۔ (مسند ق)

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے  
ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن اللہ کے نزدیک دھبہ کے لحاظ بدترین آدمی وہ ہوگا جس  
کی بدزبانی اور سچ نکلائی کے ذریعے لوگ اس کو چھوڑ دیں (یعنی اس سے ملنے جلنے اور  
بات کرنے سے بچنے کی کوشش کریں)۔ (صحیحین و سنن ابی داؤد)

رسول اکرم ﷺ کی حیات اطہرہ کو اللہ تعالیٰ نے تمام مسلمانوں کے لیے  
نمونہ بنایا۔ آپؐ بے حد خوش خلق اور نرم مزاج تھے۔ کسی کا دل نہیں دکھاتے تھے  
اور ہر ایک سے بڑی محبت اور نرمی سے گفتگو فرماتے تھے۔ چہرہ مبارک ہر وقت کھلا  
رہتا تھا۔ زبان میں اتنی مٹاس تھی کہ ملنے والوں کا دل سوہ لیتی تھی۔ جو  
(سلیم الفطرت) شخص آپؐ سے ملا، آپؐ ہی کا ہو کر رہ جاتا تھا۔ قرآن حکیم نے آپؐ

کی نرم مزاجی اور خوش خلقی کی شہادت یوں دی ہے۔

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللَّهِ بُنْتُ لَهُمْ ۖ وَلَوْ كُنْتُ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَا نَقُصُّوا مِن  
خَوَلِكِ (آل عمران ۱۵۹)

یعنی (اے نبی!) یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ تم ان لوگوں کے لیے بہت نرم  
مزاج (خوش خلق) واقع ہوئے ہو ورنہ اگر کہیں تم عجب ظن اور سنگ دل ہوتے تو یہ سب  
تمہارے گرد و پیش سے بچھٹ جاتے۔

انم المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیان کرتی ہیں کہ ایک  
شخص نے رسول اللہ ﷺ سے ملاقات کے لیے (کاٹھنہ اقدس کے اندر آنے کی)  
اجازت چاہی آپ نے ہم لوگوں (اہل خانہ) سے فرمایا کہ یہ شخص (اپنی ترش روئی یا  
بد مزاجی کی وجہ سے) اپنے قبیلے کا بُرا آدمی ہے۔ پھر آپ نے فرمایا، اس کو اندر آنے  
کی اجازت دے دو۔ جب وہ اندر آ گیا تو آپ نے اس کے ساتھ بڑی نرمی سے  
گفتگو فرمائی۔ جب وہ چلا گیا تو میں (عائشہ) نے آپ سے عرض کیا،  
یا رسول اللہ! آپ نے تو اس شخص سے بڑی نرمی کے ساتھ گفتگو فرمائی اور پہلے آپ  
نے اس شخص کے بارے میں فرمایا تھا کہ وہ اپنے قبیلے کا بُرا آدمی ہے۔ آپ نے فرمایا  
قیامت کے دن اللہ کے نزدیک سب سے بُرا آدمی وہ ہو گا جس کی بدزبانی اور سخت  
کلامی کی وجہ سے لوگ اس سے ملنا جلنا چھوڑ دیں۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

دوستوں اور عقیدت مندوں کے علاوہ آنحضور ﷺ دشمنوں کے ساتھ  
بھی خندہ پیشانی سے پیش آتے تھے اور ان کے ٹکٹا خانہ رو بننے کے باوجود ان کے  
ساتھ نہایت نرمی سے گفتگو فرماتے تھے۔ دشمن خواہ کیسی ہی بدزبانی سے کام لیں آپ  
ان کے لہجہ میں ان کو جواب نہیں دیتے تھے۔ ایک دفعہ چند شریر یہودی کاٹھنہ اقدس  
میں حاضر ہوئے اور آپ سے مخاطب ہو کر اذرا و لہاوت "اسلام علیکم" کے بجائے  
"اکتنام علیکم" کہا (یہ ایک قسم کی گالی تھی جس کا مطلب ہے "تم کو موت آئے")  
حائم المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پاس ہی موجود تھیں ان کو یہودیوں کی



اس گستاخی پر غصہ آ گیا اور انہوں نے جواب میں فرمایا، تم ہی کو سوت آئے اور تم پر اللہ کی لعنت اور اس کا غضب ہو حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا، اے عائشہ ازہان روکو، نری کارویہ اختیار کرو اور سختی اور بد زبانی سے اپنے کو بچاؤ۔ (صحیح بخاری)

و عا ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کو خوش کلامی اور نرم مزاجی کی خصلت سے بہرہ ور فرمائے اور اس ذاتِ اقدس ﷺ کے اسوہٴ حسنہ پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے جس نے دشمنوں سے گالیاں سن کر ان کو دعا کییں دیں۔



## اچھے پڑوسی ملے

دنیاؤں کا قول ہے کہ انسان کسی نہ کسی کا پڑوسی یا ہمسایہ ضرور ہوتا ہے اور یہ ہے بھی حقیقت کہ جب سے دنیا پیدا ہوئی ہے اور انسان نے بل ٹل کر رہنا سیکھا ہے اسے کسی نہ کسی کا پڑوسی ضرور بننا پڑا ہے۔ انسان کا اپنے ماں باپ، بہن بھائیوں، اولاد اور قریبی رشتہ داروں کے علاوہ ہمسایوں پڑوسیوں سے مستقل رابطہ رہتا ہے اور اس کی خوش گواری اور نا خوشگواری کا نہ صرف زندگی کے سکھ اور سکون بلکہ اخلاق کے بناؤ بگاڑ پر بھی بہت اثر پڑتا ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ اچھا پڑوسی خدا کی رحمت ہوتا ہے اور بُرا پڑوسی خدا کا عذاب۔ دراصل پڑوسی ایک دوسرے کے اسنے قریب ہوتے ہیں کہ وہ ایک دوسرے کی زندگی کے ہرزخ کو، خواہ وہ ظاہر ہو یا اُچھا چھپا، جانتے ہیں۔ ذرا بھی غم ہوا، کوئی بھی دکھ ہوا کسی قسم کی ضرورت ہوئی ہم آپ سب کا طریقہ یہ ہے کہ پڑوسی کی طرف پکٹتے ہیں۔ لیکن آج کل دیکھنے میں آیا ہے کہ پڑوسیوں کے باہمی تعلقات اکثر خراب رہتے ہیں اور ان کی باہمی رنجش بات بات پر جھگڑوں کا باعث بن جاتی ہے۔ اس طرح فریقین کی زندگی تلخ ہو جاتی ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ اس کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں مثلاً:

1. بچوں کے جھگڑوں میں ایک پڑوسی ہمیشہ دوسرے پڑوسی کے بچوں کو قصور وار ٹھہرائے۔
2. نادار پڑوسی مالدار پڑوسی سے حسد کرے۔
3. مالدار پڑوسی نادار پڑوسی کو حقارت سے دیکھے اور اس سے نفرت کرے۔
4. ایک پڑوسی دوسرے پڑوسی کے دکھ درد میں شریک نہ ہو اور اس کے معاملات سے بالکل نا تعلق رہے۔

- 5 ایک پڑوسی دوسرے کے بارے میں خواہ مخواہ جھگڑائی کرے۔
- 6 ایک پڑوسی مذہب اور عقیدے کے اختلاف کی وجہ سے دوسرے پڑوسی سے نفرت کرے۔
- 7 ایک پڑوسی دوسرے پڑوسی سے ہمارا قرض مانگے یا ضرورت کی دوسری چیزیں ہر وقت مانگتا رہے۔
- 8 قرض یا دوسری چیزیں لے کر واپس نہ کرے یا عارضاتی ہوئی چیزوں کو خراب کر کے واپس کرے۔
- 9 ریڈیو، ٹیلیوژن یا ٹیپ ریکارڈر کو استعمال کرتے وقت ایک پڑوسی دوسرے پڑوسی کے آرام اور سکون کا خیال نہ کرے۔
- 10 مشترکہ گلی کو چوں میں گندگی پھیلانی جائے اور ایک پڑوسی دوسرے پڑوسی کے گھر کے قریب یا سامنے کوڑا کرکٹ پھینکے۔
- 11 چھت پر چڑھتے وقت ایک پڑوسی دوسرے پڑوسی کی بے پردگی کا خیال نہ کرے وغیرہ۔

اگر ہم غصہ سے دل سے غور کریں تو فحشوں ہوگا کہ پڑوسی سے رنجش کی بنیاد جہاں روا داری، برداشت اور جوصلے کی کمی ہوتی ہے وہاں اس ذمہ داری کو پورا نہ کرنا بھی ہے جو پڑوسیوں سے برتاؤ کے سلسلے میں اسلام ہم پر ڈالتا ہے۔ اگر دوسروں کے حقوں کو اپنے حق سمجھا جائے اور جس طرح اپنے حقوں سے پیار کیا جاتا ہے ان سے بھی کیا جائے، پڑوسی کی خوشحالی سے حسد کرنے کی بجائے خود اپنے حالات سدھارنے کی کوشش کی جائے، نادار پڑوسی سے نفرت کرنے کی بجائے اس سے شفقت اور رحم کا برتاؤ کیا جائے مگر بھلے سے تجھ میں نہیں رہے سکتے تو ان کے چھلکے باہر پھینک کر ان کی دل شکنی نہ کی جائے، پڑوسی کے دکھ درد میں شریک ہونا چاہیے فرض سمجھا جائے، کسی معاملے میں پڑوسی سے بدگمان ہونے کی بجائے اس سے جمل کرنی کے ساتھ گفتگو کرنی جائے مذہب اور عقیدے کو اپنی جگہ رکھا جائے اور اس کو سب جمل

میں رکاوٹ نہ بننے دیا جائے، پڑوسی سے شدید ضرورت کے ہو اقرض نہ مانگا جائے اور نہ وقت بے وقت چیزیں مانگ مانگ کر اسے تنگ کیا جائے مقررہ لے کر اسے جلد از جلد یا وعدہ کے مطابق واپس کرنے کی کوشش کی جائے اور مانگی ہوئی چیزیں بھی ضرورت پوری کرنے بعد صحیح سالم فوراً واپس کی جائیں، ریڈیو اور ٹیلی ویژن وغیرہ کو اس طرح استعمال کیا جائے کہ دوسروں کے آرام اور سکون میں خلل نہ پڑے۔ مہمت پر چڑھنے سے پہلے پڑوسیوں کو آگاہ کر دیا جائے تو کوئی جھجھکیں کہ پڑوسیوں کے ساتھ تعلقات خوشگوار نہ رہیں۔

اسلام میں پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک کی بے انتہا تاکید کی گئی ہے۔ قرآن حکیم میں واضح حکم ہے کہ ”رشتہ دار مساکین اور انجینی مساکین کے ساتھ نیک سلوک کرو“ (سورہ نساء: ۳۶)

رسول اکرم ﷺ نے تو پڑوسی کی رائے کو کسی کے اچھایا نہ ہونے کی کوئی قید نہ دیا ہے آپ کا ارشاد ہے کہ اگر تیرے پڑوسی تجھے اچھا کہتے ہیں تو واقعی تو اچھا ہے اور اگر پڑوسی کی رائے تیرے بارے میں خراب ہے تو تو واقعی بُرا آدمی ہے۔

پڑوسیوں کے ساتھ اچھے سلوک اور برتاؤ کو آپ کس قدر اہمیت دیتے تھے اس کا اندازہ حضور ﷺ کے اس ارشاد سے کیا جاسکتا ہے:

”وہ شخص نہ صاحب ایمان ہے اور نہ بھکت میں داخل ہو سکے گا جس کی شرارتوں اور ایسے امثالوں سے اس کے پڑوسی محفوظ اور بے خوف نہ ہوں۔“ (مسلمین)

## وَالِدَین کی اطاعت جنت کی ضامن

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ انسان کے لیے والدین ایسی محبت غلطی ہیں جس کا کوئی غم البذل نہیں۔ اسی لیے قرآن حکیم میں والدین کی اطاعت پر بہت زور دیا گیا ہے لیکن انہوں نے کہ جب مطرب نے والدین کو عضو مصل بنا کر رکھ دیا ہے۔ مطرب زورہ معاشرے میں اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ بوڑھے اور بے سہارا والدین کی فرمانبرداری تو کیا اولاد ان کی حفاظت تک سے گریز اس ہوتی ہے۔ اس کے برعکس جب ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام نے انسان کی دنیوی اور اخروی فلاح اس کی جنت اور دوزخ کا انحصار ہی والدین کی اطاعت اور خدمت گزاری پر رکھا ہے تو اس حقیقت پر بے ساختہ ایمان لانا پڑتا ہے کہ اسلام جتنی معنوں میں دین رحمت ہے۔ اس نے زندگی کے ہر شعبے میں ایسی راہ چھن کر دی ہے جس پر چل کر انسان دنیا اور آخرت میں فلاح پا سکتا ہے۔ اسلام والدین کے احترام اور اطاعت کو غیر معمولی اہمیت دیتا ہے۔ خاتم الانبیاء والمرسلین رحمہم اللہ عالم ﷺ مسلمانوں کو والدین کی اطاعت اور خدمت کرنے کی بار بار تاکید فرماتے رہے تھے یہاں تک کہ آپ نے والدین کے نامرمان کو جنت سے محروم قرار دیا۔ شیخ نسائی اور مسند دہری کی ایک حدیث میں حضرت عبداللہ بن عمر دین عامر رضی اللہ عنہما سے حضور ﷺ کا یہ ارشاد مروی ہے کہ احسان جتانے والا اور والدین کی نامرمانی کرنے والا جنت میں داخل نہ ہوگا۔ الفاظ دیگر احسان جتانے والا اور والدین کی نامرمانی جنت سے دوری کا باعث ہیں۔ مسند طبرانی کی ایک حدیث میں رسول اکرم ﷺ کا یہ ارشاد بھی نقل ہوا ہے کہ والدین کا نامرمان ہمیشہ سے اس قدر دور رہے گا کہ اس تک بہشت کی نعمتیں نہ پہنچیں

سکے کی جالا تک بہشت کی ہوا یا خوشبو پانچ سو سال کی مسافت سے بھی پہنچ جاتی ہے۔  
 بہشت تو آخرت کا معاملہ ہے والدین کے نافرمان کو دنیا میں بھی سزا مل جاتی ہے۔  
 مسند ترمذی میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

يُخْبِرُ اللَّهُ مِنْهَا مَا شَاءَ إِلَّا عُقُوقَ الْوَالِدَيْنِ فَإِنَّهُ يُعْجِلُ لِمَا جِهَ فِي الْحَبَابِ اللَّهُ نِيَا قَبْلَ النَّصَابِ.

یعنی ہر قسم کے گناہوں میں سے اللہ تعالیٰ جتنے گناہ چاہے گا بخش دے گا سوائے ماں باپ کو ستانے کے گناہ کے۔ سو بے شک اللہ تعالیٰ ماں باپ کے ستانے والے کو موت سے پہلے زندگ ہی میں جلد سزا دیتا ہے۔

کتاب حدیث میں رسول اکرم ﷺ کے اور بھی بہت سے ارشادات ملتے ہیں جن میں آپؐ نے مختلف چیز ایوں میں مسلمانوں کو شرک کے سوا والدین کا ہر حکم ماننے کی تلقین فرمائی ہے یہاں تک کہ کافر ماں باپ کے ساتھ بھی حسن سلوک کی ہدایت فرمائی ہے۔ آنحضور ﷺ کے یہ ارشادات فی الحقیقت اللہ تعالیٰ کے ان احکام کی تفسیر ہیں جو قرآن پاک میں پھر وہ جگہ والدین کی اطاعت کے بارے میں وارد ہوئے ہیں۔ ان میں سے بیشتر مقامات پر اللہ تعالیٰ نے شرک کی مذمت اور اپنی عبادت کا حکم دے کر فوراً والدین کے ساتھ نیک سلوک کرنے کا حکم دیا ہے۔ نیک سلوک میں ادب، تعظیم، اطاعت، رضا جوئی اور خدمت سب داخل ہیں۔ ہم یہاں صرف ایک مثال پیش کرتے ہیں۔ سورۃ بنی اسرائیل کی آیہ ۲۳ اور ۲۴ میں ارشاد ہوا ہے:

وَقَضَىٰ رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ ۚ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا ۚ إِنَّهُ يُسَلِّسُ لَكَ الْبَحْرَ أَخْضَعَا أَوْ بِكُلِّمَا فَلَا تَقُلْ لَهُمَا آيٌ وَلَا تُنْهَرُهُمَا ۖ وَكُلْ لَهُمَا مِمَّا كَرِهْتُمَا ۖ وَاصْفُصْ لَهُمَا جَنَاحَ الذَّيِّ مِنَ الرَّعْنَةِ ۚ وَكُلْ رُبَّ لَوْحَيْنِمَا مَعَهَا وَتُسَبِّحُ ۚ (آیہ ۲۳-۲۴)

(یعنی) تیرے رب نے حکم دیا کہ تم لوگ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو

اور اپنے والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو، اگر میری موجودگی میں سے ایک یا دونوں بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان کے سامنے آف تک نہ کرنا اور نہ انھیں جھڑکانا اور ان کے ساتھ عزت و توقیر سے بات کرنا اور نرمی اور تواضع سے ان کے سامنے ٹھک کر رہنا اور دعا کرتے رہنا کہ اے میرے پروردگار ان پر رحم فرما جیسا کہ انھوں نے میرے بچپن میں میری پرورش کی۔

اگر ہم اللہ اور رسول ﷺ کے ان احکام پر ذرا سا بھی غور کریں تو ظہر خیر کو ای دے گا کہ والدین سے بڑھ کر انسان کے لیے کوئی نعمت نہیں۔ ذرا غور کیجئے ہاں کی مامتا کا کہ بچے کی دوا دت کے سلسلے میں اس نے کبھی ذہرہ گداز تکلیف نہیں دی۔ دودھ پلانے کے زمانے میں بچے کو ذرا گرم سرد ہوا لگ جاتی تو اس کی راتوں کی نیند حرام ہو جاتی وہ اپنے ہاتھ سے بچے کی گندگی دھوئی دیتی۔ بچہ ہنسا تو اس کا دل ہار ہار ہو گیا بچہ رو دیا اس نے کوئی تکلیف محسوس کی تو وہ غلط نام سے غڑھاں ہو جاتی، جب تک اس کا علاج نہ کر لیا شکھ کا سانس نہ لیا۔ بچے کے ساتھ باپ کا دہلہ ماں کی نسبت ذرا کم سہی لیکن بچے کی پرورش کے اخراجات اور تعلیم و تربیت وغیرہ کا بار وہی اٹھاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو اولاد کی بے لوث محبت سے معمور کر رکھا ہے۔ اس کے شکھ اور آرام کی خاطر وہ اپنا شکھ اور بچپن قربان کر دیتے ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ بچہ جوان ہوا اور والدین کو بڑھاپے نے آگیا۔ بچپن کا زمانہ بچے کی حفاظتی کارنامہ تھا اب والدین کا بڑھاپا ان کی حفاظتی کارنامہ ہے۔ اس وقت اسلام اولاد پر والدین کے ادب و احترام، ماں کی خدمت اور دیکھ بھال کا فرض عائد کرتا ہے جبکہ تہذیب مغرب میں بالغ اولاد والدین کو نہ اپنے ذاتی معاملات میں دخل دینے کا حق دیتی ہے اور نہ ان کے ادب و احترام کو کوئی اہمیت دیتی ہے۔ آنحضور ﷺ نے مسلمانوں کو نہ صرف ماں باپ کی زندگی میں ان کی خدمت کرنے کی ہدایت فرمائی ہے بلکہ ان کی وفات کے بعد بھی اولاد پر کچھ حقوق باقی رکھے ہیں۔ امام ابو داؤد اور ابن ماجہ نے حضرت ابو قتیبہؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں بنی نضیر کا ایک شخص حاضر ہوا اور اس نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! والدین کے مرنے کے





## راشی اور مُرتشی دونوں ملعون ہیں

راشی کا مطلب ہے رشوت دینے والا لیکن (ع) کتاب یہ حرف غلط مشہور ہو گیا لہذا آج کل لوگ رشوت لینے والے کو راشی کہتے ہیں۔

مُرتشی کا مطلب ہے رشوت لینے والا لیکن یہ لفظ عام بول چال (یا مائتہ الناس کے مابین گفتگو) میں بہت کم استعمال ہوتا ہے۔

رشوت کے لغوی معنی ہیں ناجائز نذرانہ جو نقدی، جنس یا کسی اور شکل میں (بغیر حق کے) ناجائز طور پر حاصل کر کے کسی کا جائز یا ناجائز کام کیا جائے یا کوئی ناکام حاصل کرنے کے لیے کسی مقدمہ کے گواہ یا حاکم کو دی جائے۔

رشوت کی ایک سیاسی قسم بھی ہے وہ یہ کہ جاہل یا مطلق الجہان حکمران بعض نااہل (مگر مالی یا سیاسی طور پر طاقتور یا خوشامدی یا اپنے منظور نظر نالائق) لوگوں کو روپیہ یا جائیداد دے کر یا کسی اعلیٰ منصب پر فائز کر کے اپنا حامی بنائیں۔ رشوت کی عمومی صورت وہ ناجائز مفاد ہے جو اپنے اعزاز، منصب یا عہدے کی بنیاد پر، استحقاق کے بغیر حاصل کیا جائے اور اس عہدے یا منصب پر فائز ہوئے بغیر جس کا حاصل کرنا ممکن نہ ہو۔ رشوت لینے اور دینے کی اور بہت سی صورتیں بھی ہیں بہر صورت رشوت نام ہے جھوٹ، فریب، دھوکہ، ایمانی، دھیانت، دھور جھلسازی سے کام لے کر دوسروں کے حق مارنے کا۔ یہ حق دوسرے انسانوں (اپنے بھائی بندوں) کا بھی مارا جاسکتا ہے اور حکومت کا بھی (اپنے فرائض منصبی کی منی پلید کر کے)۔

اللہ تعالیٰ نے نہایت واضح الفاظ میں اس قبیح و خندے سے منع فرمایا ہے

سورہ بقرہ میں ارشاد ہوا ہے:

وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَقَتُلُوا نَفْسَكُمْ  
بِالْحَقِّ ۚ قَاتِلُوا ۚ فَمِنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْأَنفُسِ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ (آیہ ۱۸۸)

قریب اور تم لوگ نہ تو آپس میں ایک دوسرے کے مال باردا طریقے سے کھاؤ اور نہ حاکموں کے آگے ان کو اس فرض کے لیے پیش کرو کہ تمہیں دوسروں کے مال کا کوئی حصہ قصداً اظالمانہ طریقے سے کھانے کا موقع مل جائے (بالفاظ دیگر جھوٹ بول کر یا ہیرا پھیری کر کے دوسروں کا مال مت ہضم کرو اور نہ یہ کرو کہ حاکموں تک رشوت پہنچا کر ایک دوسرے کا مال ناجائز طور پر کھانا شروع کر دو اور تم جانتے ہی ہو کہ اگر تمہارا مال دوسرے اس طرح کھانے لگیں تو تمہیں کتنا گوارا گزرے)۔

خاتم الانبیاء و اکرم خلقین ہادی اکرم ﷺ کو اس فعل (شیعہ رشوت) سے اس قدر نفرت تھی کہ آپؐ نے اس کے لینے اور دینے والے دونوں پر لعنت بھیجی ہے۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، اللہ کی لعنت ہو رشوت دینے والے پر اور رشوت لینے والے پر۔ اسی طرح ”مفسفی“ میں روایت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ آنحضور ﷺ کا یہ ارشاد نقل ہوا ہے کہ اللہ کی لعنت ہو حاکم کو رشوت دینے والے پر اور اس حاکم پر بھی جو رشوت لے۔

سرور عالم ﷺ نے حکومت کے اہلکاروں (ملازموں) کو عوام سے کسی قسم کے تحفے لینے سے بھی منع فرمایا ہے کیونکہ یہ تحفے ان کو ان کے منصب یا عہدے کے لحاظ سے پیش کیے جاتے ہیں اس لیے یہ رشوت ہی کے ذیل میں آتے ہیں۔

صحیحین میں حضرت ابو حنیفہؒ راہب دی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے قہراً اُرد میں سے ایک شخص کو جس کا نام ابی المظنیہ تھا، زکوٰۃ کی وصولی کے لیے عامل بنا کر بھیجا۔ جب وہ مدینہ واپس آیا تو اس نے مسلمانوں سے کہا کہ یہ مال زکوٰۃ کا ہے جو میں بیت المال کے لیے جمع کر کے لایا ہوں اور یہ مال میرا ہے جو مجھے تحفہ کے طور پر دیا گیا ہے۔ نبی ﷺ نے جب یہ بات سنی تو غلیبہ دیا اور اللہ کی حمد و ثناء کے بعد (لوگوں سے) فرمایا کہ میں تم میں سے بعض آدمیوں کو، ان امور پر جو اللہ نے میرے پر رکھے ہیں، عامل بناتا ہوں، ان میں سے ایک جب

واپس آتا ہے تو کہتا ہے کہ یہ مال تمہارا ہے اور یہ مال مجھے تحفہ دیا گیا ہے۔ یہ شخص اپنے باپ کے گھریا اپنی ماں کے گھر کیوں نہ بیخود ہاں بھر دیکھتا کہ کون اس کے گھر میں آکر تحفہ پیش کرتا ہے۔

ایک روایت میں یہ اضافہ بھی ہے کہ ”اس موقع پر رسول اللہ ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ مجھے اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے کہ تم میں سے جو شخص اس قسم کے تحفے قبول کرے گا، قیامت کے دن یہ تحفے اس کی گردن سے چٹنے ہوں گے مگر اس نے تحفہ میں اوٹ لیا ہے تو وہ اس پر سوار ہلکا تانٹائی دے گا۔ گائے لی ہے تو وہ گردن سے چٹنی ہوئی ہلکا رہی ہوگی اگر بکری لی ہوگی تو وہ گردن سے چٹنی ہوئی مسیاری ہوگی۔“

اس کے بعد حضور ﷺ نے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر ہر گاہ الہی میں عرض کیا:

”یا اللہ تو گواہ رہو! میں نے انہیں حیرا حکم بنا دیا ہے۔“

یا اللہ تو گواہ رہو! میں نے انہیں حیرا حکم بنا دیا ہے

دوسرے حضور نے یہ الفاظ دہرائے۔

آنحضور ﷺ نے کسی کی سفارش کرنے کے عوض بھی تحفہ لینے کی ممانعت فرمائی ہے۔ حضرت ابو امامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ جو شخص کسی کی سفارش کرے اور وہ (جس کی سفارش کی گئی) سفارش کے بدلے میں سفارش کرنے والے کو کچھ تحفہ بھیجے اور وہ قبول کر لے تو وہ گویا سود کے دروازوں میں سے ایک بڑے دروازے سے داخل ہوا۔ (ابوداؤد)

ایک روایت میں ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے جلیل القدر صحابی حضرت عبداللہ بن رواحہ انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یہود وغیرہ کی طرف غلہ کی بٹائی وصول کرنے کے لیے بھیجا (یعنی فتح خیبر کے بعد حضور نے حضرت عبداللہ بن رواحہ کو خیبر کا مال مقرر فرمایا)۔ یہود وغیرہ نے اپنی عورتوں کے زیور جمع کر کے مال (حضرت

عبداللہ بن رواحہ) کو بطور تحفہ پیش کیے۔ مگر انہوں نے یہ کہہ کر زنج و قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ میرے لیے یہ مال حرام ہے اور ہم لوگ حرام نہیں کھا سکتے۔

سیدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں عدالتیں قائم کیں تو رشوت ستانی کے انسداد کے لیے کئی تدابیر اختیار فرمائیں مثلاً چابیوں کی تحفہ ایسی بہت زیادہ مقرر کیں تاکہ وہ معاشی اعتبار سے آسودہ رہیں اور انہیں اپنی آمدنی بڑھانے کی ضرورت پیش نہ آئے۔ انہوں نے یہ قانون بنا دیا کہ جو شخص معزز اور دولت مند نہ ہو اسے قاضی نہ مقرر کیا جائے۔ کوفہ کے گورنر حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کو اس قاعدے کی وجہ یہ بتائی کہ دولت مند رشوت کی طرف راغب نہ ہو گا اور معزز آدمی کسی کے رعب میں نہیں آئے گا۔

حضرت عمرؓ کا ایک دوست ہر سال ان کے لیے اونٹ کی ایک دان بدینہ بھیجا کرتا تھا۔ ایک دفعہ وہ شخص ایک مقدمہ میں فریق بن کر حاضر ہوا اور عرض کیا:

”امیر المؤمنین! ہمارے مقدمہ کا فیصلہ اس طرح کیجیے جیسے اونٹ کی دان کی بوئیاں ایک دوسرے سے جدا کی جاتی ہیں۔“

حضرت عمرؓ بات کی تہ تک پہنچ گئے۔ اسی وقت تمام مجال کو تحریری فرمان بھیجا کہ کسی کا ہد یہ قبول نہ کرنا (خواہ یہ کسی ذاتی دوست کی طرف سے ہو) کہ (صاحب اختیار کے لیے) ہد یہ (قبول کرنا) رشوت لینے کے مترادف ہے۔

حضرت عمرؓ جب کسی کو عدالت مقرر فرماتے تو اس کے پاس جس قدر مال اور اسباب ہوتا تھا اس کی مفصل فہرست تیار کر کر محفوظ رکھوا دیتے تھے۔ اگر عدالت کی مالی حالت میں غیر معمولی ترقی ہوتی تھی تو اس سے مواخذہ کیا جاتا تھا۔ ایک دفعہ عتبہ بن ابی سفیان کو ایک علاقے کا گورنر مقرر کیا۔ کچھ عرصہ کے بعد ان کے مال و دولت میں غیر معمولی اضافہ دیکھنے میں آیا۔ حضرت عمرؓ کو اطلاع ملی تو آپ نے ان کو بلا کر بازپرس کی کہ تمہیں اتنا مال کہاں سے حاصل ہوا؟ انہوں نے جواب دیا کہ کچھ مال میں اپنے گھر سے لے کر گیا تھا اور اس کے بعد میں نے تمہارت کے ذریعے مال جمع کیا

ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا:

”میں نے تمہیں عاملی حکومت بنا کر بھیجا تھا، تاہم بنا کر نہیں بھیجا تھا۔

تجارت اور گورنری جمع نہیں ہو سکتیں۔ یہ سب فالو سر یا یہ بیت المال میں جمع کر دو“

اس طرح مصر کے گورنر حضرت عمرؓ و بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے

میں حضرت عمرؓ کو اطلاع ملی کہ ان کے مال اسباب میں حیرت انگیز اضافہ ہوا ہے۔

انہوں نے حضرت عمرؓ و بن عباسؓ کو لکھا:

اے عمرؓ! جب تمہیں مصر بھیجا گیا تھا اس وقت تمہاری حالت اور تھی مگر اب

تمہارے پاس اسباب غلام اور مویشی جو اس قدر جمع ہو گئے، کہاں سے آ گئے؟“

حضرت عمرؓ و بن عباسؓ نے جواب میں لکھا کہ مصر میں زراعت اور تجارت

دونوں سے پیداوار ہوتی ہے اس لیے ہمارے پاس بہت سی رقمیں ان انداز ہو جاتی

ہے۔

لیکن حضرت عمرؓ اس جواب سے مطمئن نہ ہوئے۔ وہ اس قدر غلط تھے کہ

اپنے حکام کی آمدنی میں غیر معمولی اضافہ کے سلسلے میں اس بات کا ذرا سا بھی امکان

ہونا کہ اس اضافے کا سبب کسی خلاف اصول طریقے کا استعمال بھی ہو سکتا ہے تو وہ

فالو (اضافی) رقم یا مال اسباب ضبط کر کے بیت المال میں داخل کر دیتے تھے یا عام

مسلمانوں میں تقسیم کر دیتے تھے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ و بن عباسؓ کا اضافی مال اسباب

وغیرہ مسلمانوں میں تقسیم کر دیا۔

ایک دفعہ ایک شاعر خالد بن صفق نے اپنے اشعار کے ذریعے حضرت عمرؓ

کو اطلاع دی کہ فلاں فلاں خیال کے اسواں میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا ہے، امیر

المؤمنین ان کا حساب لیں کہ یہ اضافہ کیسے ہوا۔ حضرت عمرؓ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان

سب کی موجودات کا جائزہ لے کر آدھا آدھا مال بنا لیا اور بیت المال میں داخل کر

(اللہ رقی شہلی نعمانی)

دیا۔

مشہور مصنف مولانا ابوالحسن امام خان نوشہروی مرحوم اپنی کتاب

”قرآنی دستور حیات“ میں اس واقعے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”میں کہتا ہوں یہ تمام اسوال رشوت تو نہ تھے بلکہ لوگوں نے ہڈیٹھیں کپے ہوں گے یا تجارت و زراعت کے ذریعہ سے ان عاملوں نے جمع کیے ہوں گے مگر چونکہ حاکم اپنی کی برتری لوگوں کو بدیدہ دیتے پر مائل کرتی ہے اور تجارت و زراعت میں بھی لوگ ان کو دوسروں پر محض ان کے حاکم ہونے کی وجہ سے ترجیح دیتے ہیں اس لیے یہ بھی ایک قسم کی رشوت بن جاتی ہے اس لیے حضرت عمرؓ نے ایسا کیا اور بالکل بجا کیا۔ (قرآنی دستور حیات صفحہ ۲۹۱)

غیر اسلامی نظام حکومت میں آدمی اپنے جائز کام کے لیے بھی اس حکومت کے اہلکاروں کو نذرانہ دینے پر مجبور ہو جاتا ہے (اگر وہ ایسا نہ کرے تو اس کے کام میں طرح طرح کے روڈے لٹکائے جاتے ہیں) ایسی صورت حال کا ذکر کرتے ہوئے مولانا طویل احسن ندوی اپنی کتاب ”راہ عمل“ میں لکھتے ہیں:

”رشوت اس رقم کو کہتے ہیں جو دوسروں کا حق مارنے کے لیے حکومت کے کلرکوں اور افسروں کو دی جاتی ہے۔ رہی وہ رقم جو اپنے جائز حق کی وصولیابی کے لیے باطل نظام حکومت کے بے ایمان کارندوں کو دل کی پوری غفلت کے ساتھ اپنی جیب سے نکال کر دینی پڑتی ہے جس کے بغیر اپنا حق نہیں لے سکتا اس کی وجہ سے یہ مومن اللہ کے یہاں نہیں دھکرا جائے گا۔ ان شاء اللہ۔ ایسے حالات شدید تقاضا کرتے ہیں کہ خدا کا دین غالب اور شکر ان ہو۔“ (راہ عمل صفحہ ۱۴۳)

اس میں کوئی شک نہیں کہ غیر اسلامی نظام حکومت میں ایک سچا مسلمان اپنے جائز کام کے لیے بھی بعض اوقات حکومت کے بے ایمان ملازموں کو رشوت دینے پر مجبور ہو جاتا ہے لیکن ملازمین حکومت اگر اللہ اور اللہ کے رسولؐ پر ایمان رکھتے ہیں اور مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں تو ان کو ہر حالت میں رشوت (خواہ یہ کسی بھی صورت میں ہو) لینے سے احتراز کرنا چاہیے ورنہ ان پر اللہ کی لعنت پڑے گی۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کو رشوت لینے اور دینے سے بچائے۔

## دو قابلِ رشک انسان

مج بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ وہ شخص کاملِ رشک ہیں ایک وہ جس کو اللہ نے مال عطا فرمایا ہو اور وہ اس کو اللہ کی راہ میں خرچ کر رہا ہو دوسرا وہ جسے اللہ نے علم و حکمت سے نوازا ہو، و خود بھی اس پر غفلت کرتا ہو اور دوسروں کو بھی اس کی تعلیم دیتا ہو۔

اس حدیث پاک میں اخلاق فی سبیل اللہ یعنی اللہ کی راہ میں خرچ کرنے اور اثباتِ علم و حکمت کی بصیرت اور تفصیلات بیان کی گئی ہے۔ ایک صاحبِ حیثیت مسلمان اگر واجبِ زکوٰۃ دینے کے علاوہ اپنی اور اپنے اہل و عیال کی جائز ضروریات پوری کرے، رشتہ داروں، یتیموں، یتیم خانوں، مسکینوں، بیواؤں، یتیموں اور حاجت مندوں کی مدد کرے، نچلے طبقہ کی امانت کرے، مسلمانانِ جہاد کی فرائض میں حصہ لے، رفاہ عام کے کاموں میں شریک ہو، نادار قرض داروں کا قرض معاف کر دے یا ان کا قرض خود ادا کر دے تو یہی اللہ کی راہ میں خرچ کرنا یا اخلاق فی سبیل اللہ ہے۔ قرآن حکیم میں جگہ جگہ اخلاق فی سبیل اللہ کی تاکید کی گئی ہے اور اس کے لیے بے حد حساب اجر و ثواب کا وعدہ کیا گیا ہے۔ بعض صورتوں میں اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ کے علاوہ غریبوں کی امداد کے لیے کئی دوسرے خدقات بھی واجب قرار دیے تاکہ دولت ہر طبقہ میں کھوٹی نہ رہے۔ مثلاً مال اور مصیبت کے وقت غریبوں کی امداد لازم قرار دی یہاں تک کہ اپنی ضرورت کے سوا سب کچھ غریبوں کے لیے خرچ کر دینے کا حکم دیا۔ سورۃ البقرہ میں بخوار کو مخاطب کر کے ارشاد ہوا ہے:

يَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُقْرِضُونَ ۚ قُلِ الْبَقْرَةُ

یعنی آپ سے لوگ پوچھتے ہیں کہ خدا کی راہ میں کونسا مال خرچ کریں

کہہ دیں کہ جو ضرورت سے زیادہ ہے۔

یہاں اخلاق فی سبیل اللہ کی عمومی صورت بیان کی گئی ہے۔ اگر کوئی کو شخص دوسروں کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر بھی ترجیح دے تو یہ ایسا ہے جو اخلاق فی سبیل اللہ کی سب سے اعلیٰ صورت ہے۔

نبرد عالم ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ میرے پاس کوہِ اُمد کے برابر بھی سونا ہوتا مجھے یہ پسند نہیں کہ تیسرے دن تک اس میں سے ایک اشرفی کے برابر بھی میرے پاس بچا رہے۔ میں اس مال کو دونوں ہاتھوں سے حقوقِ خدا میں تقسیم کر کے رہوں گا۔ ایک مرتبہ حضورؐ کی بکریوں کا ریوڑ دیکھ کر ایک شخص نے اپنی ضرورت پیش کی آپؐ نے تمام ریوڑ اس شخص کو بخش دیا اس شخص نے اپنے قبیلے میں جا کر کہا:

”اللہ اُس قدر دُرِ یاقوت ہیں کہ وہ خدا میں دیتے وقت اپنے مطلبس ہو جانے کا مطلق خیال نہیں کرتے“

خودِ اُجوک کے موقع پر حضورؐ نے صحابہ کرامؓ کو راقم میں مال خرچ کرنے کی ترغیب دی تو حضرت ابو بکر صدیقؓ نے گھر کا تمام اثاثہ سوئی سلائی سمیت لا کر حضورؐ کے قدموں پر اُدر کر دیا۔ حضرت عمر فاروقؓ نے گھر کا نصف سامان حاضر کر دیا حضرت عثمان غنیؓ نے ہزاروں اشرفیوں کے علاوہ سینکڑوں اونٹ نکیل و پالان سمیت پیش کیے دوسرے صحابہؓ نے بھی کسی مالی قربانی سے دریغ نہ کیا حتیٰ کہ خواتین نے اپنے زیور تک ایسا کر دیا خدا میں دے دیئے۔ جب سورۃ آل عمران کی آیت

لَنْ يَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّىٰ تُنْفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ ۖ

(یعنی تم بھی نیکی حاصل نہ کر سکو گے جب تک تم ان چیزوں کو

جو تمہیں رزق ہوں ہرامِ خدا میں صرف نہ کرو گے)

نازل ہوئی تو اصحابِ رسولؐ نے اپنی قیمتی سے قیمتی جائیدادیں اور اسوالِ راءِ خدا میں اُناویے۔

حضرت سلمان فارسیؓ دُائن کے گورنر تھے، پانچ ہزار ماہانہ وظیفہ مقرر تھا لیکن



جو نبی و خلیفہ ہوا وہ اسے مساکین میں تقسیم کر دیتے اور اپنی ضروریات چٹائی بن کر چھڑی کرتے۔ یہی عادت جس کے گورنر حضرت سعید بن عامر کی تھی۔ غرض ایسی سبکدوشی میں ملتی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ رحمت عالم ﷺ اور آپ کے صحابہ کے نزدیک اللہ کی راہ میں خرچ کرنا ایک افضل عبادت کی حیثیت رکھتا تھا۔ اسی لیے حضورؐ نے راہ خدا میں مال خرچ کرنے والے کو قاتل و رشک انسان قرار دیا ہے۔ دوسرا قاتل و رشک آدمی آپ کے نزدیک وہ صاحب علم و حکمت ہے جو خود بھی اس پر عمل کرتا ہے اور دوسروں کو بھی اس کی تعلیم دیتا ہے۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: علم کی فضیلت عابد پر دیکھی ہے جیسی میری فضیلت پر۔ حضور ﷺ نے حضورِ نبی کو ہر مسلمان کا فریضہ قرار دیا ہے اور تعلیم و تعلم کو عبادت سے بھی افضل قرار دیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ نے مسجد میں دو جگہ دیکھے ایک حلقہ یاد خدا میں مشغول تھا اور دوسرا مسائل دین کی تعلیم و تعلم میں، آپ نے فرمایا، دونوں جگہ اچھے ہیں لیکن دوسرا پہلے سے افضل ہے کہ اس میں شامل لوگ خود بھی علم سیکھتے ہیں اور بے علموں کو سکھاتے بھی ہیں، میں خود بھی معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں یہ فرما کر آپ دوسرے جگہ میں شریک ہو گئے۔ حضورؐ نے علم کے ساتھ عقل کو بھی ضروری قرار دیا ہے آپ فرمایا کرتے تھے نبیازک ہے وہ بندہ جو اپنے علم پر عقل کرتا ہے اور ضرورت سے زائد مال راہ خدا میں خرچ کر دیتا ہے جس علم سے کسی کو نفع نہ ہو آپ ایسے علم سے خدا کی پناہ مانگا کرتے تھے۔ آپ کا ارشاد ہے کہ جس عالم کے علم سے اس کی اپنی ذات کو بھی نفع نہ ہو قیامت کے دن اسے سخت عذاب ہوگا۔ قرآن حکیم میں بے عمل عالم کو اس گدھے کی مانند قرار دیا گیا ہے جس پر کتابیں لدی ہوں سورۃ حمد کی آیت کشفیٰ ا لجہنم بنحوہ انفسار میں اسی طرف اشارہ ہے۔ حکمت بھی علم ہی کی ایک شاخ ہے اس کا اطلاق کتاب اللہ کی تعلیمات پر بھی ہو سکتا ہے اور دانائی کی ان تمام باتوں پر بھی جو حضورؐ کو کون کو اس ارشاد پر بانی کے مطابق سکھاتے تھے:

اُدْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحُكْمَةِ وَأَلْأَمَرِ عَظِيمَةِ الْخَيْرِ (المحل ۷۵)  
(یعنی لوگوں کو راہِ حق کی طرف حکمت اور عمدہ چند و نصیحت سے بلائے)

آپ فرمایا کرتے تھے، حکمت دو بہن کی گنجدہ میراث ہے ایک اور حدیث میں آپ کا یہ ارشاد نقل ہوا ہے کہ مسلمان اپنے بھائی مسلمان کو سب سے بہتر جو فائدہ پہنچا سکا ہے وہ یہ ہے کہ جو اچھی بات سنے اسے بھی سنا دے۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، حکمت عزت و دارِ آدمی کو اور زیادہ عزت بخشتی ہے اور قدام کو بلند کرتے کرتے تختہ شامی پر بیٹھا دیتی ہے۔ حضرت امام مالک کا قول ہے کہ حکمت سے مراد اللہ کی اطاعت، دین میں تقشف اور اس پر عمل ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہم میں سے ہر مالدار کو ربو خدا میں بے دریغ خرچ کرنے اور ہر صاحبِ علم و حکمت کو اس پر عمل کرنے اور دوسروں کو سکھانے کو توفیق عطا فرمائے، آمین۔

## رمضان المبارک

### ملتی وحدت و یک جہتی کا مہینہ

یوں تو ساری عبادات عظیم الہی اللہ کا ذریعہ اور وسیلہ ہیں مگر ان کی الگ الگ خصوصیات اور تاثیرات ہیں گو یا ہر رنگ و بو کے دیگر استیعنی ہر پھول کا رنگ اور اس کی خوشبو ایک دوسرے سے الگ ہے۔ ان عبادات میں جیسا کہ رمضان یعنی رمضان المبارک کے روزوں کے فضائل اور فوائد کی کوئی حد و نہایت نہیں۔ اسی طرح ماہِ جیسا کہ رمضان المبارک کی عجیب شان ہے۔ یہ ان رکعت برکتوں اور سعادتوں کا مہینہ ہے۔

اللہ جل شانہ اور اس کے رسول ﷺ نے اس کے بے شمار فضائل بیان فرمائے ہیں ان فضائل کی اہمیت کا اندازہ رسول اکرم ﷺ کے اس ارشاد مبارک سے کیا جاسکتا ہے کہ اگر لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ رمضان المبارک کیا چیز ہے تو میری نسبت یہ حتمی کرے کہ سارا سال ہی رمضان ہو جائے۔ اس مبارک مہینے کی سب سے بڑی خصوصیت اور فضیلت یہ ہے کہ اس میں قرآن حکیم نازل ہوا جو تمام انسانوں کے لیے رہنما ہے اور جس میں حق اور باطل کو الگ الگ کرنے والی تعلیمات ہیں جیسا کہ قرآن حکیم میں ارشاد ہوا ہے۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدَى  
وَالْقُرْآنِ (المزمل: ۱۸۵)

یعنی رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا جو انسانوں کے لیے سرسراہر ہدایت ہے اور ایسی واضح تعلیمات پر مشتمل ہے جو راہِ راست دکھانے والی اور

حق و باطل کا فرق کھول کر رکھ دینے والی ہیں۔

نماز کی طرح روزہ بھی بظاہر ایک انفرادی فعل ہے لیکن جس طرح فرض نماز کے ساتھ جماعت کی شرط عائد کر کے اس کو ایک اجتماعی فعل میں تبدیل کر دیا گیا ہے اسی طرح فرض روزوں کے لیے ایک خاص مہینہ اور ان کے اوقات مقرر کر کے اس کو ایک اجتماعی عمل بنا دیا گیا ہے۔ روئے زمین کے تمام مسلمان خواہ وہ کسی اسلامی ملک میں ہوں یا کسی غیر مسلم ملک میں، کسی پہاڑ پر آباد ہوں یا کسی جزیرے میں فرض دنیا کے کسی بھی گوشے میں آباد ہوں ایک مہینے کے فرض روزے انہیں ماہِ رمضان ہی میں رکھتے ہوں گے اور اس کے لیے اسی طریق کار اور اُسی اوقات کی پابندی کرنی ہوگی جو قبولیتِ روزہ کے لیے ضروری ہیں۔ بلاشبہ مختلف مقامات کے وقت نماز اور وقتِ افطار مختلف ہوتے ہیں لیکن نہ مہینہ تبدیل ہو سکتا ہے اور نہ اللہ اور شارعِ اسلام کے وہ احکام جن کی روشنی میں فحری اور افطار کے اوقات مقرر کیے جاتے ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ ماہِ رمضان کی اجتماعیت کے بارے میں اپنی شہرہ آفاق کتاب "حُجُبَةُ اللَّهِ الْبَالِغَةِ" میں لکھتے ہیں۔

"روزہ رمضان ایک عمومی اور اجتماعی فعل کی حیثیت رکھتا ہے اس لیے وہ رُئوس کی دسترس سے محفوظ ہے۔ مسلمانوں کے مختلف طبقات اور مختلف جماعتوں کا ایک چیز پر اجماع اور اجتماع جس میں سب ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں روزہ کو ان کے لیے آسان بنا دیتا ہے اور اس سے ان کی بہت بہت افزائی ہوتی ہے۔ اسی طرح ان کی یہ اجتماعیت خواص و عوام دونوں کے لیے منکلتی برکتوں کے نازل کا باعث ہے۔ اس میں اس کا امکان بھی بڑھ جاتا ہے کہ ان کے کاملین و مصلحین یعنی خدا رسیدہ مصلحین پر جو انوار نازل ہوں وہ بھی ان سے نیچے والوں کو فیضیاب کرتے جائیں اور ان کو دعائیں ان کے پیچھے والوں تک پہنچتی رہیں۔" (حُجُبَةُ اللَّهِ الْبَالِغَةِ کا مقصد اس قسم ہوا) اس میں کوئی شک نہیں کہ روزے کا مقصد تزکیہ اور ضبط نفس کے ذریعے مسلمانوں کی اخلاقی تربیت کرنا ہے اور یہ مقصد انفرادی عمل کے ذریعے

بھی حاصل کیا جاسکتا ہے لیکن اس کے لیے سال بھر میں ایک مہینہ مرض روزوں کے لیے مخصوص کر دینے سے غفلت الہی یہ ہے کہ سب مسلمان بیک وقت روزہ رکھیں اور وہی نظام تربیت جس سے افراد تیار ہوں ایک پاکیزہ اجتماعی نظام بنانے میں بھی مفید و معاون ہو۔

ماورئینہاں کی اولین خصوصیت یہ ہے کہ تھکائی یا پرہیزگاری کی اجتماعی لہذا پیدا کرتا ہے۔ پوری پوری آبادیوں پر زور عالی اللہ اور خشیت الہی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ لوگوں میں بالعموم نیکی طرف رغبت اور برائی کی طرف نفرت پیدا ہوتی ہے۔ کوئی بھی شخص جو دین سے ذرہ برابر لگاؤ رکھتا ہے، نہ صرف خود گناہوں سے بچنے کی کوشش کرتا ہے بلکہ کسی دوسرے کو بھی گناہ کا کوئی کام کرتے دیکھ کر اسے شرم دلاتا ہے کہ زینہاں میں ایسا کام کر رہے ہو جس سے اللہ اور اس کے رسولؐ نے منع کیا ہے۔ اکثر لوگوں (بالخصوص مالدار اور قاریغ الہال لوگوں کے طبقے) میں خیرات کرنے، گناہوں سے توبہ کرنے، روزہ افطار کرانے، مساکینوں اور حاجت مندوں کی مدد کرنے، بھوکوں کو کھانا کھلانے اور یرہہ تن مساکین کو کپڑے پہنانے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ یوں معاشرے میں عملی ہمدردی اور امداد باہمی کی روح بیدار ہوتی ہے جو حق وحدت اور یک جہتی کا بنیادی عنصر ہے۔ اگر ہم یہ کہیں کہ زینہاں المبارک کا مہینہ خیر کے لیے جمع ہونے اور نیک کام اجتماعی طور پر سر انجام دینے کا مظہر اور اسلامی زندگی میں مساوات کی علامت بھی ہے تو اس میں کوئی متناقض نہ ہوگا۔ فی الحقیقت اس مہینے میں تمام عالم اسلام اِنْفَا الْمَوْتُونَ اِخْوَةٌ کی تصویر بن جاتا ہے اور اس پر ایک خاص کیفیت طاری ہو جاتی ہے جس کی طرف حکیم الانبیا علامہ اقبالؒ نے یوں اشارہ کیا ہے۔

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے  
نیل کے ساحل سے لے کر تاجک کا شہر  
یہ الگ بات ہے کہ بعض بین الاقوامی قوانین اور سیاسی تنظیمیں عالم اسلام کے تمام

فرزند ان توحید کو ایک پلیٹ فارم پر جمع ہونے میں رکاوٹ بنتی ہیں تاہم یہ مبارک مہینہ ان میں ملتی وحدت اور یک جہتی کا جذبہ ضرور پیدا کرتا ہے۔ یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ اسلام مسلمانوں کو ایک خاص قسم کی اخلاقی تربیت دے کر جو صالح مضافہ بن کر دنیا میں لانا چاہتا ہے اس کے اجزائے ترکیبی میں ماہِ رمضان کی خاص اہمیت ہے۔ اس مہینے میں ایک مال مست مسلمان کو بھی روزہ رکھ کر معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کا کوئی قفاش قاقہ کش بھائی بھوک کی حالت میں کس آزمائش سے دوچار ہوتا ہے۔ چنانچہ اس کیفیت کا احساس اسے حاجت مندوں اور غریبوں کی مدد کرنے پر ابھارتا ہے اور یہ مدد صرف اللہ کی رضا کے حصول کے لیے کرتا ہے بلکہ امیروں اور غریبوں میں حسد کے بجائے شکرگزاری اور احسان مندی کا تعلق قائم ہوتا ہے اور طبقاتی جنگ کے امکانات معدوم ہو جاتے ہیں مختصر یہ کہ تمام طبقوں کے لوگوں کا مل کر ایک ہی مقصد کے حصول کے لیے بھوک پیاس کی مشقت اٹھانا، گناہوں سے اجتناب کرنا، نیکیوں اور بھلائی کی طرف پکنا ایسا اختراکِ نخل ہے جو مسلمانوں میں بہترین رشتہء اخوت اور یک جہتی پیدا کرنے کا ذریعہ ہے اسی لیے ہم رمضان المبارک کو خیر و برکت کے علاوہ ملتی وحدت اور یک جہتی کا مہینہ بھی کہہ سکتے ہیں۔

# رمضان المبارک

## اور مسلمان تاجر کا کردار

جس طرح بہار کا موسم آتے ہی ہر طرف روئیدگی نظر آتی ہے، جیسا کہ تک بہرہ ہی بہرہ آنکھوں کو طراوت بخشتا ہے اور جو درخت کل تک تجواں رسیدہ تھے وہ بہرہ جوڑا پہن کر جواں ہو جاتے ہیں اسی طرح ہر سال ماہِ رمضان کی آمد اپنے جلو میں بے شمار سعادتیں برکتیں اور اللہ تعالیٰ کی عنایاں سب سے پایاں لیے ہوتی ہے جو سارے مہینے میں بارش کی طرح برستی رہتی ہیں اور ساری فضا خیر و برکت سے معمور رہتی ہے۔ صوم رمضان صرف عبادت ہی نہیں بلکہ اسلام کا ایک ڈگن ہے۔ عبادتیں سب ہی انسان میں غیوریت کا جذبہ ابھارنے کا باعث ہوتی ہیں لیکن ہر عبادت کا اپنی ظاہری صورت میں بھی ایک مسلمان کی زندگی کے کسی خاص پہلو سے خصوصی تعلق ہوتا ہے مثلاً نماز اللہ جلّ جلالہ کے سامنے انتہائی عجز و انکسار کا اظہار ہے تو زکوٰۃ اس امر کا اظہار کہ جو کچھ ہمارے قبضے میں ہے وہ اللہ کا دیا ہوا ہے اور اس میں اللہ کے بندوں کا بھی حق ہے اسی طرح حج، قربانی، صدقہ و خیرات وغیرہ بھی ایک خاص اثر رکھتی ہیں یہی حال روزے کا ہے اس عبادت کا مقصد خود اللہ تعالیٰ نے یوں واضح فرمایا ہے۔

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ

(البقرہ: ۱۸۳)

”یعنی تم پر روزے اس طرح فرض کیے گئے جیسے پہلے لوگوں پر، شاید کہ تم متقی بن جاؤ“ مطلب یہ کہ روزے سے جو فوائد مطلوب ہیں ان میں حصول تقویٰ سب سے اہم مقصد ہے۔ تقویٰ قرآن پاک کی ایک اصطلاح ہے جس کے معنی یا مفہوم

نہایت وجہ کی پرہیزگاری ہے۔ یعنی ہر اس کام سے بچنا جس سے اللہ ناراض ہوتا ہو یا اللہ کے کسی بندے کو ناحق ضرر پہنچتا ہو۔ رسول اکرم ﷺ کے ایک پیارے ساتھی حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے کسی نے پوچھا اے صاحب رسول! تھکوی کا مطلب کیا ہے؟ آپ نے چلت کر اس سے سوال کیا، کیا تم کسی ایسی جگہ سے گزر رہے ہو جہاں چاروں طرف کانٹے دار جھاڑیاں ہوں؟ ان صاحب نے جواب دیا مئی ہاں بار ہا ایسا اتفاق ہوا ہے۔ آپ نے پھر سوال کیا کہ ایسے موقع پر تم کیا کرتے ہو؟ انہوں نے جواب دیا کہ اپنے کپڑوں اور بدن کو سمیٹ لیتا ہوں تاکہ کانٹوں سے بچ جاؤں۔ یہ سن کر حضرت ابوایوبؓ نے فرمایا کہ زندگی کی راہ پر گناہ کے کانٹوں سے بچ کر نکلنے کی فکر ہی تھکوی ہے۔ فی الحقیقت کسی بھی مسلمان کی سیرت و کردار کی تعمیر کے لیے تھکوی مشابہ اذیٰل الحقیقت رکھتا ہے چونکہ روزے کا مقصد تھکوی کا حصول ہے اس لیے اس کے فوائد و نذرات سے وہی مسلمان مستفیض ہو سکتے ہیں جو اس مقصد کو حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ ان میں غریب، یتیم، آجر، مزدور، کسان اور تاجر وغیرہ ہر طبقے کے لوگ شامل ہیں۔ اس وقت ہمارا موضوع گفتگو یہ ہے کہ رزحان المبارک میں ایک مسلمان تاجر کا کیا کردار ہونا چاہیے۔ تاجر ہمارے معاشرے کا ایک نہایت اہم عنصر ہے کیونکہ حسبِ عالم ﷺ نے تجارت کو تمام پیشوں سے افضل قرار دیا ہے۔ رزحان المبارک میں ایک مسلمان تاجر پر دو ہری ذمہ داری آپڑتی ہے بلکہ یوں کہیے کہ ٹھیکوں کے اس موسم بہار سے فیضیاب ہونے کے لیے اس کو دو ٹونڈ مواقع میسر آ جاتے ہیں ایک تو ان آداب تجارت کی سختی کے ساتھ پابندی کرنے سے جن کا ہر مسلمان تاجر سے اسلام تقاضا کرتا ہے۔ مثلاً مال خریدنے اور بیچنے میں خری کرنا، ذخیرہ اندوزی نہ کرنا، ملاوٹ نہ کرنا، مال کا عیب نہ چھپانا، پورا تولنا اور پورا ناپنا سب بیچنے کے لیے قسمیں نہ کھانا وغیرہ۔

دوسرے ایک عام مسلمان کی حیثیت سے ان باتوں سے بچنا جو روزے کے اجر سے محروم کر دیتی ہیں مثلاً جھوٹ بولنا، کسی کی فیبت کرنا، بے نودہ باتیں کرنا،



گالیاں پکنا لڑائی جھگڑا کرنا اور خلاف شرع کاموں میں مشغول رہنا۔

ایک مسلمان تاجر کا اسلام کے معزز رکھے ہوئے آداب تجارت کی پابندی کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے کاروبار کا محور رزق حلال کے حصول کے لیے تنگ و دو کرنا ہے جو بجائے خود عبادت کا درجہ رکھتی ہے۔ اگرچہ عام دنوں میں بھی اس عبادت کی اللہ تعالیٰ کے نزدیک بڑی قدر و قیمت ہے مگر رمضان المبارک میں دوسری عبادت کی طرح اس عبادت کا ثواب بھی بہت بڑھ جاتا ہے اور اگر کوئی مسلمان تاجر ماہ رمضان میں اپنے مسلمان بھائیوں کی خیر خواہی یا ان کو فیض پہنچانے کی نیت سے اپنے مال کی قیمتیں کم کر دیتا ہے اور برائے نام منافع پر اکتفا کرتا ہے تو اسے سونے پر سہاگہ کہا جائے گا جو اس تاجر کو اجر عظیم کا مستحق بنادے گا۔

قرآن وحدیث میں اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ نے مسلمان تاجروں کے لیے جو آداب تجارت معزز فرمائے ان میں سے کچھ یہ ہیں۔

(1) پورا تو لو اور پورا مانا، کم تولنے اور کم ناپنے والے اپنی روزی کو حرام بنادیتے ہیں اور اللہ کے غضب کوعزت دیتے ہیں۔

(2) لیکن دین میں اپنے عہد کو ہر حال میں پورا کرو۔

(3) جو شخص عیب دار چیز بیچے گا اور خریدار کو اس کے نقص سے آگاہ نہ کرے گا وہ ہمیشہ غضب الہی میں رہے گا۔

(4) قسم اٹھانے سے مال تجارت کی نکاسی تو ہو جاتی ہے مگر برکت منسوب ہو جاتی ہے۔

(5) گرانی کے انتظار میں غلے کو روکنے والا بہت بُرا انسان ہے اگر اللہ تعالیٰ نرغوں کو اڑا دے گا تو تم لگین ہوتا ہے اور گراں کرتا ہے خوش ہوتا ہے۔

(6) گرانی کے انتظار میں غلے کو روکنے والا ملعون ہے۔

(7) تاجروں کا قیامت کے دن قاجروں کے ساتھ حشر ہوگا سوائے ان کے جو حرام سے بچے، جسوں کی قسم نہ کھائی اور قیمت بتانے میں راستبازی کو ہاتھ سے نہ

مجموعہ ۱۔

(8) اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحم فرماتا ہے جو خریدنے، بیچنے اور کھانا کرنے

میں نرمی اختیار کرے۔

ایک سچے مسلمان تاجر کی پہچان یہی ہے کہ وہ ہمیشہ ان آداب پر عمل پیرا رہتا ہے۔ اگر کوئی تاجر ایسا نہیں کرتا تو اس کی کمائی حرام ہو جاتی ہے اور یوں وہ اپنا اور اپنے اہل و عیال کا پیٹ و ذرخ کی آگ سے بھرتا ہے بالخصوص مسلمان ہونے کا دعویٰ کرنے والا کوئی تاجر زینعان المبارک میں ناجائز منافع خوری پر اتر آئے تو وہ نہ صرف اس مایوس کن خس کے فیوض و برکات سے محروم ہو جاتا ہے بلکہ اپنی آخرت بھی برباد کر لیتا ہے۔ اس کے برعکس ایک سچے مسلمان تاجر کا کردار ملک و ملت کے لیے باعثِ رحمت ہوتا ہے۔ زینعان المبارک میں وہ اپنے مسلمان بھائیوں کو جتنا بھی فائدہ پہنچائے گا وہ اس کے لیے بے حساب اجر و ثواب کا باعث ہوگا۔ اسی طرح اگر اس نے ایک عام مسلمان کی حیثیت سے رحمتِ عالم ﷺ کے اس ارشاد پر عمل کیا کہ مَنْ ضَامَّ رَفِضَانَ اِيْمَانًا وَ اَحْبَسَا بِنَا حَقِيْرَةً، مَا تَقْلُدُمْ مِنْ ذَنْبٍ تُوَاسِیْهِ اٰخِرَتِ سُوْر جَانے گی۔

مختصر ﷺ کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ جس نے ایمان اور احتساب کے ساتھ روزہ رکھا اس کے تمام پچھلے گناہ معاف کر دیے گئے۔ اس حدیث پاک میں ایمان سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے متعلق ایک مسلمان کا جو عقیدہ ہونا چاہیے، وہ عقیدہ ذہن میں پوری طرح تازہ رہے اور احتساب کا مطلب یہ ہے کہ انسان اللہ ہی کی رضا کا طالب ہو اور ہر ایسے کام سے دور رہے جو اللہ کی رضا کے خلاف ہو، دعا ہے اللہ تعالیٰ ہر مسلمان تاجر کو ہمیشہ اور بالخصوص زینعان المبارک میں اپنا کردار اللہ اور رسول کی رضا کے مطابق ادا کرنے کی توفیق دے۔

وَمَا عَلَيْنَا اِلَّا الْبَلَاغُ

## سحری اور افطاری کی برکات اور رمضان کے عشروں کے فضائل

جس طرح بہار کا موسم آتے ہی ہر طرف ہنرہ ہی ہنرہ آنکھوں کو طراوت بخشتی ہے اسی طرح ہر سال رمضان المبارک کی آمد اپنے جلو میں بے شمار فضیلتیں، سعادتیں اور برکتیں لئے ہوتی ہے جو سارے مہینے میں ہارش کی طرح بدستی راتنی ہے اور ساری فضا خیر و برکت سے معمور رہتی ہے۔ شیخ نسائی میں حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول ﷺ سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ مجھے کوئی ایسا عمل بتائیے جس سے اللہ تعالیٰ مجھے نفع دے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ روزہ رکھا کرو اس کی مثل کوئی بھی نفل نہیں ہے۔ شارحین حدیث نے لکھا ہے کہ آنحضور ﷺ نے روزہ کو بے مثل عمل اس اعتبار سے قرار دیا ہے کہ اس میں نفسِ فاجر کو مغلوب کرنے اور اس کی خواہشوں کو دبانے کی صفت بدرجہٴ غایت پائی جاتی ہے۔ روزوں کی یہ صفت عمومی ہے۔ جہاں تک رمضان المبارک کے فرض روزوں کا تعلق ہے تو ان کے فضائل اور روحانی و جسمانی فوائد کی کوئی انتہا ہی نہیں۔ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اگر لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ رمضان کیا چیز ہے تو میری امت تھمت تھمت کرے کہ سارا سال ہی رمضان ہو جائے۔ فی الحقیقت رمضان المبارک کا سارا مہینہ حصولِ تکویٰ اور خیر و برکت کا مہینہ ہے۔ صوم رمضان کے دو خاص اجزاء سحری اور افطار ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو سحری کھانے اور بروقت افطار کرنے کی تاکید فرمائی ہے اور صوم وصال سے منع فرمایا ہے۔ صوم وصال سے مراد ہے بطریق افطار اور سحری کے مسلسل روزے رکھے جائیں چونکہ اس طرح کے روزے سخت مشقت اور سخت کا باعث ہوتے ہیں اور اس کا غدشہ ہوتا ہے کہ صوم وصال رکھنے والا کمزوری کے باعث دوسری ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے قابل نہیں

رہے گا اس لیے حضور ﷺ نے اسی طرح کے روزے رکھنے سے امت کو منع فرما دیا۔  
 جہاں تک کھڑے نہ نور ﷺ کی اپنی ذات گرامی کا تعلق ہے تو جس طرح  
 آپ نے نماز پنجگانہ اپنے اوپر فرض کر لی تھی اسی طرح آپ مسلسل روزے بھی رکھ لیا  
 کرتے تھے کیونکہ آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک قسم کی غیر مادی اور  
 روحانی قوت ملتی رہتی تھی جس سے عین میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت  
 کے مطابق آپ نے ترخم اور شفقت کی بنا پر امت کو صوم وصال سے منع فرمایا اس کے  
 برعکس آپ ﷺ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ سحری کھایا کریں کیونکہ اس میں برکت  
 ہے۔ مسند احمد میں حضرت ابوسعید خدریؓ سے رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد مروی ہے  
 کہ سحری میں برکت ہے اسے ہرگز نہ چھوڑو اگر کچھ نہیں تو اس وقت پانی کا ایک گھونٹ  
 ہی پی لیا جائے کیونکہ غز میں کھانے پینے والوں پر اللہ تعالیٰ رحمت فرماتا ہے اور فرشتے  
 ان کے لئے دعائے خیر کرتے ہیں۔ ایک اور روایت میں حضور ﷺ کا یہ ارشاد نقل ہوا  
 ہے کہ ہمارے اور اہل کتاب کے درمیان فرق کرنے والی چیز سحری کھانا  
 ہے۔ رحمت عالم ﷺ نے جہاں سحری کھانے کو ایک بارکت عمل قرار دیا ہے وہاں  
 اس میں تاخیر کا حکم بھی دیا ہے۔ یعنی صحابہ سے بہت پہلے سحری نہ کھائی جائے بلکہ  
 صحابہ صلیح کے قریب کھانی کر روزہ رکھا جائے۔ اسی طرح آپ ﷺ نے افطار میں  
 تھیل کا حکم دیا ہے یعنی آفتاب کے غروب ہوتے ہی افطاری کر لی جائے۔ صحیح بخاری  
 اور صحیح مسلم میں حضرت سل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ  
 نے فرمایا کہ جب تک میری امت کے لوگ افطار میں جلدی کرتے رہیں گے وہ اچھے  
 حال میں رہیں گے۔

اسی طرح ”جامع ترمذی“ میں حضرت ابو ہریرہؓ نے آنحضور ﷺ کا یہ  
 ارشاد روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اپنے بندوں میں مجھے وہ بندہ زیادہ  
 محبوب ہے جو روزہ کے افطار میں جلدی کرے مختصر یہ کہ سحری کھانا اور افطاری  
 کرتا دونوں ہی عمل اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور برکت کا باعث ہیں۔ ایک حدیث میں

آیا ہے کہ جس نے رَمَضان میں کسی روزہ دار کو اخطار کر لیا تو یہ اس کے گناہوں کی بخشش کا ذریعہ ہوگا اور اس کو روزہ دار کے ثواب کے برابر ثواب ملے گا بغیر اس کے کہ روزہ دار کے اجر میں کوئی کمی ہو۔

سُحری اور افطاری کی روزانہ برکات کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے رَمَضان شریف کے تین عشروں کو بھی اپنی خاص رحمت اور مغفرت کا ذریعہ بنا دیا ہے۔ اس میں پہلی رات ہی سے اصحاب صلاح و تقویٰ یعنی گناہوں سے بچنے کا اہتمام کرنے والے لوگوں کے گھروں پر رحمتوں کی بارش ہونے لگتی ہے دوسرے عشرے میں اُن لوگوں کے لئے بھی مغفرت کا سامان مہیا ہو جاتا ہے جو ایسے متقی اور پرہیزگار تو نہیں ہیں لیکن پہلے عشرے میں روزوں دوسرے اعمال خیر اور توبہ استغفار کے ذریعے اپنے حال کو بہتر بنا لیتے ہیں چنانچہ اس عشرے میں اللہ جلّ جلالہٗ اہن کی مغفرت اور معافی کا فیصلہ صادر فرما دیتا ہے۔ تیسرے عشرے میں اللہ تعالیٰ کی رحمت کا دریا جوش میں آ جاتا ہے اور اُن لوگوں کو بھی دوزخ سے نجات اور رہائی مل جاتی ہے جو ناکارہ اور بے عمل تھے لیکن رَمَضان المبارک میں عام مسلمانوں کے ساتھ روزے رکھ کر اور توبہ استغفار کر کے اپنے نفس کو اللہ تعالیٰ کے رحم کا مستحق بنالیا۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کو رمضان المبارک کے فیوض و برکات سے بہرہ ور ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔

## لَيْلَةُ الْقَدْرِ کی فضیلت

قرآن حکیم اللہ تعالیٰ کا پاک کلام ہے اور اس کی عظمت و شان اور اس کے فضائل و برکات کی کوئی حد و نہایت نہیں۔ اس کا اندازہ اسی ایک بات سے کیا جاسکتا ہے کہ رمضان المبارک کو ہرگز اس لئے تمام مہینوں پر فضیلت حاصل ہے کہ اس میں قرآن پاک نازل ہوا جیسا کہ سورۃ بقرہ میں ارشاد ہوا ہے:

فَهَرُ ذَ مَضَانَ الَّذِي أُنزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ

”یعنی رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا“

اسی سب سے افضل اور مقدس مہینے میں لَيْلَةُ الْقَدْرِ یا شبِ تقدیر آتی ہے جو رمضان المبارک کی تمام راتوں میں اس لئے افضل ہے کہ اس شب میں قرآن پاک نازل ہوا جیسا کہ سورۃ بقرہ میں ارشاد ہوا ہے:

إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ

”یعنی ہم نے اس (قرآن) کو شبِ قدر میں نازل کیا ہے“

اسی طرح سورۃ دخان میں فرمایا گیا ہے:

إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ مُبَرَّجَةٍ

”یعنی ہم نے اسے ایک برکت والی رات میں نازل کیا ہے“

مفسرین نے اس رات میں قرآن نازل کئے جانے کے دو مطلب بیان کئے ہیں۔ پہلا یہ کہ اس رات پر قرآن وحی لے جانے پر مامور فرشتے کے سپرد کر دیا گیا اور پھر حالات اور واقعات کے مطابق ۲۳ سال کے دوران میں جبریل اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس کی آیات اور سورتیں رسول اللہ ﷺ پر نازل کرتے رہے دوسرا مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم کے کوا دل کی ابتدا اس رات سے ہوئی اور یہی رات تھی جس میں سورۃ قلن کی ابتدا کی پانچ آیتیں نازل کی گئیں۔

قدر کے معنی اکثر متفکرین نے عظمت و شرف یا تقدیر کے لیے ہیں عظمت، شرف اس اعتبار سے کہ اس میں قرآن نازل ہوا اور اللہ تعالیٰ نے اسے ہزار میٹروں سے زیادہ بہتر فرمایا۔ "خَيْرٌ بِسْنِ الْفِ شَفِيرٍ" ہزار میٹروں سے زیادہ بہتر کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ اس رات کا عمل خیر ہزار میٹروں کے عمل خیر سے بہتر ہے۔ صحیحین میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص لیلیۃ القدر میں ایمان کے ساتھ اور اللہ کے اجر کی خاطر عبادت کے لئے کھڑا رہا اس کے تمام پچھلے گناہ معاف ہو گئے۔ گویا لیلیۃ القدر میں عبادت کرنے والے غوثین کی اللہ تعالیٰ کے نزدیک غیر معمولی قدر و ندرت ہے۔ صرف اس ایک رات کی عبادت سے ان کی گزشتہ زندگی کے تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ اس رات کو فضلت میں گزیرہ دینے پر سخت عید آئی ہے۔ شیخ ابن ماجہ میں حضرت انسؓ سے مروی یہ حدیث بیان ہوئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ماہ رمضان المبارک میں فرمایا کہ یہ مہینہ جو تمہارے پاس آیا ہے اس میں ایک رات ہے جو ہزار میٹروں سے بہتر ہے۔ جو اس سے محروم رہا وہ ساری خیر سے محروم ہو گیا اور محروم کے سوا خیر سے کوئی محروم نہیں ہوتا۔ ہزار میٹروں سے زیادہ بہتر کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ ہزار میٹروں سے مراد گئے ہوئے ۸۳ سال چار مہینے نہیں بلکہ بے انتہا خیر ہے کیونکہ اہل عرب بڑی کثیر تعداد کا حصہ دلانے کے لیے ہزار کا لفظ بولا کرتے تھے۔ قدر کے معنی تقدیر اس لحاظ سے ہیں کہ اس شب میں اللہ تعالیٰ تقدیر کے فیصلے نافذ کرنے کے لیے فرشتوں کے سپرد کر دیتا ہے۔ اس کی تائید سورہ ذخان کی اس آیت سے ہوتی ہے:

بَيْنَمَا نَفْزِقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيمٌ

"یعنی اس رات میں ہر معاملے کا حکیمانہ فیصلہ صادر کر دیا جاتا ہے"

بعض متفکرین نے قدر کا مطلب "تھک" بھی لکھا ہے وہاں معنوں میں کہ اس شب میں آسمان سے فرشتے اس کثرت سے اترتے ہیں کہ زمین تھک ہو جاتی ہے۔ بخود قرآن اور ناولی روح و طاغیہ کے علاوہ لیلۃ القدر کی فضیلت میں اور بھی

بہت سی احادیث اور روایات ملتی ہیں جن میں سے کچھ یہ ہیں۔

- 1۔ اس رات کو ہر مؤمن کو ساکنہ سلام کرتے ہیں۔ 2۔ اس رات کو آسمانوں کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں۔ 3۔ اس رات توبہ قبول ہوتی ہے۔ 4۔ اس رات جبریل علیہ السلام اپنے پروردگار کے حکم سے ہر مسافر کو خبر لے کر اترتے ہیں۔ 5۔ اس شب میں جبریل علیہ السلام جس شخص کو قیام و قعود اور ذکرِ الہی میں مشغول پاتے ہیں اس کے لیے دعائے رحمت کرتے ہیں۔

لیلیۃ القدر کی یہ ساری فضیلتیں ساری رات کے لیے ہیں۔ شام سے صبح یا ظہر تا غروب جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے **هِيَ حَتَّىٰ مَطْلَعِ الْفَجْرِ**۔ یعنی پوری رات غیری خیر ہے ہر فرزند اور ہر حق سے پاک۔ یہ نہیں کہ شب کے کسی خاص حصے میں برکتوں اور رحمتوں کا فلول ہو اور دوسرے میں نہ ہو۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ ساری رات عبادت میں بسر کی جائے اور کوئی لمحہ ضائع نہ کیا جائے۔ علماء اہل سنت کی بڑی اکثریت کی رائے یہ ہے کہ لیلیۃ القدر، رمضان المبارک کی آخری دس راتوں میں سے کوئی ایک طاق رات ہے اور ان میں بھی بیشتر اصحاب کی رائے یہ ہے کہ وہ ستائیسویں رات ہے۔ اس سلسلے میں متعدد احادیث و کتب حدیث میں ملتی ہیں ان میں سے کچھ یہ ہیں:

صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ لیلیۃ القدر کو رمضان کی آخری دس راتوں میں تلاش کرو جب مہینہ ختم ہونے میں نو دن باقی ہوں یا سات دن باقی ہوں یا پانچ دن باقی ہوں۔

صحیحین، مسند احمد اور جامع ترمذی میں ائمہ ائمہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ لیلیۃ القدر کو رمضان کی آخری دس راتوں میں سے طاق راتوں میں تلاش کرو۔

مختلف ابن ابی شیبہ میں روایت ہے کہ حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے



نیلۃ القدر کے بارے میں دریافت کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ حضرت عمرؓ، حضرت خذیفہؓ اور اصحاب رسول اللہ ﷺ میں سے بہت سے صحابہ کو اس میں کوئی شک نہ تھا کہ وہ رمضان کی ستائیسویں رات ہے۔

مسند ابی داؤد، طیالسی اور مسند احمد میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نیلۃ القدر کے بارے میں فرمایا کہ وہ رمضان کی ستائیسویں، یا تیسویں یا آخری رات ہے۔

بعض اہل علم نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ کسی ایک رات کا تعین اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف سے اس لیے نہیں کیا گیا کہ نیلۃ القدر کی فضیلت سے فیض اٹھانے کے شوق میں لوگ زیادہ سے زیادہ راتیں عبادت میں گزاریں اور کسی ایک رات پر اکتفا نہ کریں۔ بعض لوگوں کو یہ کہتے سنا گیا ہے کہ وہ رمضان کے آخری عشرے کی تمام طاق راتوں میں رات رات بھر جاتے رہے ہیں لیکن انہوں نے کوئی خاص (غیر معمولی) چیز نہیں دیکھی۔ دراصل نیلۃ القدر کی بہت اللہ تعالیٰ کے عہدوں میں سے ایک عہد ہے وہ جس پر چاہے یہ عہد کھولا ہے ہمیں اس کی زیادہ گریہ نہیں کرنی چاہیے بلکہ اپنی تمام تر توجہ اپنے مراسم عبادت و اعمال میں اخلاص پیدا کرنے کی طرف کرنی چاہیے اخلاص عمل اور یقین محکم رضائے الہی کے حصول کا بہترین ذریعہ ہیں۔

# عید الفطر کی اہمیت اور اس کے دینی اور دنیوی فوائد

دنیا میں ہر قوم کے کچھ خاص تہوار اور جشن کے دن ہوتے ہیں جن میں اس قوم کے لوگ اپنے اپنے انداز میں خوشی مناتے ہیں۔ اسلام میں بھی خوشی کے دو دن رکھے گئے ہیں۔ ایک عید الفطر اور دوسرا عید الاضحیٰ، ان کا سلسلہ ہجرت نبوی کے بعد اس وقت شروع ہوا جب مسلمانوں نے مدینہ منورہ میں اجتماعی زندگی کا آغاز کیا۔

سُفَیْن ابْنِ دَاوُدَ میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لائے تو اہل مدینہ (جن کی کافی تعداد پہلے ہی اسلام قبول کر چکی تھی) دو تہوار منایا کرتے تھے اور ان میں کھیل تماشے کیا کرتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان سے پوچھا، اے اہل مکہ یہ دو دن جو تم مناتے ہو ان کی کیا حقیقت اور حیثیت ہے؟ انہوں نے عرض کیا کہ ہم زمانہ جاہلیت میں بھی یہ تہوار اسی طرح منایا کرتے تھے۔

رسول اللہؐ نے فرمایا، اللہ تعالیٰ نے تمہارے ان دو تہواروں کے بدلے میں ان سے بہتر دو دن تمہارے لیے مقرر کر دیے ہیں، یوم عید الاضحیٰ اور یوم عید الفطر۔

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے حقیقی، فنی تہوار یہی دو دن ہیں۔ عید الاضحیٰ تو اس متم باطنان و اتھکی یادگار ہے جس میں حضرت امیر الہدایہ علیہ السلام نے رضائے الہی کی خاطر اپنے کعبہ جگر حضرت اسماعیل علیہ السلام کی گردن پر بھری چلا دی تھی اور عید الفطر کی اہمیت یہ ہے کہ یہ سب سے مبارک مہینہ رمضان المبارک کا نہایت ہی مبارک لمحہ ہے۔ یہ پورا مہینہ خواہشات کی قربانی، مجاہدہ اور ہر طرح کی

عامت و عبادات کی کثرت کا مہینہ قرار دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس مہینے کے بغیر دینی خاصے پر جو دن آئے گا وہ ایمانی اور روحانی برکتوں کے لحاظ سے بجا طور پر جشن اور شہزاد کا دن ہوگا۔ چنانچہ کیم ٹوال کا دن ہر سال اہل ایمان کے لیے شہزاد، اہتمام اور فکرِ الہی کا پیغام لاتا ہے لیکن دوسری قوموں کے تمام جشن میں ہونے والے لہو و لعب کے برعکس عید الفطر مسلمانوں کے عواحدانہ عقائد اور پاکیزہ معاشرتی تصورات کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ یہ مسلمانوں کو ایک دوسرے کے قریب ہونے اور پاکیزہ بنیادوں پر میل جول بڑھانے کا موقع فراہم کرتی ہے اور ساتھ ہی غریبوں اور محتاجوں کی مدد کرنے کا جذبہ پیدا کرتی ہے یوں یہ مقدس دن مسلمانوں میں اجتماعیت کے فروغ کا باعث بنتا ہے۔ اس دن دنیا کے تمام مسلمان علی الصبح اپنے اپنے شہروں، قصبوں، دیہاتوں اور محلوں میں ایک جگہ جمع ہو کر دو رکعت نماز ادا کرتے ہیں۔ ایک دوسرے سے اپنی خطاؤں کی معافی مانگتے ہیں اور باہمی رہنمائی و رہنمائی دیتے ہیں۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ نماز عید ادا کریں، انہیں حکم دیا گیا ہے کہ ہر صاحبِ نصاب مسلمان اپنی طرف سے بھی اور اپنے تمام گھروالوں کی طرف سے بھی خیرات و مالِ باق ہوں یا مالِ باق، مقررہ مقدار میں صدقہ و فطر ادا کرے ورنہ اس کے روزے بارگاہِ خداوندی میں قبول نہ ہوں گے اور اس صدقہ کے مستحق کون لوگ ہیں؟ تمام غریب مسکین، معذور اور بالخصوص وہ سفید پوش مسلمان جو ہیں تو مسکین لیکن کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے میں شرم محسوس کرتے ہیں۔ گویا عید کی خوشیاں صرف وغنیاء ہی کے لیے مخصوص نہیں بلکہ ان کے لیے لازم قرار دیا گیا ہے کہ ان خوشیوں میں غریب و مساکین کو بھی شریک کریں۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے روزوں کو فضول و عینی اور فحش باتوں کے اثرات سے پاک صاف کرنے کے لیے اور نئی جوں، مسکینوں کے کھانے کے بندوبست کے لیے صدقہ و فطر واجب قرار دیا ہے۔ اس حدیث میں صدقہ و فطر کی دو محکمات اور فائدوں کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے۔

ایک یہ کہ مسلمانوں کے جشن و مسرت کے اس دن صدقہ و فطر کے ذریعے محتاجوں، مستکینوں کی شکم سیری اور آسودگی کا انتظام ہو جائے گا اور دوسرے یہ کہ زبان کی بے احتیاطیوں اور غلطیوں سے روزے پر جو بڑے اثرات پڑے ہوں گے یہ صدقہ و فطر ان کا بھی کفارہ اور فدیہ ہو جائے گا۔

حضرت بریدہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا معمول تھا کہ آپؐ عید الفطر کی نماز کے لیے کچھ کھا کر تشریف لے جاتے تھے۔ گویا عید کے دن روزہ رکھنا ممنوع ہے اور علی الصبح نماز سے پہلے کچھ کھانا اس لیے ہے کہ جس اللہ کے حکم سے رمضان کے پورے مہینے دن میں کھانا پینا بالکل بند رہا آج جب اس کی طرف سے دن میں کھانے پینے کا اذن ملا اور اسی میں اس کی رضا اور خوشنودی معلوم ہوئی تو غالب محتاج کی طرح سویرے سویرے ہی اس کی ان نعمتوں سے لذت اندوز ہونے لگے۔ بندگی کا مقام یہی ہے۔

گر طمع خواہد ز من سلطان دیں

خاک بر فرق قناعت بعد ازیں

مختصر یہ کہ عید الفطر کی حقیقی روح یہ ہے کہ اس روز مسلمان اللہ کا شکر ادا کریں، اپنے سے کم حیثیت والوں کی مدد کریں، امیر غریب سب اجتماعی طور پر خوشی منائیں اور اپنے امدد محبت، اخوت اور اتحاد و اتفاق کا جذبہ پیدا کریں۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کو احکام خداوندی اور ارشادات نبویؐ کے مطابق خوشی کے اس موقع سے لطف اندوز ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔

آمین ثم آمین!

## منسرت اور شادمانی کا اسلامی تصور

اسلام دینِ فطرت ہونے کے اعتبار سے نوعِ انسانی کے لیے ایک مکمل ضابطہٴ حیات ہے اور انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے۔ وہ انسان کو دہم و خیال، متین و مست اور پورست کے دائرے میں بند کر کے غلوٰتِ نفسی کی تلقین نہیں کرتا بلکہ اس کو حقائق اور واقعات کی دنیا میں رہنا سکھاتا ہے۔ وہ انسان کی فطرت اور طبائع کا پورا پورا لحاظ کرتا ہے اور دکھ ہو یا سکھ، غم ہو یا خوشی ہر موقع پر اسلام اپنے ماننے والوں کے لیے ایک ایسی راہِ عمل پیش کرتا ہے جو ایک طرف تو ان کو ایک خاص حد کے اندر اپنے جذبات کے اعتبار کا خوش بحال بنیاتی ہے اور دوسری طرف ان کو رضائے الہی کے حصول کا موقع بھی پہنچاتی ہے مثلاً غم کے موقع پر آنسو بہانے اور دہی آواز سے کسی قدر رونے کی بھی اجازت ہے مگر نہیں کرنے یا دوا کر کے کی سخت ممانعت ہے کیونکہ نعر کا دامن ہاتھ سے چھوڑنا اللہ کی ناراضی کا باعث ہے اور شیوہٴ تسلیم و رضا یا سحرِ اختیار کرنا اس کی خوشنودی کا باعث۔ اسی طرح منسرت کو اسلام نے شکرِ خداوندی، عبادت اور حسنِ معاشرت کا نہایت حسین امتزاج بنا دیا ہے۔ غیر مسلم اقوام کے جشن ہائے منسرت بالعموم بے قابو اور بے لگام ہوتے ہیں۔ ان کی حیثیت سیلوں فیملوں جیسی ہوتی ہے اور ان میں ہر قسم کی خرمستیاں اور لٹچریات روا رکھی جاتی ہیں لیکن دینِ خلیف منسرت اور شادمانی کے موقعوں پر یہ واجب اور عادات میں وقت اور دولت کے ضیاع کی اجازت نہیں دیتا بلکہ وہ حقیقی منسرت اس بات کو قرار دیتا ہے کہ ہر گاہ خداوندی سے منسرت اور شادمانی کی صورت میں عطائے نعمت کا صدقِ دل سے شکر ادا کیا جائے۔ یہ نقلی عبادت کی صورت میں بھی ادا کیا جاسکتا ہے اور اپنے اقرباء، ہمسایوں، دوستوں اور دوسرے حاجت مندوں کی مالی مدد کے

یا ان کو دعوت طعام وغیرہ میں شریک کر کے بھی کیا جاسکتا ہے۔ یہ ایک قسم کی عبادت ہی مختصراً رہو گی گویا اسلام نے اظہارِ مسرت کو عبادت کے تابع کر دیا ہے اور ایسے موقعوں پر ایثار و سخاوت، خدمتِ خلق، انکسرت اور باہمی خلوص و تہمت کا دُور دیا ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اسلام انسانی فطرت کے تقاضے پورے نہیں کرتا اور معاشرے میں شُک و اور افسردگی کا ماحول پیدا کرتا ہے، نہ وہ لوگوں کو تفریح کی اجازت دیتا ہے اور نہ اس میں جسم و ذوق کے لطیف و انبساط اور نشاط کے لیے کوئی مہیا کمال ہے۔ فی الحقیقت اسلام نے ایسے تمام تفریحی مشاغل جائز قرار دئے ہیں جن سے احکامِ الہی کی خلاف ورزی نہ ہوتی ہو اور جو معاشرے میں خرابی پھیلانے کا باعث نہ ہوں مثلاً ہر وہ کسرت یا کھیل جس سے جسمانی قوت حاصل ہو ان میں کشتی، کبڈی، ہاکی، فٹ بال، والی بال، ہارس کشی، کھو، دوڑ، پیراکی، دوڑ وغیرہ سبھی چیزیں شامل ہیں۔ ایسا گانا سننے اور سنانے کی بھی اجازت ہے جس میں فحاشی، عریانی، بدکلامی اور جذبات کو سراہیٹھ کرتے یا گناہ پر ابھارنے والی کوئی بات نہ ہو۔ مجلسِ آرائی، شعر و شاعری، لطیفہ گوئی اور غمی مذاق کی بھی اجازت ہے لیکن ان سب چیزوں کا دائرہ تہذیب کے اندر ہونا ضروری ہے۔ انفرادی یا علاقائی سطح پر تو مسرت اور شادمانی کا اظہار مختلف طریقوں سے کیا جاسکتا ہے مگر اسلام نے ملتِ اسلامیہ کو عید الفطر اور عید الاضحیٰ کی صورت میں عالمگیر سطح پر مسرت اور شادمانی کا جو اجتماعی تقوہ ردیا ہے وہ اپنی نوعیت اور مقاصد کے اعتبار سے منفرد اور بے مثل ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ مکہ سے ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف لائے تو دیکھا کہ وہاں کے لوگ سال میں دو مرتبہ اپنے قومی تہوار مناتے ہیں اور خوب ناچتے گاتے اور کھیل قماشے کرتے ہیں۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ وہ لوگ زمانے جاہلیہ ہی سے ایسا کرتے آئے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا یہ جہالت و ضلالت کا طریقہ ہے، اللہ تعالیٰ نے ہم مسلمانوں کے لیے دو تہواروں کو اعلیٰ ترین اور بابرکت دنوں میں مقرر فرمادیا ہے یہ ہیں عید الفطر اور عید الاضحیٰ۔ عید الفطر کی تقریب سعید پر مسلمانوں

کے لیے لازم ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حضور شکرانہ ادا کریں کہ اس نے ان کو رمضان المبارک کے روزے رکھنے کی توفیق عطا فرمائی۔ اس موقع پر فطرانہ ادا کرنا بھی لازم ہے تاکہ ہمارے غریب اور مسکین بھائی بہن بھی عید کی خوشیوں میں شریک ہو سکیں۔ اسی طرح عید الاضحیٰ کے موقع پر قربانی دے کر سنت ابراہیمی ادا کی جاتی ہے۔ قربانی کے گوشت میں خویش و اقرباء اور غریب و مساکین کا حصہ مقرر ہے ان دونوں عیدوں کا آغاز دو رکعت نماز سے ہوتا ہے اور ان کا مقصد خوشی منانے کے ساتھ ادائے شکر، ملت کی شیرازہ بندی، یکجہتی اور اخوت کا تسلی اعلاہ اور عز و بادر مساکین کی مدد بھی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایام عید میں آرائش و زیبائش کا اہتمام بے کمرے پہننا، خوشبو کا استعمال، جائز تفریحات سب چیزیں مباح ہیں لیکن ان میں گم ہو کر اگر معاشرے کو نظر انداز کر دیا جائے اور اس کے کمزور اور بے بہارا افراد کی طرف سے آنکھیں بند کر لی جائیں تو مسرت اور شادمانی کا اسلامی تھوڑا ختم ہو کر رہ جاتا ہے اور ان تقاریب سعید کی حیثیت بے روح زشم کی رہ جاتی ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی خوشیاں اُس طریقے سے منانے کی توفیق دے جو ان کے اسلامی تھوڑے ہم آہنگ ہو۔ آمین